برطانوی سامراج
نے
ہمیں کیسے لوٹا؟

مصنف
مولانا سید حسین احمد مدنی

مرتب
مولانا محمد عباس شاد

برطانوی سامراج
نے
ھمیں کیسے لُوٹا؟

مصنف

مولانا سید حسین احمد مدنیؒ

مرتب

مولانا محمد عباس شاد

©جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

برطانوی سامراج نے ہمیں کیسے لوٹا

مصنف

حضرت مولانا سیّد حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ

مرتب

مولانا محمد عباس شاد

باہتمام

(الحاج) محمد ناصر خاں

Bartanwi Samraj Ne Hamein Kaise Loota

Author:
Hazrat Maulana Sayyed Husain Ahmad Madani (R.A.)

Compiled by:
Maulana Muhammad Abbas Shad

Pages: **344**

Edition: **2014**

فہرست مضامین

نقشِ اوّل 7
عرضِ ناشر 8
حرفِ خیال 9
پہلا باب 15

انگریزوں کی آمد سے پہلے کا خوشحال ہندوستان

☐ ہندوستان کی خوشحالی کا پس منظر 17
☐ انگریزوں کی آمد سے پہلے ہندوستان کی مالی حالت 21
☐ انگریزوں کی آمد سے پہلے ہندوستان کی زرعی حالت 28
☐ انگریزوں کی آمد سے پہلے ہندوستان کی صنعتی وتجارتی حالت 34
☐ انگریزوں کی آمد سے پہلے ہندوستان کی اخلاقی حالت 44
☐ انگریزوں کی آمد سے پہلے ہندوستان کی تعلیمی حالت 46
☐ انگریزوں کی آمد سے پہلے ہندوستان میں مذہبی رواداری 48
☐ حوالہ جات (References) 56
دوسرا باب 59

انگریزوں کی آمد کے بعد کا تباہ حال ہندوستان

☐ ہندوستان میں انگریزوں کی آمد کا پس منظر 60

❑ انگریزوں کے ہاتھوں ہندوستان کی مالی بربادی 63
❑ انگریزوں کے ہاتھوں ہندوستان کی صنعتی وتجارتی بربادی 107
❑ انگریزوں کے ہاتھوں ہندوستان کی اخلاقی بربادی 145
❑ انگریزوں کے ہاتھوں ہندوستان کی تعلیمی بربادی 162
❑ انگریزوں کے ہاتھوں ہندوستان میں فرقہ واریت کا فروغ 169
❑ حوالہ جات (References) 185

تیسرا باب 193

ہندوستان میں انگریزوں کے ہاتھوں مسلمانوں کی بربادی

❑ ہندوستان میں انگریزوں کے ہاتھوں مسلمانوں کی بربادی 194
❑ مسلمانوں کو برباد کرنے کے طریقے 198
❑ مسلمان اور مسلمان بادشاہوں سے غداری 211
❑ مسلمانوں کا قانونی اداروں سے اخراج 214
❑ انگریزی اقتدار سے مسلمانوں کو شکایات 222
❑ حوالہ جات (References) 237

چوتھا باب 239

انگریزوں کی دھوکہ بازی، عہد شکنی اور غداری

☐ انگریزوں کی دھوکہ بازی، عہد شکنی اور غداری 240

☐ اپنے بنائے ہوئے قانون 1833ء کی خلاف ورزی 244

☐ اپنے اعلان وکٹوریہ 1858ء کی خلاف ورزی 248

☐ خود اختیاری دینے کے قانون کی خلاف ورزی 250

☐ توسیع مملکت کے متعلق شاہی اعلان کی خلاف ورزی 253

☐ خاندانی جائیدادوں اور جاگیرداروں کے قانون کی خلاف ورزی 256

☐ دیوانی کے معاہدوں کی خلاف ورزی 266

☐ مقامات مقدسہ کے متعلق اعلانات اور غداری 277

☐ حوالہ جات (References) 280

پانچواں باب 283

سامراج کی توسیع پسندی اور سلطنت عثمانیہ کی بربادی

☐ سلطنت عثمانیہ کی بربادی اور کوئن وکٹوریہ کے اعلان 1858ء کی کھلی مخالفت 284

☐ انگریز کا انگلستان کے بحری راستہ کو اپنے لیے صاف کرنا 289

☐ ایشیائی و افریقی قوموں اور بادشاہوں کے خلاف سازشیں 294

☐ عہدنامہ پیرس کی خلاف ورزی 296

☐ مقدونیہ کی تقسیم و بدامنی اور مرزنگ پروگرام 318

☐ ترکوں کے انقلاب پر یوروپ کا چراغ پا ہونا 322

☐ انقلاب کے بعد یوروپ کا ترکوں پر پہلا وار 324

☐ عثمانی شکست کے اسباب 334

☐ حوالہ جات (References) 343

نقش اول

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کی شہرہ آفاق آپ بیتی "نقش حیات" تین حصوں پر مشتمل ہے۔ ایک حصے میں حضرت مدنیؒ کے خاندانی اور ذاتی حالات ہیں۔ دوسرے حصے میں ہندوستان میں برطانوی سامراج کی لوٹ کھسوٹ اور ان کے سیاسی جبر کی کارستانیاں ہیں۔ تیسرے حصے میں برصغیر پاک و ہند میں سامراج کے خلاف علماء حق کی جدوجہد آزادی کی تاریخ اور ان کے مجاہدانہ کردار کی تفصیلات ہیں۔

آپ کے پیش نظر حضرت مدنیؒ کے "نقش حیات" کا ایک حصہ ہے جس میں۔

برطانوی سامراج: نے ہمیں کیسے لوٹا؟ کے متعلق تفصیلات ہیں۔ اس کتاب کو مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کی آپ بیتی سے جدید سٹائل کے مطابق از سر نو مرتب کیا گیا ہے۔

نقش حیات کی اشاعت میں پبلشرز نے مصنف کی عبارات اور حوالہ کی عبارات کو خلط ملط کر دیا تھا جبکہ اس اشاعت میں پوری کوشش کی گئی ہے کہ مصنف کی عبارت اور حوالہ جات کو الگ الگ پیراگراف میں واضح کیا جائے۔ کتابوں کے حوالہ جات ہر باب کے آخر میں دے دیئے گئے ہیں۔ کتاب کو باقاعدہ ابواب میں تقسیم کر کے ہر باب عنوان سے متعلقہ مواد اس باب کے ذیل میں پیش کر دیا گیا ہے۔

مصنف کی اصل عبارت میں کوئی تغیر و تبدل نہیں کیا گیا البتہ ترتیب و تبویب مرتب کی جانب سے ہے۔ اور بعض جگہ قوسین میں کوئی وضاحتی معنی بھی ذکر کر دیئے گئے ہیں۔ کتاب کے بقیہ دو حصے مستقل الگ حیثیت میں جدید ترتیب و تبویب کے ساتھ ادارہ پیش کرے گا۔ انشاء اللہ

اس جدید ترتیب کی افادیت تو قارئین کی آراء کے بعد ہی سامنے آئے گی جس کے لیے ادارہ اور مرتب منتظر رہیں گے۔

محمد عباس شاد

یکم جون ۱۹۹۸ء لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ ناشر

کچھ سال قبل ''لیو ہوبرمین'' کی کتاب کا اُردو ترجمہ ''یوروپ کیسے امیر ہوا'' مولانا محمد عباس شاد صاحب کی نظر سے گزرا تو ان کو یہ خیال آیا کہ ایک کتاب ''ہندوستان کیسے غریب ہوا'' بھی ہونی چاہیے اور جب ایک صاحب کو اُنہوں نے سرگرداں پایا کہ وہ اسی موضوع پر کتاب کا مواد تلاش کر رہے ہیں تو مولانا نے اُنہیں مشورہ دیا کہ اس موضوع پر مولانا سید حسین احمد مدنی ؒ کی کتاب ''نقشِ حیات'' میں بہت زیادہ مواد موجود ہے۔ اُنہوں نے کتاب دیکھی تو اپنے کام سے دستبردار ہو گئے اور کہا کہ اس سے بہتر کام میرے بس میں نہیں۔ اس وقت مولانا کو خیال آیا کہ حضرت مدنی ؒ ہی کے کام کو اس انداز سے پیش کر دیا جائے کہ یہ کتاب اپنے نام سے ایک فرد کی آپ بیتی کے بجائے اس میں موجود تاریخی حقائق کی بنیاد پر پہچانی جائے۔ چنانچہ اُنہوں نے کتاب کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا اور جب ہندوستان کی غربت کے سربستہ راز سے مولانا حسین احمد مدنی ؒ نے ''برطانوی سامراج نے ہمیں کیسے لُوٹا؟'' کے عنوان سے پردہ اُٹھایا تو یہ کتاب قارئین میں بے حد مقبول ہوئی اور پاکستان میں چند ماہ کے اندر اس کا ایڈیشن ختم ہو گیا۔ تاریخ پر ایک پرانی کتاب کی یہ مقبولیت مولانا حسین احمد مدنی ؒ کے خلوص اور ان کے نظریہ کی صداقت کا واضح اظہار ہے۔ اب اس کتاب کا ہندوستانی ایڈیشن آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اُمید ہے اس سے عوام کے شعور کو جلا ملے گی اور سامراجی نظاموں کے خلاف جدوجہد میں تیزی آئے گی۔

ادارہ فرید بکڈپو مرتب موصوف اور پاکستان میں اس کے ناشر ''طیب پبلشرز'' کے شکریہ کے ساتھ اس کتاب کی اشاعت کر رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دُعاء ہے کہ مصنف، مرتب اور ناشر کو اس کا بہترین اجر عطا فرمائے۔

—— محمد ناصر خان

حرفِ خیال

پاکستان، ہندوستان، بنگلہ دیش پر مشتمل یہ عظیم خطہ جسے "برصغیر" کہا جاتا ہے، اپنی تاریخی روایات اور قومی تہذیب و تمدن کی بنیاد پر ایک منفرد حیثیت رکھتا ہے، اس خطہ میں اشوک اعظم کا مہذّب اور متمدن دور ہو، یا محمد بن قاسمؒ سے لیکر اورنگ زیب عالمگیرؒ تک کے قومی ادوار ہوں، تاریخی طور پر یہ بات مسلّم ہے کہ دنیا بھر کے خطوں میں ہندوستان اپنی قومی، سیاسی اور اقتصادی روایات میں بہت زیادہ منفرد حیثیت کا حامل رہا ہے۔

اس خطہ میں جتنی نسلیں، برادریاں، اور قبائل موجود ہیں اور جتنی متنوع زبانیں بولی جاتی ہیں اور تہذیب و ثقافت کے جتنے مختلف مظاہر نظر آتے ہیں، کسی اور خطہ میں یکجا طور ہمیں نظر نہیں آتے، ان سب اختلافات رنگ و نسل و مذہب و زبان کے باوجود ماضی کے تمام قومی ادوار میں فکری و نظریاتی طور پر اس خطے کے خمیر میں انسانیت نوازی کی قدر مشترک بڑی واضح رہی ہے۔ اس خطہ میں آنے والے تمام مذاہب اور تمام قومی تحریکات میں انسانیت دوستی کا جذبہ اساسی طور پر کارفرما رہا ہے۔ اس بنیادی فکر پر ہی تمام قومی ادوار میں سیاسی نظام تشکیل دیے گئے، ایسا سیاسی نظام جو اختلافات کے تنوع کے باوجود تمام انسانوں کو مکمل امن اور بھرپور تحفظ فراہم کرے اور بلاتفریق رنگ و نسل و مذہب ہر ایک گروہ کو پورا پورا تحفظ اور امن حاصل ہو۔

اسی طرح انسانیت نوازی کے اس بنیادی فکر و فلسفہ پر ہی یہاں کے تمام قومی ادوار میں اقتصادی اور معاشی نظام کی صورت گری کی گئی۔ دھرتی سے وابستہ یہاں کی آزاد زرعی معیشت ہو، یا تبادلہ اشیاء کا تجارتی ڈھانچہ ہو، یا ابتدائی دور کی ابھرتی ہوئی صنعت کا تانا بانا ہو، قومی سطح پر ہر ایک کے پس پردہ جو جذبہ کارفرما رہا ہے، وہ بنیادی طور پر انسانیت دوستی کا تھا۔ آج بھی آپ کسی قدیم دیہاتی زندگی میں چلے جائیے، انسانی ضروریات اور تقاضوں کو پورا کرنے

کے حوالے سے وہ محض منافع کمانے کی فکر میں نہیں ہوتے' بلکہ انسانی تقاضوں کو اہمیت دیتے ہیں۔

پھر اس خطہ میں اسلام کی آمد سے قبل اگرچہ یہ تمام صورتیں اپنے دور کے تقاضوں کے مطابق ابھی ابتدائی نوعیت لیے ہوئی تھیں۔ لیکن اسلام نے جو بین الاقوامی سیاسی اور معاشی فکر اور عالمی سطح کا عملی نظام متعارف کرایا' اس نے اس خطے میں آکر انسانیت دوستی کی اساس پر سیاسی اور معاشی ڈھانچوں کی ایسی تشکیل نو کی کہ عالمی تجارتی نظام کے فوائد سے ہندوستان پوری طرح مستفید ہوا۔ محمد بن قاسمؒ سے لیکر اورنگ زیب عالمگیرؒ تک تقریبا" ایک ہزار سالہ دور مسلمانوں کا کہلاتا ہے۔ اس پورے دور میں یہاں کے حکمرانوں نے پوری کوشش کی کہ یہاں بسنے والی اقوام' ملک کے سیاسی اور معاشی نظام سے کچھ اس طرح مستفید ہوں کہ تمام افراد' قبائل' نسلیں اور مذاہب کے لوگوں کے حقوق پورے ہوتے رہیں۔ اس طرح گویا اتنے بڑے وسیع و عریض ہندوستان میں مختلف اقوام' قبائل' مذاہب کے باہمی ملاپ سے علاقائی سطح کے ہر ایک نظام نے بڑی عمدہ صورت اختیار کی ہوئی تھی' گویا دنیا بھر کے عالمی نظام کی تشکیل نو کے لیے یہ ایک نمونہ تھا۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ اسی طریقہ کار کے مطابق آئندہ چل کر کل دنیا کا بین الاقوامی ڈھانچہ قائم کیا جا سکتا تھا۔ کہ دنیا بھر کے تمام ممالک اور اقوام اس نظیر کو سامنے رکھ کر اپنے مستقبل کے عالمی تقاضوں کو پورا کر سکتی تھی۔ ہندوستان کی اسی انسانیت نواز فکر' پُرامن سیاسی نظام اور معاشی خوشحالی پر مبنی اقتصادی نظام کی وجہ سے اس خطہ کو دنیا بھر میں سونے کی چڑیا کہا جاتا تھا۔

ہندوستان کی ہزاروں سالوں کی سیاسی' معاشی اور انسانیت دوستی پر مبنی قومی روایات اس وقت جبر و دہشت اور غنڈہ گردی کا شکار ہو گئیں۔ جب برطانوی سامراج نے اپنے خونی پنجے اس خطہ کے سرسبز و شاداب جسم پر گاڑ دیئے اور ایک ایسا ظالم' ایک ایسا عالمی دہشت گرد' ایک ایسا بدترین آمر' اور انسانیت دشمن نظام قائم کیا جسکی تاریخ انسانیت میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ اس نے

لامحدود منافع کی ہوس میں، وہ تمام ہتھکنڈے استعمال کئے، جو مہذب دنیا کے منہ پر ایک طمانچہ کی حیثیت رکھتے ہیں، مکر و فریب کی وہ کونسی سازش تھی، جو نہ اختیار کی گئی ہو، جبر و دہشت پھیلانے کا وہ کونسا حربہ تھا، جو روا نہ رکھا گیا ہو، ہندوستان کی دولت لوٹنے کے لیے وہ کونسا ظالمانہ قانون تھا، جو مسلط نہ کیا گیا ہو، اس ظالمانہ لوٹ کھسوٹ نے نہ صرف اس خطہ کا امن چھین لیا۔ تحفظ ختم کر دیا بلکہ معاشی خوشحالی کو بدحالی میں تبدیل کر کے بھوک، افلاس، خوف اور تباہی و بربادی پیدا کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی، نہ صرف یہ بلکہ آگے بڑھ کر اس خطہ کے اقوام و مذاہب میں نفرتوں اور عداوتوں کے بیج بو دیئے اور فرقہ پرستی کی ایسی آگ جلائی، جس کی بھڑکتی ہوئی لپٹیں آج اس خطہ کی انسانیت کو ایٹم بم کے جہنم کی طرف دھکیل رہی ہیں۔

برطانوی سامراج کی سب سے بڑی شیطنت یہ رہی ہے کہ اس نے اس خطہ میں انسانیت دشمنی کی سوچ کو پیدا کیا، نفرتوں کے افکار کو جنم دیا، فرقہ پرستی، تشدد پسندی، آمریت اور غنڈی گردی کو فروغ بخشا، اور سیاسی حوالے سے ان ظالمانہ رویوں کی اساس پر ایسا بدامنی اور عدم تحفظ کا نظام مسلط کیا، جس نے اس خطہ کی اقوام پر ہر وقت کا خوف اور بزدلی تاری کر دی اور یوں بدامنی اور عدم تحفظ کا احساس بڑھتا گیا۔ اسی طرح اس نے ایسے ظالمانہ معاشی نظام کا جال پورے خطہ میں پھیلا دیا کہ یہاں کی دولت سمٹ سمٹ کر ایک ایسے مرکز پر جمع ہو، جہاں سے سامراجی ممالک کے اسفنج اسے چوس لے جائیں، چنانچہ آج بھی ہمارے ملک میں بالخصوص ملک کی قومی دولت کا بہاؤ غیر ملکی سامراجی ممالک کی سرمایہ پرستانہ کمپنیوں اور اداروں کی طرف بڑی تیزی سے جاری ہے۔

الغرض کسی زندہ سماج کی تین بڑی بنیادوں یعنی انسانیت دوست فکر، پُرامن سیاسی نظام، خوشحال اقتصادی نظام کو برطانوی سامراج نے ہندوستان بھر میں مسمار کر کے رکھ دیا۔ جس سے اس معاشرہ کی ترقی رک گئی، بھوک و افلاس پیدا ہو گیا بدامنی پھیل گئی اور یوں ترقی یافتہ ہندوستان بتدریج تنزل کی طرف بڑھتا گیا۔

ایسے زوال پذیر حالات میں اس خطہ کی قومی بقا کے لیے یہ ناگزیر تقاضہ تھا

کہ ہندوستان کی سیاسی اور سماجی حیثیت کا صحیح تعین کیا جائے تاکہ اس خاکستر میں دبی ہوئی چنگاریوں کو قومی آزادی کی راہ پر گامزن کیا جائے۔ چنانچہ ہندوستان کے دل "دلی" کے مرکز سے آوازۂ حق بلند ہوتا ہے۔ خانوادہ ولی اللّٰہی کا عظیم سیاسی مدبر، سماجِ انسانی کا نبض شناس، ہندوستان کے حالات کا صحیح تجزیہ کر کے اس کی سیاسی حیثیت کو متعین کرتا ہے۔ یعنی حضرتؒ الامام شاہ عبدالعزیز دہلوی فرزند ارجمند حضرتؒ الامام شاہ ولی اللہ دہلوی قدس سرہ اس پوری صورتحال کے جملہ پہلوؤں کا تجزیہ کر کے ہندوستان کو "دارُالحرب" قرار دیتے ہیں۔ اس تجزیہ کا دو ٹوک خلاصہ یہ ہے کہ وہ ملک جس میں انسانیت دشمن فکر کا چلن ہو جائے اور اس کا سیاسی نظام بدامنی اور عدم تحفظ پیدا کر رہا ہو۔ اور معاشی نظام بھوک و افلاس مسلط کرنے کا باعث ہو، وہ انسانیت کے ساتھ جنگ کرنے پر تلا ہوا ہو۔ تو اس وقت انسانیت دوستی کا تقاضہ، قومی آزادی کے حصول کی جدوجہد کی صورت میں برآمد ہوتا ہے۔

اس فتویٰ دارُالحرب نے ہندوستان بھر کے تمام حریت پسند طبقوں، جماعتوں اور بہادر لوگوں میں آزادی کا ایسا شعور پیدا کیا، جس نے آگے چل کر قومی آزادی کی جدوجہد کو منظم کیا۔ اور انسانیت دوستی کا فکر از سرِ نَو زندہ کیا، جس سے سیاسی اور معاشی حوالے سے یہاں کے طبقوں میں شعور اُجاگر ہوا۔

پھر خاص طور پر خانوادۂ ولی اللّٰہی نے اسی اساس پر اپنی جان کی قربانیاں دے کر انسانیت دوست فکر و عمل اور جہد و کردار کو زندہ رکھا۔ چنانچہ 1831ء کا معرکہ بالاکوٹ ہو یا ٹیپو سلطان کی شہادت کا میدان، بنگال کی انقلابی جدوجہد ہو، یا 1857ء کی جنگ آزادی کی عظیم جدوجہد، تحریک ریشمی رومال ہو یا اس کے بعد کی قومی تحریکاتِ آزادی، اس خانوادہ ولی اللٰہی اور اس کے جانشین حضرات نے اپنی عظیم جدوجہد اور قربانیوں کے ذریعے ہندوستان بھر میں برطانوی سامراج بلکہ ہر غیر ملکی سامراج کے خلاف ایک واضح شعور و فکر دیا۔ اور آج بھی انسانیت کے ساتھ جنگ کرنے والے سامراجی سرمایہ پرست ممالک، اقوام اور طبقات کے خلاف بر سر پیکار ہیں۔

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمتہ اللہ علیہ اسی خانوادہ ولی

اللهی کے جانشین حضرات کی جماعت کے ایک فرد اور رکن رکین ہیں اور سلسلہ بہ سلسلہ اس جماعت کے قلوب و دماغ اور فکر و عمل میں انسانیت دوستی کا جو واضح تصور رہا ہے۔ اور اس کے سیاسی اور معاشی تقاضے رہے ہیں۔ ان پر حضرت اقدس مدنی رحمتہ اللہ علیہ کو بھی پورا عبور حاصل تھا۔ انہوں نے اپنے استاد محترم اور مربی مجاہد اعظم حضرت اقدس شیخ الہند رحمتہ اللہ علیہ کی صحبت تربیت اور راہنمائی میں رہ کر انسانی سماج کا جو بلند تر سیاسی اور قومی شعور حاصل کیا۔ وہ بلاشبہ انتہائی عظیم ہے۔ زیر نظر کتاب میں حضرت مدنی رحمتہ اللہ علیہ نے اسی پس منظر میں برطانوی سامراج کی لوٹ کھسوٹ سے پہلے کے ہندوستان اور بعد کے ہندوستان کا بڑا خوبصورت تجزیہ کیا ہے اور پھر یہ تفصیل بتائی ہے کہ انگریزوں کی اس لوٹ کھسوٹ نے ہندوستان کی تباہی و بربادی میں کتنا کردار ادا کیا ہے۔ جو کچھ آپ نے اس کتاب میں تحریر فرمایا وہ خالصتاً" معروضی انداز میں لکھا گیا ہے۔ یعنی ایسے زندہ حقائق جن کا بھرپور مشاہدہ یقیناً انہی نتائج کا حامل ہے جو کتاب میں بیان کئے گئے ہیں اور پھر اس کے لیے ثبوت کے طور پر وہ سارا مواد جمع کر دیا گیا ہے' جو خود انگریز حکمرانوں نے لکھا اور ان کے ذمہ داروں نے بیان کیا۔ حضرت مدنی نے برطانوی لوٹ کھسوٹ کے پورے عمل کو انہی کی تحریرات کے آئینہ میں مرتب کیا ہے۔ اپنی طرف سے آپ نے محض نتائج اور اعداد و شمار کو ایک واضح رخ دیا ہے۔ ورنہ اصولی طور پر انگریز حکمرانوں کے اعترافات کو گویا جمع کر دیا گیا ہے۔ بایں ہمہ سیاسی اور معاشی حوالے سے آپ کی نتائج اخذ کرنے کی صلاحیت کی وجہ سے اس کتاب کو ہندوستان کی سیاسی اور معاشی تاریخ میں ایک اہم مقام حاصل ہے۔

حضرت اقدس مدنی رحمتہ اللہ علیہ کی زیر نظر کتاب دراصل آپ کی خود نوشت سوانح "نقش حیات" ہے بظاہر یہ ایک فرد کی سوانح کے طور پر لکھی گئی' لیکن اس میں سوانحی حصہ بہت کم اور برطانوی لوٹ کھسوٹ کے سیاسی اور معاشی حقائق بہت زیادہ ہیں۔

مولانا محمد عباس شاد صاحب نے انتہائی عرق ریزی سے اس کتاب میں بیان کردہ برطانوی لوٹ کھسوٹ کے سیاسی اور معاشی حقائق کو یکجا جمع کر دیا ہے۔ کتاب

کے بنیادی مضامین اور عبارت میں کوئی تغیر و تبدل نہیں کیا گیا' بلکہ جس طریقہ کار پر مصنف نے اسے ترتیب دیا تھا۔ اس کے مطابق اسے مرتب کر دیا گیا ہے اور آپ کی سوانح کو الگ ایک کتاب کی صورت دے دی ہے۔

اس صورت میں بلاشبہ یہ کتاب برطانوی سامراج کی لوٹ کھسوٹ کو واضح کرنے میں بڑا بنیادی کردار ادا کرے گی' اس کتاب کے مطالعہ سے وہ سارا اجمالی نقشہ دماغ میں آ جائے گا کہ انگریز کی آمد سے پہلے کا ہندوستان کیا تھا اور انگریزوں کی لوٹ کھسوٹ نے اسے کس مقام تک پہنچا دیا۔ شاید اسی صورت میں ہماری نوجوان نسل میں اپنے قومی زیاں کا احساس پیدا ہو جائے اور ایسے حالات میں خواب غفلت سے بیدار ہو کر اپنے خطہ کے حوالے سے قومی سوچ' سیاسی و معاشی حوالے سے پختہ شعور حاصل کرنے کی جدوجہد کرے اور زندہ قوموں کے سے مزاج کو اپنا کر اپنی قومی آزادی کا تحفظ کر سکے۔ اور غیر ملکی سامراجی سازشوں اور ان کے نتائج پر غور کر کے فکر و عمل اور جہد و کردار کی ایک روشن راہ پر گامزن ہو' جو دنیا و آخرت دونوں جہاں میں کامیابی و کامرانی دینے والی ہو۔ اللہ تعالیٰ ہمیں قومی آزادی کے حقیقی رہنماؤں کے فکر و عمل کو صحیح تناظر میں سمجھنے کی توفیق نصیب فرمائے اور گمراہی و ضلالت کے راستہ سے ہٹا کر انعام یافتہ لوگوں کے سیدھے اور صاف راستہ پر چلائے۔

عبدالخالق آزاد

25 مئی 1998ء

لاہور

پہلا باب

انگریزوں کی آمد سے پہلے کا خوشحال ہندوستان

○ ہندوستان کی خوشحالی کا پس منظر
○ انگریزوں کی آمد سے پہلے ہندوستان کی مالی حالت
○ انگریزوں کی آمد سے پہلے ہندوستان کی زرعی حالت
○ انگریزوں کی آمد سے پہلے ہندوستان کی صنعتی و تجارتی حالت
○ انگریزوں کی آمد سے پہلے ہندوستان کی اخلاقی حالت
○ انگریزوں کی آمد سے پہلے ہندوستان کی تعلیمی حالت
○ انگریزوں کی آمد سے پہلے ہندوستان میں مذہبی رواداری
○ حوالہ جات

◆

پہلا باب

انگریزوں کی آمد سے پہلے کا خوشحال ہندوستان

ہندوستان کی خوشحالی کا پس منظر

ہندوستان کی آزادی اور عزت۔ اور شوکت تمام دنیا میں مثل دیگر آزاد اقوام ہمیشہ سے تسلیم کی جاتی تھی۔ چونکہ یہاں کے علوم ہندسہ، حکمت و فلسفہ، حساب وغیرہ نے بے مثل ترقی کی تھی جس سے دوسرے ممالک ایشاء و افریقہ وغیرہ بھی فیضیاب ہوئے تھے اس لیے ———— کہ مسلمان بادشاہوں نے یہاں کی تجارت اور اخلاق و علوم میں چار چاند لگا دیئے تھے اور دور دور سے بڑے بڑے نامور اساتذہ کو بلا کر بھاری بھاری تنخواہیں دے کر ان کی (ہنر مندیاں) اور کمالات ملک میں پھیلا دیئے تھے اور اس لیے کہ دور دراز ملکوں میں ان کی تجارتیں اور آمدورفت جاری تھی۔ تمام اقوام اور ممالک میں نہایت عزت سے دیکھے جاتے تھے۔ حکومت اور سلطنت کے یہی مالک تھے اور باوجود اختلاف مذاہب تمام امور سلطنت انہیں کے ہاتھ میں تھے۔ فرقہ واریت کا نام نہ تھا تمام ہندوستانی دنیا میں ایک قوم شمار کیے جاتے تھے۔ اگرچہ مسلمانوں کے آنے کے بعد شہنشاہیت مسلمانوں کی قائم ہو گئی تھی مگر مسلمان بادشاہ یہاں ہی کے باشندے بن کر یہاں کی قومیت میں داخل ہو گئے تھے انہوں نے اپنے تعلقات اپنے اصلی وطنوں اور قوموں سے تقریباً منقطع کر لیے تھے اور ہندوستانی قومیت کے جزو لاینفک (علیحدہ نہ ہونے والا حصہ) بن گئے تھے۔ امور حکومت

میں یہاں کے اصلی باشندوں کو اس طرح شریک کر لیا تھا جس طرح ایک قوم اور ایک خاندان آپس میں شریک ہوتے ہیں۔ شخصی سلطنت کا دارومدار سراسر رعایا کی خوشنودی پر تھا اور پنچائتوں کے قیام کی وجہ سے عام طور پر عوام الناس کو حکومت خود اختیاری حاصل تھی اور ادنیٰ حکام سے لے کر بادشاہوں تک کے یہاں عام و خاص حاضر دربار ہوتے تھے جن میں ہر شخص کو اظہار رائے کا موقع ملتا تھا۔ اس بارہ میں سربارٹل فریر نے لکھا ہے۔

> "ایک دیسی شاہزادہ کا دربار بھی کونسل کے بالکل مشابہ ہوتا ہے۔ ایک اچھے حکمران کے زیر اثر اس دربار میں سب کی رسائی ہوتی ہے اور ہر ایک کو تقریر کرنے کی بڑی آزادی حاصل ہوتی ہے۔ اور یہی ذریعہ ہے جس سے وہ رعایا پر کسی قانون کے اثر کو محسوس کر سکتا ہے اور وہ اس طرح بے چینی کو پہلے ہی معلوم کرلیتا ہے۔" (1)

آپس میں رشتہ داریاں اور بیاہ شادی جاری کرلی تھی۔ ہر قسم کے عہدے وزارت عظمیٰ اور سپہ سالاری سے لے کر ادنیٰ انتظامی اور فوجی عہدوں تک بلا لحاظ نسل و رنگت اور مذہب ووطنیت حسب قابلیت مفتوح اقوام کو بھی دیتے رہتے تھے۔ انہوں نے ہندوں کو مہاراجہ، راجہ، تعلق دار بنایا۔ بڑی بڑی ریاستیں دیں، ہفت ہزاری، شش ہزاری، پنج ہزاری اور نیچے کے تمام منصب عطا کیے۔

سرپی سی رائے (مشہور بنگالی لیڈر) کہتا ہے

> "اورنگ زیب کے عہد میں بنگال کے ہندوؤں کو منصبداری اور بڑی بڑی جاگیریں عطا کی گئیں اور بڑے بڑے زمیندار بنا دیئے گئے اورنگزیب نے ہندوؤں کو گورنر بنایا، وائسرائے بنایا۔ یہاں تک کہ اس نے خالص مسلم صوبہ افغانستان پر بھی جو نائب السلطنت مقرر کیا تھا وہ ہندو راجپوت تھا۔(2)"

شہنشاہی درباروں سے لے کر عام سوسائیٹیوں تک میں سب مخلوط تھے اس لیے تمام ہندوستانی دنیا کی نظروں میں بھی اور آپس میں بھی عزت و شوکت اعلےٰ پیمانہ پر رکھتے تھے، یہی نہیں بلکہ اپنی بے مثل ثروت، بے مثل تجارت، بے مثل دستکاری، بے مثل تمدن، اور بے مثل طاقت کی بنا پر اقوام عالم میں برتری اور سب سے فوقیت کا درجہ رکھتے تھے۔ کوئی ہندوستانی خواہ کسی مذہب سے تعلق رکھنے والا ہو غیر ممالک میں حقارت کی نظر سے

نہیں دیکھا جاتا تھا اور نہ ہندوستان میں کوئی غیر قوم کا آدمی کسی ہندوستانی کو ذلیل دیکھ سکتا تھا۔

برنییر فرانسیسی کہتا ہے کہ

> ”رعایا کی حفاظت اس طرح کی جاتی ہے جس طرح بادشاہ اپنے خاندان کے افراد اور اہل و عیال کی کرتے ہیں۔ کسی طرح گوارہ نہیں کیا جاتا تھا کہ کوئی فوجی یا پولیس یا کوئی اجنبی کسی رعیت پر کسی قسم کی دست درازی کرے۔“

حرفتی کمیشن جس کے تمام ممبر انگریز تھے اپنی رپورٹ میں لکھتا ہے۔

> ”ایسے زمانہ میں جبکہ مغربی یورپ میں جو کہ موجودہ طریق حرفت کا وطن ہے غیر مہذب قبائل آباد تھے۔ ہندوستان اپنے حکمرانوں کی دولت اور کاریگروں کی اعلیٰ صنعت کے لیے مشہور تھا اور بہت بعد کے وقت میں جبکہ مغرب کے حوصلہ مند تاجر پہلے پہل ہندوستان میں نمودار ہونے لگے۔ یہ ملک زیادہ ترقی یافتہ یورپین اقوام سے کسی طرح کم نہیں تھا۔“ (3)

سر تھامس منرو (برطانوی قبضہ سے پہلے ہندوستان کی حالت کا نقشہ کھینچتے ہوئے) کہتا ہے

> ”ہندوستانیوں کا طریقہ کاشتکاری، بے مثل صنعت و حرفت ان کی صنعت و کاشتکاری کے معاملہ میں اعلیٰ استعداد، ہر قریہ میں ایسے مدارس کی موجودگی جس میں پڑھنے لکھنے اور حساب کی تعلیم ہوتی ہو، ہر شخص میں مہمان نوازی اور خیرات کرنے کا مبارک جذبہ موجود ہو اور سب سے زیادہ یہ کہ صنف نازک پر پورا اعتماد کیا جاتا ہو اس کی عزت، عصمت اور عفت کا پوری طرح لحاظ رکھا جاتا ہو۔ یہ ایسے اوصاف ہیں جن کے ہوتے ہوئے ہم اس قوم کو غیر مہذب اور غیر متمدن نہیں کہہ سکتے۔ ایسی صفات کی موجودگی میں ہندوستان کو یورپی اقوام سے کسی طرح کمتر قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اگر انگلستان و ہندوستان کے درمیان تہذیب و تمدن کی تجارت کی جائے تو مجھے یقین کامل ہے کہ ہندوستان سے تمدن کی جو کچھ درآمد انگلستان میں ہوگی اس سے انگریزوں کو بہت فائدہ پہنچے

گا۔"

لارڈ ولیم بنٹنک (مشہور وائسرائے ہند و گورنر مدراس) 1882ء میں کمیٹی کے سامنے بیان دیتے ہوئے کہتا ہے۔

> بہت سی باتوں میں اسلامی حکومتیں انگریزی راج سے کہیں بہتر تھیں۔
>
> مسلمان اس ملک میں آباد ہو گئے جسے انہوں نے فتح کیا تھا وہ ہندوستانی باشندوں میں گھل مل گئے۔ ان میں بیاہ شادی کرنے لگے۔ مسلمانوں نے ہندوستانی قوموں کو ہر قسم کے حقوق دیئے۔ فاتح اور مفتوح کے مذاق دلچسپی اور ہمدردی میں یکسانیت تھی۔ کوئی فرقہ نہ تھا۔ بخلاف انگریزی پالیسی کے وہ اس کے برعکس ہے۔ اب سرد مہری 'خود غرضی' بے پرواہی ہے جس میں ایک طرف حکومت کا آہنی پنجہ حکمران ہے اور دوسری طرف ہرچیز پر اپنا قبضہ ہے' اور ہندوستانیوں کو کوئی دخل نہیں ہے"(4)

پنڈت سندر لال اپنی کتاب "بھارت میں انگریزی راج" میں فرماتے ہیں۔ "

> اکبر' جہانگیر' شاہجہاں اور ان کے بعد اورنگ زیب کے تمام جانشینوں کے زمانہ میں ہندو اور مسلمان یکساں حیثیت رکھتے تھے۔ دونوں مذاہب کی مساویانہ توقیر کی جاتی تھی اور مذہب کی خاطر کسی کے ساتھ کسی قسم کی جانبداری نہ کی جاتی تھی۔ ہر بادشاہ کی طرف سے بیشمار ہندو مندروں کو جاگیر اور معافیاں دی گئی تھیں الخ"

انگریزوں کی آمد سے پہلے ہندوستان کی مالی حالت

انگریزی عروج سے پہلے ہندوستان نہایت زیادہ دولت مند اور سرمایہ دار ملک تھا جس کی مثال دنیا کے کسی ملک میں نہیں ملتی تھی۔ اور یہ دولت مندی اس ملک میں کئی زمانوں اور صدیوں سے چلی آتی تھی جس کی تمام عالم میں شہرت تھی اور جس کی وجہ سے دنیا کی قوموں کی لالچی نگاہیں ہمیشہ اس کی طرف اٹھتی رہتی تھیں۔ اور کیوں نہ اٹھتیں! قدرت کی فیاضیوں نے اس کی سرزمین میں ایسے اسباب اور سامان مہیا کر دیے تھے جن سے دولت مندی سرمایہ داری 'خوشحالی' فارغ البالی پھوٹ پھوٹ کر چاروں طرف پھیلتی تھی۔ یہاں کے راجاؤں اور بادشاہوں نے ہمیشہ ملک کی دولت اور ثروت میں اضافہ اور زیادتی کی پالیسی جاری رکھی۔ اگر کوئی راجہ یا بادشاہ ظالم بھی ہوتا تھا تو اس کا حاصل کیا ہوا مال گھوم پھر کر یہاں ہی رہتا تھا۔ اگر کسی بیرونی حملہ آور نے یہاں سے کچھ مال لوٹ کر کسی دوسرے ملک کو کبھی منتقل بھی کیا تھا تو یہاں کے تاجر اور دستکار بہت تھوڑے عرصہ میں اس کو ہندوستان کی مصنوعات کے بدلہ میں دوگنا واپس لے آتے تھے۔ ڈاکٹر ڈاکز کہتا ہے۔

> "ہندوستان کی دولت' تجارت اور خوشحالی نے سکندر اعظم کے دل پر گہرا اثر کیا اور جب وہ ایران سے ہندوستان کی طرف روانہ ہوا تو اس نے اپنی فوج کو کہا کہ اب تم اس سنہرے ہندوستان کی طرف کوچ کر رہے ہو جہاں نہ ختم ہونے والے خزانے ہیں۔ اور جو کچھ انہوں نے ایران میں دیکھا ہے اس کا ہندوستان کی دولت کے ساتھ کوئی مقابلہ ہی نہیں کر سکتا۔"(5)

پروفیسر ہیرین "ہسٹاریکل ریسرچ" صفحہ (268) میں کہتا ہے۔

"ہندوستان پرانے زمانہ میں دولت کے لیے مشہور تھا۔"(6)

چیمبرس انسائیکلوپیڈیا میں ہے۔

"صدیوں تک ہندوستان اپنی دولت مندی کے واسطے مشہور رہا۔"(7)

تھارن ٹن اپنے سفرنامہ میں لکھتا ہے۔

> "یورپ کو تہذیب سکھانے والے یونان اور اٹلی جب بالکل جنگلی حالت میں تھے ہندوستان اس زمانہ میں درجہ کمال کو پہنچا ہوا تھا اور دولت کا

> مرکز تھا۔ یہاں چاروں طرف بڑے بڑے صنعت و حرفت کے کاروبار جاری تھے۔ یہاں کے باشندے دن و رات اپنے اپنے کاروبار میں مشغول رہتے تھے۔ یہاں کی زمین نہایت زرخیز تھی۔ جس سے فصل خوب پیدا ہوتی تھی۔ یہاں بڑے بڑے لائق اور کاریگر صناع موجود تھے جو یہاں کی خام پیداوار سے اتنا نفیس اور عمدہ مال تیار کرتے تھے جس کی دنیا بھر میں مانگ ہوتی تھی۔ مغرب اور مشرق کے تمام ممالک ان اشیاء کو بڑے شوق سے خریدتے تھے۔ یہاں سوت اور کپڑے اس قدر عمدہ اور باریک و نفیس و خوبصورت بنتے تھے کہ دنیا میں کوئی ملک بھی ان کی برابری نہ کر سکتا تھا۔" (8)

فرانس کے مشہور سیاح برنیر نے اپنی چٹھی میں مسٹر کالبرٹ کو ہندوستان کی نسبت لکھا تھا کہ:

> "وہ ایسی نہایت گہری خلیج ہے جس میں دنیا بھر کے سونے اور چاندی کا بڑا حصہ ہر طرف سے آکر جمع ہو جاتا ہے اور بڑی مشکل سے ایک طرف باہر کو نکلتا ہے۔" (9)

"ہندوستان نے اپنی آزادی کے لیے کس طرح جدوجہد کی" مصنفہ (مسز انی بسنت) عبداللہ وصاف مورخ لکھتا ہے:

"حضرت آدم (علیہ السلام) کے زمانہ سے اس وقت تک مشرق سے لے کر مغرب تک اور جنوب سے لے کر شمال تک کوئی ملک ایسا نہیں ہے جس میں باہر کے ملکوں سے سونا اور چاندی اور قیمتی سامان اور جنس آتی ہو اور اس کے بدلے میں کانٹے، جڑی بوٹی، مٹی، سنگریزے اور مختلف قسم کی جڑیں باہر جاتی ہوں اور جہاں سے سامان کی خریداری کے لیے کسی ملک کو کبھی روپیہ نہ گیا ہو۔" (10)

لارڈ میکالے لکھتا ہے:

> "باوجود مسلمان ظالموں اور مرہٹہ لٹیروں کی موجودگی کے مشرقی ممالک میں صوبہ بنگال باغ بہشت سمجھا جاتا تھا اس کی آبادی بے انتہا بڑھتی تھی۔ غلہ کی افراط سے دور و دراز کے صوبہ جات پرورش پاتے تھے اور لندن اور پیرس کے اعلیٰ خاندانوں کی عورتیں یہاں کی کھڈیوں کے

نازک ترین کپڑے زیب تن کرتی تھیں۔" (11)

میجر باسو لکھتا ہے:

"رعایا کی خوشحالی اور سرمایہ داری کے اعتبار سے بھی مسلمانوں کا دور حکومت سونے کے حروف سے لکھے جانے کے قابل ہے۔ دولت مندی اور آرام و چین کا جو نقشہ شاہجہاں کے وقت میں دیکھنے میں آتا تھا بلاشبہ بے مثل 'بے نظیر تھا۔" (12)

"بنگال کے جگت سیٹھوں کا کاروبار بنک آف انگلینڈ کے برابر پھیلا ہوا تھا جو کہ انگلستان کا سب سے بڑا بنک ہے اور بقول کپتان الگزنڈر ہملٹن سورت کے ایک تاجر مسمی عبدالغفور کا سرمایہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے سرمایہ کے برابر تھا۔ انہیں وجوہ سے ہندوستان کی دولت کو لارڈ کلایو نے لازوال دولت کہا تھا۔ (13)

فاہین چینی اپنے سفرنامے میں لکھتا ہے:

"یہاں کی رعایا نہایت خوشحال اور فارغ البال ہے۔ کسی قسم کا مالیہ یا محصول ادا کرنا نہیں پڑتا اور یہ افسروں کی ڈالی ہوئی رکاوٹیں ہی ان لوگوں کے کاروبار میں حائل ہیں۔ جو سرکاری زمین جوتتے ہیں وہ پیداوار کا بہت تھوڑا حصہ بطور لگان ادا کرتے ہیں۔ راجہ کسی کو بدنی سزا نہیں دیتے۔" (14)

نکوموڈی کانتی (مشہور انگریز) اپنے سفرنامہ میں لکھتا ہے۔

گنگا کے کنارے بڑے بڑے اور نہایت خوبصورت شہر آباد ہیں جن کے ارد گرد دل خوش کرنے والے باغیچے لگے ہوئے ہیں شہروں کے باہر نہایت خوبصورت کھیت لہرا رہے ہیں۔ یہاں گویا سونے کے دریا بہہ رہے ہیں موتی اور جواہرات کی بھی کوئی انتہا نہیں۔" (15)

مسٹر وڈ 1871ء میں لکھتا ہے:

"سراج الدولہ کے انتقال کے بعد جن لوگوں نے بنگال میں ہو کر کوچ کیا ہے ان سے اس بات کی تصدیق کرانا چاہتے ہیں کہ اس وقت یہ سلطنت دنیا میں سب سے زیادہ دولتمند آباد اور کاشت کے لحاظ سے

بہترین تھی یہاں کے شرفاء اور تاجر دولت اور عیش میں لوٹ لگاتے تھے اور ادنیٰ درجہ کے کسانوں اور کاریگروں پر خوش حالی اور آسائش کی برکتیں نازل ہوتی تھیں۔" (16)

"1773ء میں تقریباً ایک ہزار قسم کے سکے کم وبیش تمام ملک میں جابجا رائج پائے گئے خاص کر (139) قسم کی طلائی مہریں (اشرفیاں) (61) قسم کے طلائی ہن جو پگوڈا بھی کہلاتے تھے۔ (556) قسم کے نقرئی روپئے اور (214) قسم کے دوسرے ممالک کے سکے۔ صرف احاطہ بمبئی کو لیجئے کہ عدالت ہائے دیوانی کی ہدایت کے واسطے جو مروجہ سکوں کی فہرست بنائی گئی تھی اس میں (38) طلائی سکوں اور (127) نقرئی سکوں کے نام درج ذیل ہیں تاکہ معلوم رہے اور انگریزی روپئے سے مبادلہ کرنے میں سہولت ہو گویا (165) قسم کے طلائی اور نقرئی سکے بخوبی رائج تھے اور تانبے کے الگ تھے۔" (17)

شہنشاہ اکبر کے زمانہ میں سونے کے سکے مندرجہ ذیل وزن کے تھے۔

مہر شاہی جس کی قیمت ایک ہزار روپیہ تھی۔ 102 تولہ سونا
دوسری اشرفی 90 تولہ سونا
تیسری اشرفی 50 تولہ سونا
چوتھی اشرفی 25 تولہ سونا
پانچویں اشرفی 20 تولہ سونا
چھٹی اشرفی 3 تولہ سونا
ساتویں اشرفی 2 تولہ سونا
آٹھویں اشرفی 1 تولہ سونا
نویں اشرفی 17 گرین یعنی 11 ماشہ (18)

شہنشاہ جہانگیر کے زمانہ میں حسب ذیل سکے تھے۔

مہر شاہی جس کا نام نور شاہی تھا۔ 100 تولہ سونا
دوسری اشرفی جس کا نام نور سلطانی تھا۔ 50 تولہ سونا
تیسری اشرفی جس کا نام نور دولت تھا۔ 20 تولہ سونا
چوتھی اشرفی نور کرم 10 تولہ سونا
پانچویں اشرفی 5 تولہ سونا

چھٹی اشرفی نور جہانی-1 تولہ سونا
ساتویں اشرفی نورانی - 6 ماشہ
آٹھویں اشرفی رواجی 3 ماشہ

مندرجہ بالا تفصیل سونے کے سکوں کی تھی چاندی کے سکے بھی جہانگیر کے زمانہ میں انہیں اوزان کے تھے جن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

کوکب سعد- 100 تولہ چاندی
کوکب اقبال- 50 تولہ چاندی
کوکب مراد- 20 تولہ چاندی
کوکب بخت- 10 تولہ چاندی
کوکب سعد- 5 تولہ چاندی
کوکب جہانگیری-1 تولہ چاندی
سلطانی - 6 ماشہ
نثاری - 3 ماشہ
خیر قبول- 1/10 تولہ (19)

صاحب علم المعیشت لکھتا ہے۔

"ایک زمانہ تھا جب ہندوستان کی دولت کے افسانے اقالیم دنیا میں مشہور تھے اور کہتے ہیں کہ یہی جنس تھی جس نے ایشیا اور یورپ کی جنگجو اور عالی ہمت اقوام کو اس سرزمین کی طرف کشاں کشاں کھینچا تھا۔ یونانی، عرب ترک، تاتار آئے اور بے شمار زرو جواہر او دیگر بیش بہا سامان لے گئے اکبر اعظم نے ہندوستان کو اپنا گھر قرار دیا اور پھر ہندوستان کی دولت ہندوستان ہی میں رہی۔ اورنگ زیب سریر آرائے سلطنت ہوا تو اس نے آگرہ اور دہلی کے خزانوں کی پڑتال کرنے کا حکم دیا۔ چنانچہ چھ ماہ تک کئی ہزار نفوس چاندی کے سکے تولنے میں مصروف رہے اور معلوم ہوا کہ خزانہ شاہی کا صرف ایک کونہ تولا جا سکا ہے۔ اشرفیوں اور جواہرات کی نوبت نہیں آئی اور اورنگ زیب فورا اس مہم کو بند کرا کے دکن کی مہم پر چلا گیا۔"(20)

مذکورہ بالاشہادتیں اور ان جیسی بہت سی شہادتیں تاریخ میں موجود ہیں جن سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان قدیم زمانہ سے بہت زیاد دولت مند اور سرمایہ دار ملک

تھا۔ روئے زمین پر اس جیسا دولت مند کوئی ملک نہ تھا۔ سونا اور چاندی اور جواہرات اور سچے موتی جس قدر اس ملک میں بکثرت لوگوں کے پاس پائے جاتے تھے۔ دوسرے ملک اس سے تقریباً خالی تھے۔ بعض تاریخیں بتلاتی ہیں کہ 1772ء میں صرافوں کی دوکانوں پر شہروں میں اشرفیوں اور روپیوں کے ڈھیر ایسے لگے ہوتے تھے جیسے منڈیوں میں اناج کے ڈھیر ہوتے ہیں اور یہی وجہ تھی کہ ہمیشہ دوسری قومیں ہندوستان کا قصد کرکے یہاں آتی رہیں۔ یورپین اقوام' پرتگیز' ڈچ' فرنچ' انگریز وغیرہ بھی اسی بناء پر سمندری راستوں سے یہاں بار بار آتے رہے اور سب ہی نے یہاں سے بہت زیادہ مال ومتاع حاصل کیا یہی وجہ تھی کہ پیٹر اعظم (پہلا زار روس) نے اپنی وصیتوں میں حکومت روس کو وصیت کی تھی کہ وہ ہندوستان کو اپنے قبضہ میں لاکر وہاں سے سونا اور چاندی حاصل کرے۔ اور پھر تمام دنیا پر اس کے سرمایہ کے ذریعہ سے حکومت کرے۔ یہاں کی بسنے والی رعایا نہایت خوشحال اور فارغ البال تھی۔ نہایت آرام اور چین سے زندگی بسر کرتی تھی۔ یہاں کا بادشاہ جشن کے دن سال بھر میں دو دفعہ سونے اور چاندی اور قیمتی فلزات میں تولا جاتا تھا اور جو کچھ وزن میں چڑھتا تھا غریب رعایا میں تقسیم کردیا جاتا تھا۔

جہانگیر اپنی کتاب (تزک جہانگیری) میں لکھتا ہے:

> "اول میں سونے سے تلا تین من دس سیر چڑھا ہندوستانی حساب سے پھر باقی فلزات اور اقسام خوشبویوں اور کیفات میں بارہ دفعہ تلا اور اسی طرح سال میں دوبار میں اپنا وزن کرتا ہوں کہ ہر بار سونا چاندی اور باقی فلزات (دھاتیں) اور ریشم اور عمدہ کپڑوں میں اور اقسام غلہ سے وزن کرتا ہوں۔ اول شروع سال شمسی میں۔ دوبارہ قمری میں اور نقد اور سامان اپنے تلنے کا الگ تحویلداروں کو دیتا ہوں کہ فقراء اور حاجت مندوں کو تقسیم کردیں۔" (21)

کتاب مذکور سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح شہنشاہ جہانگیر مرحوم سال میں دو مرتبہ ان اشیاء سے بارہ بارہ مرتبہ تلتا تھا اور جو کچھ وزن میں چڑھتا تھا فقراء اور محتاجوں میں تقسیم کرتا تھا اسی طرح اس کا باپ شہنشاہ اکبر بھی کرتا تھا اور جہانگیر کے بعد بھی شاہان مغلیہ اس پر عامل رہے۔

روزانہ شام کو جب بادشاہ کی سواری سیر کے لیے ہاتھی پر نکلتی تو دو توڑے ہزار ہزار روپے کے ہاتھی پر بادشاہ کے دائیں اور بائیں رکھے جاتے تھے اور وہ راستہ میں بادشاہ پر

نچھاور کیے جاتے تھے۔ ہر شب میں بادشاہ کے سرہانے ایک توڑا ہزار روپے کا رکھا جاتا تھا اور صبح کو رعایا میں تقسیم کر دیا جاتا تھا ظاہر ہے کہ اس قسم کی خیرات اور رعایا پروری بغیر بے شمار دولت کے نہیں ہو سکتی۔

مقریزی کتاب الخطط جلد ثانی صفحہ 174 پر لکھتا ہے:

> ”شہنشاہ محمد تغلق مرحوم سالانہ دو لاکھ جوڑے کپڑوں کے رعایا میں تقسیم کرتا تھا۔ دس ہزار گھوڑے علاوہ فوجیوں کے ہر سال رعایا میں تقسیم کرتا تھا۔ روزانہ دو وقتہ کھانا بڑے بڑے حکام میں سے بیس ہزار آدمی شاہی مہمان خانہ میں کھایا کرتے تھے۔ شاہی باورچی خانہ میں روزانہ ڈھائی ہزار گائیں اور دو ہزار بکریاں مہمانوں کے لیے ذبح ہوتی تھیں۔ دو سو علماء ہر روز بادشاہ کے ساتھ کھانا کھاتے تھے۔ شہر دہلی میں ستر شفا خانے عام رعایا کے واسطے جاری تھے دو ہزار مسافر خانے اور رباطین مسافروں اور غریب الوطنوں کے لیے بنے ہوئے تھے۔ ایک ہزار مدرسے تھے۔“

انکتیل ڈیومیران 1800ء میں لکھتا ہے:

> ”جب میں مرہٹوں کے ملک میں داخل ہوا تو میں نے خیال کیا کہ میں سادگی اور مسرت کے زمانہ میں ہوں جہاں فطرت اب تک غیر مبدل تھی اور جنگ اور مصیبت سے کوئی آشنا نہ تھا، باشندے خوش، قوی اور بہت زیادہ تندرست تھے مہمان نوازی کے جذبات عام تھے دوستوں ہمسایوں اور اجنبیوں کے استقبال کے لیے ہر چیز بطریق مساوات تیار تھی۔“ (22)

مذکورہ بالا جیسی تصریحات سے ہر صوبہ کے متعلق تاریخی کتابیں یورپین اور غیر یورپین مصنفوں کی بھری ہوئی ہیں (طوالت کے خوف سے ہم نقل نہیں کر سکتے) یہی وجہ تھی کہ ہندوستان کو پرانے زمانہ میں جنت نشان کے لقب سے ملقب کیا جاتا تھا۔ مگر خدا جانے اس بے شمار دولت اور بے نظیر سرمایہ کو زمین کھا گئی یا آسمان اچک لے گیا یا آندھی اڑا لے گئی۔ اب ماہرین اقتصادیات جو اعداد و شمار پیش کرتے ہیں ان سے ہندوستان دنیا کی ادنیٰ سلطنت سے گرا ہوا ہے مگر افسوس کہ ہندوستان اور ہندوستان کی بدنصیبی اور بدقسمتی نے وہ دن دکھایا کہ وہ جنت نشان ملک یورپین اقوام اور بالخصوص برطانوی قوم کے ہاتھوں جہنم نشان اور تمام دنیا سے زیادہ مفلوک فاقہ مست اور محتاج ہو کر رہ گیا۔

انگریزوں کی آمد سے پہلے ہندوستان کی زرعی حالت

ہندوستان زیادہ پیداوار والا اور سستا ملک تھا انگریزوں نے اس کو قحط اور کال کا مرکز اور نہایت گراں ملک بنا دیا۔ پیداوار بھی بہت کم کر دی جس کی وجہ سے بہت زیادہ آبادی مر گئی۔

ہندوستان کو قدرت نے نہایت زیادہ زرخیز ملک بنایا ہے۔ اس میں ہر قسم کے اناجوں کی کاشت اور پیداوار کے طرح طرح کے ذرائع مہیا کر دیئے ہیں جن کی وجہ سے زمانہ قدیم سے یہاں بافراط غلہ پیدا ہوتا رہتا تھا اور یہاں کے باشندے ہمیشہ خوشحال اور فارغ البال رہتے تھے قحط اور کال کا نام تک ملک کے عام باشندے تقریباً نہیں جانتے تھے۔ اس قدر پیداوار ہوتی تھی کہ اس زمانہ کی ارزانی سن کر نہ صرف تعجب ہوتا ہے بلکہ بسا اوقات گزشتہ تاریخی تصریحات کو اس زمانہ کے لوگ محال اور جھوٹ سمجھنے لگتے ہیں۔ ہم پہلے مسٹر تھارن ٹن کا قول نقل کر آئے ہیں وہ کہتا ہے کہ یہاں کی زمین نہایت زرخیز تھی جس سے فصل خوب پیدا ہوتی تھی۔ اسی طرح سر تھامس منرو کی ہندوستانیوں کے طریقہ کاشتکاری اور ان کی اعلیٰ استعداد کی پر زور تعریف اور ثناو صفت ذکر ہو چکی ہے ہم اس سے پہلے لارڈ میکالے کا بہ نسبت صوبہ بنگال یہ مقالہ بھی ہدیہ ناظرین کر چکے ہیں کہ۔

> "باوجود مسلمان ظالموں اور مرہٹہ لٹیروں کے مشرقی ممالک میں بنگال باغ جنت یا نہایت دولت مند ملک سمجھا جاتا تھا اس کی آبادی بے حد اور بہت زیادہ بڑھتی تھی۔ غلہ کی افراط سے دور دراز کے صوبہ جات پرورش پاتے تھے۔ اور لندن اور پیرس کے اعلیٰ خاندانوں کی بیبیاں یہاں کی کھڈیوں کے نازک کپڑوں میں ملبوس ہوتی تھیں۔"

بہرحال انگریزی اقتدار سے پہلے یہاں کی پیداوار غلہ جات کی بہت زیادہ تھی اور نہایت زیادہ ارزانی اور سستے بھاؤ سے تمام اناجوں کے اقسام اور ضروریات زندگی فروخت ہوتی تھیں۔ جس کی وجہ سے تمام باشندگان ہند نہایت خوشحال اور فارغ البال راحت اور آرام کی زندگی بسر کرتے تھے۔ عموماً ان کو اناج اور خوردونوش کی کمی ستاتی نہ تھی۔

(1) چنانچہ سر ایلیٹ ڈاؤسن تاریخ ہند جلد 3 میں شہنشاہ علاؤ الدین خلجی مرحوم کے زمانہ کا بھاؤ مندرجہ ذیل الفاظ میں لکھتا ہے۔

گندم	119 سیر یعنی دو من 39 سیر	بورا کھانڈ 15 سیر
چاول	179 سیر یعنی چار من 19 سیر	گھی 33 سیر
چنا	179 سیر یعنی چار من 19 سیر	لال کھانڈ 24 سیر
آڑو	179 سیر یعنی چار من 19 سیر	سرسوں کا تیل 27½ سیر
جو	224 سیر یعنی پانچ من 24 سیر	

(2) شہنشاہ محمد تغلق مرحوم کے زمانہ کا بھاؤ حسب ذیل تھا۔

گندم فی من پختہ	9 آنے
شالی دھان فی من پختہ	سوا چھ آنے
چاول فی من پختہ	9 آنے
چنا فی من پختہ	3 آنے
شکر سفید فی من پختہ	3 روپے
مصری فی من پختہ	3 روپے بارہ آنے
بیل فربہ فی راس	2 روپیہ
بکری فربہ فی راس	ایک روپیہ
بھینس فربہ فی راس	2 روپے
مرغ	آدھ آنہ
بکری کا گوشت	آدھ آنہ (41)

(نوٹ) اسی زمانہ میں ابن بطوطہ ہندوستان میں آیا ہوا تھا وہ اپنے سفرنامہ میں بنگال کی سیاحت کے متعلق لکھتا ہے کہ بنگال میں گرانی کے زمانہ میں ایک روپیہ کا تین من چاول فروخت ہوتا تھا۔ اور ارزانی کے زمانہ میں ایک روپیہ کا 16 من تک چاول فروخت ہوتا تھا۔ روئی کا کپڑا ایک روپیہ میں 30 گز تک تھا۔

(3) شہنشاہ فیروز تغلق کے زمانہ کا بھاؤ حسب ذیل تھا۔

گندم فی من پختہ	پونے پانچ آنے

جو فی من پختہ	تین آنے
گھی فی سیر پختہ	تین آنے
چنا فی من پختہ	ڈھائی پیسہ

(4) شہنشاہ ابراہیم لودھی مرحوم کا زمانہ

غلہ فی روپیہ	10 من
گھی فی روپیہ	5 سیر
کپڑا فی روپیہ	10 گز

ایک خاندان عزت کے ساتھ پانچ روپیہ ماہوار بسر کر سکتا تھا۔ ایک سوار معہ گھوڑا اور سائیس (گھوڑے کا نگہبان) اور سپاہیوں کے آگرہ سے دہلی تک ایک روپیہ میں سفر کر سکتا تھا۔

(5) شہنشاہ اکبر مرحوم کے زمانہ کا بھاؤ

گندم فی من	آٹھ آنہ
جو فی من	پانچ آنہ
شالی دھان فی من	سوا بارہ آنہ
چنا فی من	پانچ آنہ
مونگ فی من	گیارہ آنہ
ماش فی من	دس آنہ
موٹھ فی من	سوا چھ آنہ
شکر سفید فی من	تین روپے بارہ آنے
شکر سرخ فی من	ایک روپیہ چودہ آنے
گھی فی من	تین روپے
تیل فی من	دو روپے گیارہ آنے
نمک فی من	چھ آنے
بکری فربہ	ایک روپیہ آٹھ آنے

چاول خوشبودار فی من	دو روپے
جوائن فی من	چھ آنہ
باجرہ فی من	پانچ آنہ
دال فی من	چھ آنہ
میدہ فی من	تیرہ آنہ
دودھ فی من	پندرہ آنہ
گڑ فی من	ایک روپیہ سات آنے

اکبر کے دوسرے زمانہ کا بھاؤ

گندم فی روپیہ	4 من
مونگ فی روپیہ	پونے سات من
تیل فی روپیہ	ایک من 24 سیر
نمک فی روپیہ	20 من 30 سیر
کھانڈ فی روپیہ	18 سیر
باجرہ فی روپیہ	3 من
گھی فی روپیہ	15 سیر

(6) شہنشاہ جہانگیر کا زمانہ

ٹامس کو رائٹ جو کہ 1612ء میں آیا تھا کہتا ہے کہ ایک آنہ روز میں ایک آدمی نہایت آرام سے بسر کر سکتا تھا۔ (خلافت 2 نومبر 1923ء)

(7) شہنشاہ اورنگزیب عالمگیر مرحوم کے زمانہ کا بھاؤ۔

شہر ڈھاکہ میں چاول فی روپیہ (580) پونڈ بکتا تھا (23)

ڈھاکہ میں تمام ضروریات زندگی اس قدر ارزاں دستیاب ہوتی تھیں کہ یقین کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے ملک بے حد آباد تھا۔ کارمنڈل کے ساحل پر مچھلی 3 آنے کی 20 پونڈ آتی

تھی- کنک میں مکھن ایک آنے کا آدھ سیر آتا تھا اور 2 آنے میں ایک سو مچھلیاں اتنی بڑی بڑی فروخت ہوتی تھیں کہ ان میں سے صرف دو مچھلیاں ایک آدمی کا پیٹ بھرنے کو کافی ہوں- (24)

نمک ایک کراؤن یعنی دو روپے آٹھ آنے کو ایک ٹن یعنی 28 من آتا تھا
گائے کا گوشت تین فاردنگ (کچھ کوڑیوں) میں نصف سیر بکتا تھا

آئین اکبری میں جو قیمتوں کے متعلق اعداد و شمار درج ہیں ان سے واضح ہوتا ہے کہ سولہویں صدی کے آخر میں شمالی ہندوستان میں بالخصوص دارلسلطنت کے آس پاس سن 12 - 1910 کے نرخوں کے حساب سے سامان خورد و نوش کم از کم 8 - 7 گنا' روغنیات کم از کم 12 - 10 گنا اور کپڑا کم از کم 6 - 5 گنا ارزاں تھا- البتہ دھات کا سامان کچھ ایسا ارزاں نہ تھا- اور ولائتی چیزیں جن سے آج بازار پٹے پڑے ہیں مقابلتہ کہیں گراں تھیں عام قیمتوں کا لحاظ کرتے ہوئے اس میں کوئی شک نہیں کہ 1600ء کے روپے کی قدر و قیمت 1912ء کے روپے سے کم از کم 6 - 7 گنا زیادہ تھی اور سن 1920ء کے روپے سے کم از کم 10 - 12 گنا زیادہ گویا اکبر کے عہد میں صرف پانچ روپے ماہانہ آمدنی کا غریب خاندان اس خوش حالی سے بسر کرتا تھا کہ آج پچاس روپے والے کو وہ بات نصیب نہیں جو دس روپے کا ملازم تھا وہ آج کل سو روپے والے سے کم نہ تھا اور جس کو سو ملتے تھے وہ آج کل کے ہزار روپے والے سے زیادہ آرام اٹھاتا تھا حالانکہ روپے کی نوعیت میں شکل و صورت کے سوا فرق نہیں آیا- وہی چاندی روپیہ جو جب تھا سو اب ہے- لیکن قدر و قیمت میں زمین آسمان کا فرق ہو گیا اور یہ فرق بھی 1857ء کے بعد سے جبکہ سرکار انگریزی کا باقاعدہ دور دورہ شروع ہوا بہت زیادہ بڑھ گیا- اس سے قبل بھی فرق تھا مگر کم- قدر زر کی یہ تخفیف ملک کے حق میں بحیثیت مجموعی مضر ہے یا مفید یہ ایک جداگانہ بحث ہے جس کا بیان صرف دولت میں زیادہ برمحل ہو گا- یہاں صرف جتانا مقصود تھا کہ اگرچہ بظاہر روپیہ وہی کا وہی رہا لیکن گزشتہ تین صدی اور بالخصوص گزشتہ چھ سال میں یعنی جنگ کے زمانہ سے اس کی قدر و قیمت میں بہت کمی ہو گئی- اس تبدیلی کے اسباب اور ان کی تشریح و توجیہہ مسئلہ گرانی اور قدر زر سے متعلق ہے- یہاں تفصیل کی گنجائش نہیں- (25)

یہ مذکورہ بالا حساب صاحب معیشت الہند نے 1920ء کی قیمتوں سے کیا ہے جب کہ تمام سامان خورد و نوش وغیرہ بہ نسبت موجودہ زمانہ 1940ء سے لے کر 1947ء تک کے

چوگنا یا اس سے زائد ارزاں تھا- اگرچہ آج کے مقابلہ پر حساب کیا جائے تو یقیناً پانچ روپیہ ماہوار آمدنی والا اکبر کے زمانہ آجکل کے دو سو روپیہ پانے والے سے اور دس روپیہ ماہوار آمدنی والا اس زمانہ میں آج کل کے چار سو روپیہ حاصل کرنے والے سے اور سو روپیہ آمدنی والا آجکل کے چار ہزار کی آمدنی والے سے زیادہ آرام اٹھاتا تھا- سونے اور چاندی کا فرق بھی نہایت ممتاز نظر آتا ہے- اکبر کے زمانہ میں مہر شاہی جس کا وزن 102 تولہ ہوتا تھا ایک ہزار روپیہ کی ہوتی تھی یعنی سونا اس وقت میں دس روپیہ تولہ تھا مگر آج سو روپیہ تولہ سونا نہیں ملتا بہر حال ہندوستان انگریزی عروج اور اقتدار سے پہلے نہایت ارزاں اور سستائی والا ملک تھا اس میں اناج اور تمام ضروریات زندگی بالخصوص خوردو نوش کی اشیاء کی نہایت زیادہ کثرت اور ارزانی تھی یہاں کے باشندے نہایت چین اور آرام کی زندگی بسر کرتے تھے- مگر بقول شاعر-

چلی سمت غیب سے اک ہوا کہ چمن سرور کا جل گیا
مگر ایک شاخ نہاں غم جسے دل کہیں وہ ھری رہی

انگریزوں کی آمد سے پہلے ہندوستان کی صنعتی و تجارتی حالت

ہندوستان ذرائع دولت و معیشت میں صنعتی اور تجارتی حیثیت سے تمام دنیا سے فائق تر تھا انگریزوں نے اپنی خود غرضی سے اس کی صنعت اور تجارت دونوں کو تباہ و برباد کر دیا۔

ہندوستان زمانہائے قدیم سے صنعتی اور تجارتی ملک تھا۔ اس میں بکثرت ہر جگہ صنعتی کارخانے قائم تھے۔ ہر صنعت کے اعلیٰ درجہ کے ماہر دستکار پائے جاتے تھے۔ جو کہ یہاں کی خام پیداوار سے نہایت نفیس ایسی عمدہ اشیاء تیار کرتے تھے جن کی اطراف عالم میں نہایت زیادہ مانگ اور قبولیت ہوتی تھی۔ خشکی اور تری کے راستوں سے ان کی تجارت 'ایشیاء یورپ ' افریقہ اور مشرق بعید میں ہوتی تھی۔ اور ہر سال کروڑوں اشرفیاں ان کی قیمت میں ہندوستان میں آتی تھیں۔ جن کی وجہ سے کاروباری لوگ نہایت آرام اور چین کی زندگی بسر کرتے تھے۔ یہاں بے کاری کا نام ونشان تک نہ تھا۔ فاقہ مستی اور غربت و افلاس کا یہاں کے باشندہ پر سایہ بھی نہیں پڑتا تھا۔ ہر طرف آرام اور چین کا غلغلہ تھا۔ یہاں کے لوگ فارغ البالی اور خوشحالی میں کروٹیں لیتے تھے۔ چنانچہ ہم مسٹر تھارن ٹن کا قول مندرجہ ذیل اس کے سفرنامہ سے نقل کر چکے ہیں۔ وہ کہتا ہے۔"

> "یورپ کو تہذیب سکھانے والے یونان اور اٹلی جبکہ بالکل جنگلی حالت میں تھے ہندوستان اس زمانہ میں درجہ کمال کو پہنچا ہوا تھا اور دولت کا مرکز تھا یہاں چاروں طرف بڑے بڑے صنعت اور حرفت کے کاروبار جاری تھے یہاں کے باشندے دن رات اپنے کاروبار میں مشغول رہتے تھے یہاں کی زمین نہایت زرخیز تھی۔ جس سے فصل خوب پیدا ہوتی تھی۔ یہاں بڑے بڑے لائق اور کاریگر صناع موجود تھے جو یہاں کی خام پیداوار سے اتنا نفیس اور عمدہ مال تیار کرتے تھے کہ جس کی دنیا بھر میں مانگ ہوتی تھی۔ مغرب اور مشرق کے تمام ممالک ان اشیاء کو بڑے شوق سے خریدتے تھے یہاں سوت اور کپڑے اس قدر عمدہ اور باریک نفیس و خوبصورت بنتے تھے کہ دنیامیں کوئی ملک بھی ان کی برابری نہ کر سکتا تھا۔" (26)

نیز ہم پہلے کتاب علم المعیشت سے حرفتی کمیشن کی رپورٹ کا مندرجہ ذیل اقتباس نقل کر

چکے ہیں۔

> "ایسے زمانہ میں جبکہ مغربی یورپ میں جو کہ موجودہ طریق حرفت کا مولد و منتہا ہے غیر مہذب قبائل آباد تھے۔ ہندوستان اپنے حکمرانوں کی دولت اور اپنے کاریگروں کی اعلیٰ صنعت کے لیے مشہور تھا اور بہت بعد کے وقت میں جبکہ مغرب کے حوصلہ مند تاجر پہلے پہل ہندوستان میں نمودار ہونے لگے یہ ملک زیادہ ترقی یافتہ یورپین اقوام سے کسی طرح گھٹا ہوا نہیں تھا۔"

مسٹر مرڈ-تھ ٹاوشنڈ اپنی کتاب ایشیا اور یورپ میں لکھتا ہے:

> ہندوستان کے معمولی کاروباری لوگوں کے واسطے ہماری حکومت کسی طرح مبرا از خطاء نہیں ہو سکتی۔ اور ہماری حکومت سے یہ خرابی کبھی دور نہیں ہو سکتی۔ بڑی خرابی یہ ہے کہ ہماری حکومت نے ہندوستانیوں کی زندگی بالکل بے لطف بنا دی ہے۔ عام انگریزوں کو یہ سمجھانا مشکل ہے کہ ہماری حکومت سے پہلے ہندوستانی زندگی کیسی پر لطف تھی اور کاروباری اور باہمت لوگوں کے واسطے ہر ایک کاروبار میں کیسی آسانیاں میسر تھیں۔ مجھے پختہ یقین ہے کہ انگریزوں کے آنے سے پہلے کاروباری ہندوستانی نہایت آرام کی زندگی بسر کرتے تھے۔"(27)

انگریز مصنفین اپنی اغراض ملعونہ کے ماتحت ہمیشہ یہ پروپیگنڈہ کرتے رہے کہ زمانہ قدیم سے ہندوستان صرف زراعتی ملک رہا ہے مگر ڈاکٹر فرانسس بکانن فرانس بوچانن جن کو لارڈ ویلزلی نے 1800ء میں جنوبی ہند کی معاشیات کی تحقیقات کے لیے مقرر کیا تھا تمام ملک میں دورہ کر کے بچشم خود معائنہ کرتے ہیں اور تین ضخیم جلدوں میں رپورٹ مکمل کر کے لندن میں شائع کرتے ہیں جس پر عام طور پر انگریز مطلع ہو کر اس قدر پسند کرتے ہیں کہ کمپنی ان کو شمالی ہند کے دورہ کرنے اور وہاں کے حالات بچشم خود دیکھ کر قلمبند کرنے پر پھر مقرر کرتی ہے۔ چنانچہ اس کی تکمیل بھی تین ضخیم جلدوں میں ہو کر لندن میں شائع کی گئی۔ اس کتاب میں اٹھارویں صدی کے آخر اور انیسویں صدی کے ابتدائی زمانہ کا ہندوستان کا معاشی حال نہایت تفصیل سے مذکور ہے اس سے نتیجہ ذیل اخذ کر کے علم المعیشت ص 580 میں لکھتا ہے۔

”یہ خیال غلط ہے کہ سدا سے ہندوستان کا عام پیشہ زراعت ہے۔ یہ سچ ہے کہ ہندوستان کی زمین اور آب و ہوا کاشت کے واسطے بے حد موزوں ہے اور ہمیشہ سے ہندوستان میں کاشتکاروں کی ایک بڑی جماعت چلی آتی ہے لیکن جیسا کہ یقین دلایا جاتا ہے، یہ بیان خلاف واقعہ ہے کہ من حیث القوم ہندوستانیوں کا ذریعہ معاش زراعت ہی زراعت رہا ہے بلکہ جو جماعت طرح طرح کی صنعت و حرفت سے اپنی روزی کماتی تھی وہ اگر کاشتکاروں سے زیادہ نہ تھی تو بہت کم بھی نہ تھی۔ ڈاکٹر بوچانن کا قول ہے کہ جامہ بافی کی صنعت و حرفت کا ہندوستان میں اس قدر راج اور عروج تھا کہ زراعت کے مانند اس کو بھی عام ملکی پیشہ قرار دینا بیجانہ ہو گا۔ کروڑہا بندگان خدا اسی پیشہ پر بسر اوقات کرتے تھے۔ ادنیٰ سے لے کر اعلیٰ سے اعلیٰ قسم تک روئی اور ریشم کا کپڑا یہاں پر بکثرت تیار ہوتا اور مقامی صرف کے علاوہ دور دراز ممالک تک جاتا تھا۔ رو پہلی کلابتون بٹ کر صدہا قسم کے زربفت (سنہری کپڑا) تیار کرتے تھے جس سے بادشاہوں کے جسم و محلات کی زینت و آرائش ہوتی تھی۔ اون سے غریبوں کے واسطے کمبل اور امراء کے واسطے شال تیار ہوتے تھے جو اب تک عجائبات مصنوعات میں نمبر اول شمار ہوتے ہیں۔ ہندوستانی ململ۔ اطلس کمخواب۔ جامہ وار۔ چکن۔ چھینٹ نفاست و خوبی میں اب تک بطور ضرب المثل زبان زد ہیں۔ ان کی پائداری ہر کسی کو مسلم ہے۔ کپڑوں پر اس غضب کی سوزن کاری ہوتی تھی کہ پرانے کشیدے دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ فرش و فروش کا کل سامان چادریں، شطرنجیاں، دریاں، بکثرت تیار ہوتی تھیں۔ تانبے پیتل کے خوشنما ظروف۔ سونے چاندی کے نظر فریب زیورات۔ گوناگوں رنگ۔ اعلیٰ درجہ کے تیل و عطر ہر قسم کا چرمی سامان۔ طرح طرح کے ہتھیار۔ لکڑی پر نقاشی اور ہاتھی دانت کا عجیب و غریب کام۔ اور نہایت پائدار کاغذ۔ غرضیکہ ناگزیر ضروریات کی کل چیزیں اور اعلیٰ قسم کی بہت سی تعیشات ایک صدی کی بات ہے ہندوستان میں اس کثرت سے ہوتی تھیں کہ دیگر ممالک یہاں

> سے مال منگا منگا کر استعمال کرتے تھے۔
>
> صنعت و حرفت کا ہر طرف چرچا تھا۔ مصنوعات کی دور و پاس شہرت تھی باوجودیکہ کافی امن میسر نہ تھا۔ لوگوں کو کس قدر ذرائع معاش حاصل تھے اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ پیدائش کے دونوں اہم صیغے یعنی زراعت اور صنعت و حرفت اپنے ہی ہاتھ میں تھے۔ اور اگر حالات مساعدت کرتے اور مزاحمتیں سد راہ نہ ہوتیں تو جس قوم نے آج سے ایک صدی پہلے مصنوعات میں اس قدر ترقی کرلی تھی معاشی ترقیات میں آج اس کا کیا درجہ ہوتا۔ لیکن ہندوستان کچھ ایسے جال میں پھنسا کہ اس کی صنعت و حرفت تھوڑے ہی عرصہ میں دم توڑنے لگی۔ اور اب تک حالت نزع میں گرفتار ہے۔ 75 فیصد آبادی کی وجہ معاش کا بار زراعت پر آپڑا۔ باقی ماندہ لوگ ملازمت، معمولی صنعت و حرفت اور بے کاری میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ زراعت ہندوستان کے سر منڈھی گئی۔ اور اکثر صنعت و حرفت ممالک یورپ نے سنگوالی۔ اس تقسیم عمل سے ہندوستان کا جو نفع نقصان ہو رہا ہے اس سے قبل تجارت بین الاقوام میں واضح کیا جا چکا ہے۔(28)

مذکورہ بالا صنائع اور دستکاریوں کے علاوہ جہاز بنانے میں ہندوستانیوں کی مہارت نہایت بے نظیر اور کامل تھی اور اسی طرح جہاز رانی اور سمندروں کی واقفیت میں بھی وہ نہایت اعلیٰ پایہ رکھتے تھے۔

صاحب علم المعیشت لکھتا ہے۔

> "پارچہ بافی اور دیگر صنعتوں کی ترقی یافتہ حالت تو بخوبی مسلم ہے۔ لیکن یہ سن کر شاید تعجب ہو کہ اس زمانے کے لحاظ سے ہندوستان کے لوگ جہاز کے کام میں بھی خوب ہوشیار اور ماہر تھے یوں تو جہاز سازی اور جہاز رانی ہندوستان کی بہت قدیم صنعت اور بہت قدیم پیشہ ہے۔ لیکن یہ ایک وسیع تاریخی بحث ہے جس کے واسطے یہاں کوئی گنجائش نہیں تاہم اٹھارہویں صدی کے آخر تک بھی یہ حالت تھی کہ لارڈ ویلزلی گورنر جنرل اپنے ایک مراسلہ میں کمپنی کے ڈائریکٹروں کو حسب ذیل

تحریر فرماتے ہیں۔

کلکتہ کی بندرگاہ میں دس ہزار ٹن کے قریب جہاز موجود ہیں۔ جو ہندوستان ہی میں تیار ہوئے ہیں اور اس قسم کے ہیں کہ ان میں انگلستان کو مال جا سکتا ہے۔ خانگی جہازوں کی جو تعداد کلکتہ کے بندر گاہ میں موجود ہے۔ بنگال میں جہاز سازی کی صنعت نے جو کمال حاصل کر لیا ہے اور عمدہ چوبینہ (لکڑی) کی کثرت کی بدولت یہ صنعت جس سرعت سے ترقی کر سکتی ہے ان تمام باتوں کے مد نظر یہ امر یقینی ہے کہ بنگال کے انگریزی تاجر جس قدر مال انگلستان لے جانا چاہیں کلکتہ کے بندر گاہ میں لندن جانے کے واسطے کافی جہاز دستیاب ہو سکتے ہیں۔ لیکن مشہور مورخ ٹیلر صاحب کا بیان ہے کہ ہندوستان کا مال لے کر ہندوستانی جہاز جب لندن کے بندر گاہ میں پہنچے تو وہاں ان جہازوں کو دیکھ کر سنسنی پیدا ہو گئی۔ گویا کہ خدانخواستہ دریائے ٹیمس میں کسی غنیم کا جنگی بیڑہ گھس آیا۔

لندن کے جہاز سازوں نے شور برپا کر دیا کہ ان کا کاروبار تباہ ہوا چاہتا ہے اور انگلستان میں تمام جہازوں کے خاندان بھوکوں مر جائیں گے۔ کمپنی بھی اس مخالفت سے مرعوب ہو گئی اور بالآخر حکم دے دیا کہ ہندوستانی جہازوں سے کام نہ لیا جائے اور وہ لندن کے بندر گاہ میں نہ آئیں، بلکہ ہندوستان کے جہاز راں بھی ملازم نہ رکھے جائیں۔ کیونکہ جب وہ لندن پہنچ کر وہاں کے حالات دیکھتے ہیں تو ان کے دل میں ہماری وہ وقعت باقی نہیں رہتی جو بالعموم ہندوستان میں پیدا ہو گئی ہے۔ اور جو حکمرانی کے واسطے لازم ہے اور واپس جاکر وہ لوگ اپنے ملک میں ہمارے قصے سناتے ہیں۔ اس سے بڑی خرابی پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔

لہذا مادی، اخلاقی، کاروباری اور سیاسی ہر لحاظ سے ہندوستانی جہاز رانوں کا لندن آنا مناسب نہیں۔ اسی طرح انیسویں صدی کے شروع سے ہندوستان کی یہ صنعت بھی کس مپرسی کے ہاتھوں تباہ ہو گئی۔ ورنہ خدا جانے اب تک کس درجہ ترقی حاصل کر لیتی۔"(29)

مسٹر مکرجی اپنی کتاب تاریخ ہندوستان میں لکھتا ہے۔

”ایک انگریز مقیم بالاسور اپنے خط مورخہ 16 دسمبر 1670ء میں ڈائریکٹران کمپنی آف لندن کو لکھتا ہے۔

> ”بہت سے انگریز جہازران تاجروں کے جہاز و بادبان ہر سال یہاں تیار ہوتے ہیں۔ پرانے اور بہترین قسم کے ساگوان یہاں بکثرت موجود ہیں اور بہترین لوہا بھی بافراط دستیاب ہوتا ہے۔ اور ہر قسم کے کاریگری کے کام مثلاً بولٹو، میخ، کیل، لنگر وغیرہ یہاں کے لوہار نہایت ہوشیاری سے انجام دیتے ہیں مضبوط جہاز تیار کرتے ہیں اور صحت و درستگی کے ساتھ جہازوں کو پانی میں اتار دیتے ہیں یہاں کے کاریگر ہر ہوشیار کاریگر سے مقابلہ کر سکتے ہیں۔ (30)

نیز یہی مسٹر مکرجی اسی اپنی کتاب تاریخ ہندوستان ص 244 میں لکھتا ہے:

> 1802ء کے بعد کے زمانہ میں بھی ہندوستان سے جنگی اور تجارتی جہاز بن کر انگلستان جایا کرتے تھے۔“ (31)

نیز یہی مسٹر مکرجی اسی اپنی کتاب تاریخ ہندوستان ص 250 میں لکھتا ہے:

> ”انگلستان والے یہاں کے مشاق کاریگروں سے نقشہ بنوالیا کرتے تھے۔ (32)

سرولیم ڈگبی پراسپرس برٹش انڈیا ص 908 میں لکھتا ہے:

> 1800ء میں گورنر جنرل نے اپنے آقاؤں کو لندن لیڈن ہال میں رپورٹ کی کہ کلکتہ کی بندرگاہ میں دس ہزار نئے جہاز موجود ہیں جو اسی جگہ بنائے گئے ہیں اور ہندوستان سے انگلینڈ کو مال تجارت پہنچانے کے لیے کارآمد ہیں۔ کلکتہ کے بندرگاہ میں جس قدر جہاز موجود ہیں اور جس کمال کو جہاز بنانے کا کام بنگال میں پہنچ چکا ہے اور لکڑی کی بہتات کی وجہ سے اس میں بہت جلد ترقی ہونے کی امید ہے اس کے لحاظ سے یہ یقینی امر ہے کہ اس بندرگاہ میں اس قدر جہاز برابر تیار ہو سکیں گے جس قدر پرائیویٹ انگریز سوداگروں کو مال تجارت پہنچانے کے لیے درکار ہوں گے۔

نیز سرولیم ڈگبی اسی کتاب پر اسپرس برٹش انڈیا میں بمبئی کے متعلق ایک انگریز لفٹنٹ کرنل اے واگز کی رپورٹ 1881ء اور اس کا مشورہ نقل کرتا ہے جو درج ذیل ہے۔

> ”صرف بمبئی میں سوداگری کے دو جہاز یا ایک جہاز اور دو جنگی جہاز انگریزی بحری فوج کے لیے اٹھارہ مہینوں میں تیار ہو سکتے ہیں بمبئی کے ڈاک (جہاز بنانے کی جگہ) اس قابل ہیں کہ بڑی سے بڑی طاقت کا جہاز بھی ان میں تیار ہو سکتا ہے۔
>
> (اولاً) گجرات اور ملابار کے جنگلوں کے درمیان واقع ہونے کی وجہ سے لکڑی کا بکثرت پہنچنا۔
>
> (ثانیاً) اچھی قسم کی سن (ایک پودا جس کی چھال سے رسیاں بنتی ہیں) کا ہندوستان میں بکثرت پیدا ہونا۔
>
> (ثالثاً) انگریزی بحری فوج کا یورپ کا تیار شدہ جہاز ہر بارہ سال کے بعد از سرنو تیار کیا جاتا ہے۔
>
> (رابعاً) بمبئی کا ساگوان کا بنا ہوا جہاز پچاس سال سے بھی زیادہ چل سکتا ہے۔
>
> (خامساً) بمبئی کے بہت سے جہاز چودہ پندرہ سال کے بعد بحری فوج کے لیے خریدے گئے تو نہایت مضبوط پائے گئے۔ جہاز موسوم بہ ”سر ایڈورڈ ہیوز“ آٹھ سفر سوداگری کے کر چکا تھا کہ بحری فوج کے لیے خریدا گیا۔ حالانکہ یورپ کا کوئی جہاز بھی چھ سفر سلامتی کے ساتھ طے نہیں کر سکتا۔
>
> (سادساً) بمبئی میں جو جہاز بنتے ہیں ان پر انگلینڈ کی بہ نسبت پچیس فیصدی کم لاگت لگتی ہے۔“

مندرجہ بالا حساب سے سرولیم ڈگبی نے ایک بیڑہ بحری جہاز کی تیاری کا موازنہ باعتبار مدت اور باعتبار مصارف وغیرہ حسب ذیل درج کیا ہے۔

بمبئی میں جہاز

ڈیڑھ برس میں	تین برس میں	پندرہ برس میں
20 عدد فوجی بحری جہاز	4 عدد فوجی بحری جہاز	20 عدد فوجی بحری جہاز (یعنی ایک بیڑہ)
خرچہ تعمیر	خرچہ ترمیم و تجدید 50 سال	کل خرچہ پچاس سال میں
انگلینڈ کا جہاز		
100 پونڈ	300 پونڈ	400 پونڈ
بمبئی کا جہاز	×	
75 پونڈ		75 پونڈ

اس موازنہ سے اندازہ ہوا کہ بمبئی کے جہاز میں 325 پونڈ بچت ہوتی ہے

صاحب حکومت خود اختیاری صفحہ 66 میں لکھتا ہے۔

> "بعض اصحاب یہ کہتے ہیں کہ ہندوستان ہمیشہ سے محض ایک زرعی ملک رہا ہے۔ حالانکہ گزشتہ صفحات میں بکثرت انگریزوں کے اقتباسات دیئے گئے ہیں جن سے واضح ہے کہ ہندوستان کی صنعت کس درجہ پر رہی ہے اور کس طرح وہ توڑی گئی۔ تاہم ان تحریرات پر میں چند امور کا اضافہ کرنا چاہتا ہوں۔
>
> نواب مرزا یار جنگ صاحب چیف جسٹس حیدر آباد دکن نے کپتان الگزنڈر ہملٹن کے حوالہ سے تحریر فرمایا ہے کہ یہاں صرف ایک شہر کے مختلف کارخانوں میں پچاس ہزار پارچہ باف کام کرتے تھے اور جو سامان تیار ہوتا تھا اس کا جزو اعظم بیرونی ممالک کو بلکہ خاص کر یورپ کو جاتا تھا۔ برخلاف اس کے یورپ سے جو مال آتا تھا وہ نہایت کم تھا۔
>
> مثلاً 1794ء کی نسبت معلوم ہوا ہے کہ ہندوستان میں انگلستان سے صرف (156) پونڈ کپڑا آیا۔ پروفیسر ولسن نے لکھا ہے کہ "لوہا" ڈھالنے کی صنعت اس ملک (انگلستان) میں صرف چند سال سے ہے۔ ہندوستانی لوہا ڈھالنے اور اسپات فولاد بنانے کا کام نامعلوم زمانہ سے جانتے ہیں۔"

مسٹر راناڈے نے 1882ء میں لکھا تھا کہ دہلی کی مشہور لوہے کی لاٹھ جو پندرہ سو سال کی پرانی ہے اس سے لوہا ڈھالنے کی صنعت کا اندازہ ہوتا ہے۔"

مسٹر بال کو جو کہ ہندوستان کے محکمہ پیمائش کے افسر رہے ہیں انہیں تسلیم ہے کہ "چند سال پہلے تک دنیا کے سب سے بڑے کارخانوں میں اتنی بڑی لاٹھ کا ڈھالنا ناممکنات سے تھا اور اب بھی بہت کم کارخانے ایسے ہیں جو اتنی کثیر مقدار دھات کو ڈھال سکتے ہیں۔"

ایک اور مصنف کا بیان ہے کہ لندن میں فولاد ہندوستان کے نام سے فروخت کیا جاتا تھا۔ مسٹر ڈگبی نے لکھا ہے کہ ہندوستان میں جہاز سازی نہایت اعلیٰ درجہ کی حالت میں تھی مگر انگریز اسے گوارا نہ کر سکے۔ مسٹر ٹیلر نے لکھا ہے کہ لندن کی بندرگاہ میں جب ہندوستان کا مال ہندوستان کے بنے ہوئے جہازوں میں پہنچا تو اس سے وہاں کے بااختیار لوگوں میں اس قدر پریشانی پھیلی کہ دشمن کے بیڑے سے بھی نہ پھیلتی۔ لندن کے جہاز سازوں نے

اس شور و غوغا کرنے میں نمایاں حصہ لیا اور کہا کہ ہمارا کاروبار بربادی کے کنارے آلگا ہے اور ہمارے بال بچے یقیناً فاقہ کشی میں مبتلا ہو جائیں گے۔ (33)

اس چیخ وپکار سے ڈائرکٹران کمپنی پر اثر پڑا اور انہوں نے جہاز سازی کی صنعت ہندوستان کی بندر گاہوں سے توڑ کر انگلستان کی فاقہ کشی کے خطرہ کو ہندوستان کی طرف روانہ کر دیا۔"

خلاصہ کلام یہ ہے کہ ہندوستان قدیم زمانہ سے صنعتی اور تجارتی ملک تھا یہاں ہر قسم کے اعلےٰ اور ادنیٰ صنعتوں کے بے شمار کارخانے قائم تھے جن سے ملکی ضروریات اور ذرائع ترقیات پوری ہوتی تھیں اور تمام دنیا کے ممالک نفع حاصل کرتے تھے بیرونی ملکوں سے ہر سال کروڑوں اشرفیاں انہیں مصنوعات کی قیمت میں ہندوستانی تاجر حاصل کرتے تھے اور ہندوستانی باشندے کروڑوں آدمیوں کی تعداد میں یہاں کی صنائع (ہنر مندیوں) اور تجارتوں کے ذریعہ سے آرام اور عیش کی زندگی بسر کرتے تھے۔ مگر برطانیہ کو ہندوستانیوں کا عیش و آرام نہ بھایا اور ان کی آنکھوں میں کھٹکنے اور چبھنے والا کانٹا بن کر دن و رات بے چین کرنے لگا۔ مدبرین برطانیہ نے سوچنا شروع کیا کہ کس طرح ہندوستان کی صنعت اور تجارت پر چھاپہ مارا جائے اور اس کی تمام صنعتوں اور تجارتوں پر اپنا قبضہ جمایا جائے۔ تنہائیوں میں، مجمعوں میں، حکومت کے ایوانوں میں اس کے لیے تذکرے جاری ہوئے۔ اسکیمیں بنائی گئیں۔ رزولیوشنس پاس ہوئے اور نت نئے طریقے مظالم کے ایسے ایسے جاری کیئے گئے جن کی انسانی دنیا میں مثال نہیں ملتی۔ تہذیب کا دعوی کرنے والی قوم اور انسانیت کی خدمت کا ڈھونگ رچانے والی ملت نے وہ وہ انسانیت کش طریقے اپنائے اور ہندوستان میں جاری کئے جن کے سامنے قدیم زمانہ کے ظالم سے ظالم اور جابر سے جابر بادشاہوں اور قوموں کے وحشیانہ مظالم بھی ہیچ تھے اور جن کو فراعنہ مصر اور برابرہ افریقہ اور وحشی تاتاری بھی انتہائی نفرت کی نظر سے دیکھتے۔

انگریزوں کی آمد سے پہلے ہندوستان کی اخلاقی حالت

ہندوستان قدیم زمانہ سے روحانی پیشواؤں کا مرکز رہا ہے اور انہیں کا اثر تھا کہ انگریزی عروج تک یہاں کے عام باشندے اعلیٰ ترین کیرکٹر اور اخلاق کے عادی تھے۔ سر تھامس منرو جو کہ شہنشاہ جہانگیر کے زمانہ میں آیا تھا ہندوستانیوں کی تہذیب اور تمدن کو دیکھ کر دنگ ہو گیا۔ اسی بناء پر وہ اپنے مقالہ میں جس کو ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں ہندوستانیوں کے اوصاف ذکر کرنے کے بعد کہتا ہے۔

ہر شخص میں مہمان نوازی اور خیرات کرنے کا مبارک جذبہ موجود ہو اور سب سے زیادہ یہ کہ صنف نازک پر پورا اعتماد کیا جاتا ہو اس کی عزت، عصمت، عفت کا لحاظ رکھا جاتا ہو یہ ایسے اوصاف ہیں جنکے ہوتے ہوئے ہم اس قوم کو غیر مہذب اور غیر متمدن نہیں کہہ سکتے ایسی صفات کی موجودگی میں ہندوستان کو یورپی اقوام سے کسی طرح کمتر قرار نہیں دیا جا سکتا اگر انگلستان اور ہندوستان کے درمیان تہذیب و تمدن کی تجارت کی جائے تو مجھے کامل یقین ہے کہ ہندوستان سے تمدن کی جو کچھ درآمد انگلستان میں ہو گی اس سے انگریزوں کو بہت فائدہ پہنچے گا۔"

یہ الفاظ صاف طور سے بتلا رہے ہیں کہ ہندوستانیوں میں اس نے ایسے اخلاق جمیلہ اور اعمال حسنہ کا مشاہدہ کیا تھا کہ جن کے حاصل کرنے کی وہ اہل انگلستان کو ترغیب دیتا ہے اور ان کے حاصل ہونے سے انگریزوں کے لیے بہت فائدہ دیکھتا ہے۔ اس زمانہ میں عام طور سے ہندوستانیوں میں مہمان نوازی، انسانی ہمدردی، غرباء اور مصیبت زدوں پر شفقت اور رحم، عہد و پیمان کا تحفظ اور پابندی، خدا ترسی اور سچائی امانت داری اور سخاوت وفاداری اور صداقت، دیانت داری اور عدالت، بلند حوصلگی اور شرافت، بیدار مغزی جفاکشی، چستی اور بیداری، شجاعت اور مردانگی وغیرہ اوصاف جمیلہ بڑے پیمانہ پر پائے جاتے تھے۔ سچ بولنا تو اس قدر ضروری سمجھا جاتا تھا کہ جرائم پیشہ اشخاص بھی اس کے بہت زیادہ پابند ہوتے تھے۔ کرنل سلیمان (جس نے ٹھگوں کی سرکوبی میں کارہائے نمایاں انجام دیئے تھے) کہتا ہے۔

> "میرے تجربہ میں صدہا مثالیں ایسی آچکی ہیں کہ ایک آدمی کی دولت آزادی اور زندگی جھوٹ سے بچ سکتی تھی مگر وہ جھوٹ ہی نہ

بولا-" (34)

اور یہی وجہ تھی کہ تجارتی بہی کھاتے نہایت معتبر شمار کئے جاتے تھے اور ان کی شہادتیں فیصلوں میں نہایت زیادہ قابل اعتبار سمجھی جاتی تھیں- سرار سکن پیری (ایک سب کمیٹی کے سامنے بیان دیتے ہوئے) کہتا ہے-

> "تجارتی کھاتوں کی وہ حرمت تھی کہ کسی متنازعہ لین دین کے بارہ میں ان کا پیش ہو جانا عدالت کے نزدیک ناقابل تردید شہادت سمجھا جاتا تھا-" (35)

آج بھی ان مقاموں کے بسنے والے ہندوستانیوں میں جو موجودہ تمدن اور نظام سے بہت دور ہیں پرانے اخلاق جمیلہ کی تیز جھلک دکھائی دیتی ہے- مصنف حکومت خود اختیاری لکھتا ہے-

> "جو لوگ پہاڑوں پر جاتے ہیں وہ روزانہ دیکھتے ہیں کہ پہاڑیوں میں جھوٹ بولنے اور چوری کرنے کی قابلیت اب تک پیدا نہیں ہوئی جو مال ان کے سپرد کر دیا جاتا ہے اسے وہ راستہ میں ہاتھ نہیں لگا سکتے اور اگر صحیح مقام کا پتہ نہیں چلتا تو اسے پولیس کی سپردگی میں دے دیتے ہیں جن کی دیانت داری خود مشتبہ ہوتی ہے- یہ عادات ان کی اس وجہ سے قائم ہیں کہ ان کا اصلی وطن پہاڑوں میں موجودہ تمدن سے دور ہے-" (36)

انگریزوں کی آمد سے پہلے ہندوستان کی تعلیمی حالت

یہ کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ ہر حکومت کے اولین فرائض اور بنیادی اصولوں میں سے یہ امر ہے کہ وہ رعایا میں علم کی روشنی زیادہ سے زیادہ پھیلائے اور اس کے ذریعہ سے ان کے اخلاق انسانیہ اور اعمال معاشیہ میں ترقی دے ان کی جہالتوں اور بدکرداریوں کو دور کرے۔ ان کو مہذب اور شائستہ اور متمدن بنائے۔ رعایا کے ہر فرقہ اور ہر خاندان کے افراد کو یکساں طور پر مواقع اور سہولتیں تعلیم پانے کی پیدا کرے۔ چنانچہ زمانہ سابق میں ہندوستان میں ابتدائی تعلیم سے اعلیٰ تعلیم تک اس کا انتظام بغیر فیس اور معاوضہ کے کیا جاتا تھا۔ بادشاہوں، نوجوانوں، امراء اور اہل ثروت کی طرف سے جائدادیں تعلیمی مصارف کے لیے وقف کر دی گئیں تھیں۔ اس طرح صوبہ بنگال میں صوبہ کا چوتھائی حصہ اسی کے لیے وقف تھا۔ جیسا کہ مسٹر جیمس گرانٹ کے تخمینہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ سرکاری خزانوں سے ان کی امداد ہوتی تھی۔ صاحب روشن مستقبل لکھتا ہے۔

> "اس زمانہ میں کیفیت یہ تھی کہ والیان ملک اور امراء تعلیم کی پوری سرپرستی کرتے تھے اس کے لیے جاگیریں دیتے اور جائدادیں وقف کرتے تھے۔ دہلی کی مرکزی حکومت ٹوٹ جانے پر بھی صرف اضلاع روہیلکھنڈ میں جو دہلی سے قریب تر تھے پانچ ہزار علماء مختلف مدارس میں درس دیتے تھے اور حافظ رحمت خاں (مرحوم) کی ریاست سے تنخواہیں پاتے تھے۔"(37)

ہر ہر قریہ اور دیہات میں ایسے مدارس موجود تھے جن میں لکھنے پڑھنے، حساب وغیرہ کی تعلیم ہوتی تھی جیسا کہ سر تھامس منرو کا مقالہ ہم نقل کر چکے ہیں۔ کپتان الگزنڈر ہملٹن اپنے سفرنامہ میں شہنشاہ اورنگ زیب مرحوم کے زمانہ کی حالت بتلاتا ہوا لکھتا ہے۔

> کہ صرف ٹھٹھہ شہر میں مختلف علوم و فنون کے چار سو کالج تھے۔

وہ لفظ کالج لکھتا ہے اسکول، پرائمری اسکول' یا مکتب' نہیں لکھتا۔ جبکہ دارالسلطنت دہلی سے ایک ہزار میل سے زیادہ دوری پر بسنے والے شہر میں اس قدر کالج تھے تو پھر شہر دہلی، آگرہ اور دیگر شہر ہائے یوپی، بہار، بنگال، اڑیسہ، مدراس، بمبئی، سندھ، پنجاب وغیرہ کے بڑے شہروں کے متعلق قیاس کیا جا سکتا ہے کہ وہاں تعلیمی حالت کیا ہوگی۔ مقریزی کتاب الخطط

میں لکھتا ہے (بزمانہ محمد تغلق مرحوم) صرف شہر دہلی میں ایک ہزار مدرسے تھے۔ مسٹر کیر ہارڈی نے میکس مولر کے حوالہ سے لکھا ہے۔

> "انگریزی عملداری سے قبل بنگال میں اسی ہزار مدرسے تھے اس طرح چار سو آدمیوں کی آبادی کے لیے ایک مدرسہ کا اوسط ہوتا تھا۔ نیز لڈلو نے تاریخ ہند میں لکھا ہے کہ ہندوؤں کے ہر موضع میں جو اپنی قدیم حالت پر رہے بچے عموماً لکھ پڑھ سکتے ہیں مگر جس جگہ ہم نے مثل بنگال کے پرانا نظام توڑ دیا ہے وہاں سے گاؤں کا اسکول غائب ہو گیا ہے۔"(38)

اسی طرح انڈین ریفارم سوسائٹی نے جو کہ 1853ء میں انگلستان میں قائم تھی اپنے ایک رسالہ میں لکھا ہے۔

> "ہندوؤں کے زمانہ میں ہر موضع میں ایک مدرسہ ہوتا تھا۔ ہم نے چوں کہ دیہاتی کمیٹیوں یا میونسپلٹیوں کو توڑ دیا اس سے ان کے باشندے مدارس سے بھی محروم ہو گئے۔ اور ہم نے ان کی جگہ کوئی چیز قائم نہیں کی۔"(39)

الحاصل یہ امر مسلمات میں سے ہے کہ زمانہ سابق میں لکھے پڑھے لوگ زیادہ ہوتے تھے اس کی تصدیق امور مذکورہ بالا کے علاوہ مشہور ماہر تعلیم ڈاکٹر لیٹنر کے قول سے بھی ہوتی ہے۔ لالہ لاجپت رائے نے اپنی کتاب ان ہیپی انڈیا میں انگریزی سر رشتہ تعلیم کے افسروں کے حوالہ سے یہ ثابت کیا ہے کہ پہلے زمانہ میں ہندوستان میں تعلیم یافتہ لوگوں کی تعداد موجودہ زمانہ سے زیادہ تھی۔ (40)

انگریزوں کی آمد سے پہلے ہندوستان میں مذہبی رواداری

لارڈولیم بنٹنگ جوابتداء میں مدراس کے گورنر اور اس کے بعد ہندوستان کے مشہور وائسرائے رہے ہیں اور ظاہر ہے کہ اس سلسلہ میں ان کے بیان سے زیادہ کوئی سندیاوقعت اور وزنی نہیں ہوسکتی۔ آپ نے 1882ء میں کمپنی کے سامنے بیان دیتے ہوئے کہاتھا۔

> "بہت سی باتوں میں اسلامی حکومتیں انگریزی راج سے کہیں بہتر تھیں۔ مسلمان اس ملک میں آباد ہوگئے جسے انہوں نے فتح کیاتھاوہ ہندوستانی باشندوں سے گھل مل گئے۔ ان میں شادی بیاہ کرنے لگے۔ مسلمانوں نے ہندوستانی قوموں کو ہر قسم کے حقوق دیئے فاتح اور مفتوح کے مذاق دلچسپی اور ہمدردی میں یکسانیت تھی۔ کوئی فرق نہ تھا۔ برخلاف اس کے انگریزی پالیسی اس کے برعکس ہے۔ اب سرد مہری' خود غرضی' بے پروائی ہے۔ جس میں ایک طرف حکومت کا آہنی پنجہ حکمراں ہے اور دوسری طرف ہرچیز پر اپناقبضہ ہے اور ہندوستانیوں کا کوئی دخل نہیں ہے۔ (30)

سرپی سی رائے (بنگال کے مشہور عالم) 1938ء میں بنگال کی مسلم فیڈریشن کے جلسہ میں بحیثیت صدر جلسہ تقریر کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

> "اورنگ زیب کے عہد میں بنگالی ہندوؤں کو منصبداری اور بڑی بڑی جاگیریں عطاکی گئیں۔ اوربڑے بڑے زمیندار بنادیئے گئے اورنگ زیب نے ہندوؤں کو گورنر بنایاوائسرائے بنایایہاں تک کہ اس نے خالص مسلم صوبہ'افغانستان پر بھی جو نائب دارالسلطنت مقرر کیاتھاوہ ہندوراجپوت ہی تھا۔ (41)

پنڈت سندرلال صاحب الہ آبادی (بھارت میں انگریزی راج) میں فرماتے ہیں۔

> "اکبر جہانگیر شاہجہاں اور ان کے بعد اورنگ زیب کے تمام جانشینوں کے زمانہ میں ہندو اور مسلم یکساں حیثیت رکھتے تھے۔ دونوں مذاہب کی

مساویانہ توقیر کی جاتی تھی اور مذہب کے لئے کسی کے ساتھ کسی قسم کی جانب داری نہ کی جاتی تھی۔ ہر بادشاہ کی طرف سے بے شمار ہندو مندروں کو جاگیریں اور معافیاں دی گئیں تھیں۔ آج تک ہند میں متعدد ہندو مندروں کے پجاریوں کے پاس اورنگ زیب کے دستخطی فرمان موجود ہیں جن میں خیرات اور جاگیروں کے عطا کئے جانے کے تذکرے ہیں۔ اس قسم کے دو فرمان اب تک الہ آباد میں موجود ہیں جن میں سے ایک اریل میں سومیشور ناتھ کے مشہور مندر کے پجاریوں کے پاس ہے۔"

"اسی طرح شہنشاہ اورنگ زیب نے گروھر پسر جگ جیون ساکن موضع بسی ضلع بنارس اور جدو مصر ساکن میش پور پرگنہ حویلی کو اور پنڈت بلبدر مصر کو جاگیریں عطا کیں۔" (42)

شہنشاہ جہانگیر مرحوم لکھتا ہے

اور راجہ بکرماجیت کو کہ ہندوستان کے معتبر راجوں سے ہے اور رصد نجوم کی ہند میں اس نے بنائی ہے خطاب دے کر میر آتش اپنا بنایا یعنی افسری توپ خانہ کی عنایت کی اور حکم کیا کہ ہمیشہ توپخانہ میں پچاس ہزار توپچی اور تین ہزار توپ عمدہ آراستہ تیار رہیں یہ بکرماجیت کھتری ہے میرے باپ کے فیل خانہ کے داروغہ مشرقی سے خدمت دیوانی اور مرتبہ امرائی کو پہنچا تھا فن سپہ گری اور تدبیر جنگ کو خوب جانتا ہے۔ (43)

عالمگیر اورنگ زیب مرحوم کے عہد حکومت میں ہندو امراء کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

ہفت ہزاری	2 نفر
شش ہزاری	2 نفر
پنج ہزاری	5 نفر
چار ہزاری	5 نفر
ساڑھے تین ہزاری	4 نفر
تین ہزاری	13 نفر

ڈھائی ہزاری	5 نفر
دو ہزاری	16 نفر
ڈیڑھ ہزاری	27 نفر
ایک ہزاری	15 نفر

مسٹر ظہیر الدین فاروقی بیرسٹرایٹ لاء تاریخ کیول رام مصنف تذکرہ الامراء سے مندرجہ بالا فہرست نقل کرکے فرماتے ہیں۔

> "ان مختلف فہرستوں اور پھر دوسرے واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ اورنگزیب مرحوم ہندوؤں کو ان کی لیاقت اور قابلیت کے لحاظ سے ہمیشہ بڑھاتا رہا۔ ہندوؤں کو اپنی سرکار میں ملازم رکھنے کے سلسلہ میں اس کا خیال تھا کہ مذہب کو دنیاوی امور کے بیچ میں لانا بے معنی ہے اور اس قسم کے معاملات میں مذہبی عصبیت کو راہ نہ دینا چاہیے۔" (44)

دوسری فہرست اورنگ زیب مرحوم کے زمانہ کے ہندو امراء کی حسب ذیل ہے۔

ہفت ہزاری	3 نفر
شش ہزاری	3 نفر
پنج ہزاری	9 نفر
چار ہزاری	5 نفر
تین ہزاری	13 نفر
ڈھائی ہزاری	9 نفر
دو ہزاری	5 نفر
ڈیڑھ ہزاری	40 نفر
ایک ہزاری	8 نفر
7 صدی	1 نفر
پانچ صدی	1 نفر

ایک صدی یعنی یوزباشی   1 نفر

ان منصب داروں کے علاوہ اکتالیس اور مختلف عہدوں پر ہندو اُمراء تھے ہفت ہزاری منصب سب سے اونچا ہوتا تھا جس کے لیے حسبِ ذیل اشیاء مقرر تھیں۔

گھوڑے 490	ہاتھی 141	اونٹ 100	خچر 20
چھکڑا 160	تنخواہ ماہوار تیس ہزار روپیہ		

نمبر دوم پنج ہزاری کی تنخواہ انتیس ہزار روپیہ تھی اور نمبر سوم کی تنخواہ اٹھائیس ہزار ماہوار تھی۔

اسی طرح ہر امیر کے حسب درجہ بڑی تنخواہیں اور وظائف تھے۔ جو کہ آج وہم و خیال میں بھی نہیں آ سکتے۔ ہفت ہزاری ہندو امراء میں سے ساہو پسر مہاراجہ سیتا بھی تھا اور پنج ہزاری امراء میں سے سیواجی کا داماد راجندر جی اور مالوی بھونسلہ بھی تھا۔ اورنگ زیب کے سپہ سالاروں میں راجہ جے سنگھ (جس کے نام پر شہر جے پور ہے) پنج ہزاری منصبداروں میں سے تھا۔ راجہ جسونت سنگھ کابل کا گورنر تھا۔ (45)

چونکہ اورنگ زیب مرحوم کا زمانہ سلطنت دراز اور طویل ہوا ہے' اس لیے امراء کی فہرستوں میں کمی زیادتی اور اختلاف ہونا لازمی امر ہے ہر مورخ نے اپنے زمانہ کے اعداد و شمار کا ذکر کیا ہے۔

وصیت بابر

شہنشاہ محمد ظہیر الدین بابر مرحوم اپنے بیٹے محمد ہمایوں نصیر الدین کو خفیہ وصیت میں مندرجہ ذیل الفاظ لکھتا ہے۔

> "اے پسر! سلطنت ہندوستان مختلف مذاہب سے پر ہے الحمد اللہ کہ اس نے اس کی بادشاہت تمہیں عطا فرمائی۔ تمہیں لازم ہے کہ تمام تعصبات مذہبیہ کو لوح دل سے دھو ڈالو۔ اور عدل انصاف کرنے میں ہر مذہب و ملت کے طریق کا لحاظ رکھو جس کے بغیر تم ہندوستان کے لوگوں کے دلوں پر قبضہ نہیں کر سکتے۔
>
> ۔ اس ملک کی رعایا مراحم خسروانہ اور الطاف شاہانہ ہی سے مرہون ہوتی ہے۔ جو قوم یا ملت حکوت کی مطیع اور فرماں بردار رہے۔ اس کے مندر

> اور مزار برباد نہ کئے جائیں عدل وانصاف ایسا کرو کہ رعایا بادشاہ سے خوش رہے۔ ظلم و ستم کی نسبت احسان اور لطف کی تلوار سے اسلام زیادہ ترقی پاتا ہے۔
>
> شیعہ و سنی کے جھگڑوں سے چشم پوشی کرو ورنہ اسلام کمزور ہو جائے گا جس طرح انسان کے جسم میں چار عناصر مل جل کر اتحاد و اتفاق سے کام کر رہے ہیں اسی طرح مختلف مذاہب رعایا کو ملا جلا رکھو اور ان میں اتحاد عمل پیدا کرو تاکہ جسم سلطنت مختلف امراض سے محفوظ و مامون رہے۔ سرگزشت تیمور کو جو اتفاق و اتحاد کا مالک تھا اپنی نظر کے سامنے رکھو تاکہ نظم و نسق کے معاملات میں پورا تجربہ ہو۔"

فرمان اورنگ زیب۔

شہنشاہ اورنگ زیب مرحوم اپنے ایک فرمان مورخہ 25 جمادی الاول 1065ھ

> میں (اب سے تین سو ایک برس پہلے) لکھتے ہیں ہماری پاک شریعت اور سچے مذہب کی رو سے یہ ناجائز ہے کہ غیرمذہب کے قدیمی مندروں کو گرایا جائے۔ ہماری اطلاع میں یہ بات لائی گئی ہے کہ بعض حاکم بنارس اپنے گرد و نواح کے ہندوؤں پر ظلم و ستم کرتے ہیں اور ان کے مذہبی معاملات میں دخل دیتے ہیں اور ان برہمنوں کو جن کا تعلق پرانے مندروں سے ہے ان کے حقوق سے محروم کیا جاتا ہے لہٰذا یہ حکم دیا جاتا ہے کہ آئندہ کوئی شخص ہندوؤں اور برہمنوں کو کسی وجہ سے بھی تنگ نہ کرے اور نہ ان پر کسی قسم کا ظلم کرے۔"

یہ فرمان ابوالحسن حاکم بنارس کے پاس سلطان محمد بہادر کی معرفت بھیجا گیا تھا۔ کیپٹن الگزینڈر ہملٹن ٹھٹھہ کے بارے اورنگزیب کے عہد میں لکھتا ہے۔

> "ریاست کا مسلمہ مذہب اسلام ہے لیکن تعداد میں اگر دس ہندو ہیں تو ایک مسلمان ہے۔ ہندوؤں کے ساتھ مذہبی رواداری پورے طور سے برتی جاتی ہے وہ اپنے برت رکھتے ہیں اور تہواروں کو اسی طرح مناتے ہیں جیسے کہ اگلے زمانہ میں کرتے تھے جبکہ بادشاہت خود ہندوؤں کی تھی وہ اپنے مردوں کو جلاتے ہیں لیکن ان کی بیویوں کو اجازت نہیں ہے کہ

شوہروں کے مردوں کے ساتھ ستی ہوں۔ (47)

کیپٹن ہملٹن سورت شہر کے بارے میں کہتا ہے۔

> "اس شہر میں تخمیناً سو مختلف مذاہب کے لوگ رہتے ہیں لیکن ان میں کبھی کوئی سخت جھگڑے ان کے اعتقادات و طریقہ عبادت کے متعلق نہیں ہوتے ہر ایک کو پورا اختیار ہے کہ جس طرح چاہے اپنے طریقے سے اپنے معبود کی پرستش کرے۔ صرف اختلاف مذاہب کی بنیاد پر کسی کو تکلیف دینا اور آزار پہنچانا ان لوگوں میں بالکل مفقود ہے۔ پارسی بھی ہیں اور وہ اپنے رسوم مذہب زرتشت کے بموجب ادا کرتے ہیں عیسائیوں کو پوری اجازت ہے اپنے گرجے بنائیں اور اپنے مذہب کی تبلیغ کریں اور بعض مرتبہ وہ کامیاب بھی ہو جاتے ہیں۔" (48)

(نوٹ) یہ شخص (کیپٹن الگزنڈر ہملٹن) زمانہ شہنشاہ اورنگ زیب مرحوم میں ہندوستان آیا تھا۔ اور 25 برس ہندوستان میں رہا تھا مگر کمپنی کا ملازم نہ تھا۔

اورنگ زیب کے فرامین اور مراسلات کے ایک قلمی مجموعہ میں جو ابھی تک طبع نہیں ہوا۔ مذہبی آزادی کا وہ جامع اور مانع اصول درج ہے جو ہر ایک بادشاہ کو غیرمذہب کی رعایا کے ساتھ برتنا ضروری ہے۔ جس واقعہ کے متعلق یہ اصول بیان ہوا ہے وہ یہ ہے کہ

> "عالمگیر کو کسی شخص نے عرضی دی کہ وہ پارسی ملازموں کو جو کہ تنخواہ تقسیم کرنے پر مقرر تھے اس علت میں برخاست کر دیا جائے کہ وہ آتش پرست ہیں اور ان کی جگہ کسی تجربہ کار معتبر مسلمان کو مقرر کیا جائے کیونکہ قرآن شریف میں آیا ہے۔
>
> يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّيْ وَعَدُوَّكُمْ اَوْلِيَآءَ (الاية)
>
> عالمگیر مرحوم نے عرضی پر مندرجہ ذیل حکم لکھا۔
>
> "مذہب کو دنیا کے کاروبار میں دخل نہیں ہے اور نہ ان معاملات میں تعصب کو جگہ مل سکتی ہے اور اس قول کی تائید میں یہ آیت نقل کی ہے لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ بادشاہ نے لکھا جو آیت عرضی نویس نے نقل کی ہے اگر یہی سلطنت کا دستور العمل ہوتا تو ہم کو چاہیے تھا کہ اس ملک کے سب راجاؤں اور ان کی رعیت کو غارت کر دیتے مگر

> یہ کس طرح ہو سکتا تھا۔ بادشاہی نوکریاں لوگوں کو ان کی لیاقت اور
> قابلیت کے موافق ملیں گی اور کسی لحاظ سے نہیں مل سکتیں۔ (49)

شہنشاہ جہانگیر مرحوم اپنی کتاب تزک جہانگیری صفحہ 82 میں فرمانات شاہی کی تفصیل دیتا ہو اپنے امراء کو مندرجہ ذیل الفاظ بھی لکھتا ہے۔

"اور بزور کسی کو مسلمان نہ کریں۔"

مندرجہ بالا شہادتیں صاف صاف روشنی ڈالتی ہیں کہ مسلمانوں کا عہد حکومت تعصب مذہبی اور فرقہ واریت سے پاک تھا۔ اس میں مساویانہ اور برابری کا سلوک تھا۔ ہر ہندوستانی کو خواہ کسی مذہب اور کسی برادری اور نسل سے تعلق رکھتا ہو حسب قابلیت حصہ ملتا تھا۔ کسی عہدہ انتظامی 'فوجی' ملکی کا دروازہ کسی کے لیے بند نہ تھا۔ سب سے لطف و احسان اور رحم و کرم اور ہمدردی کا معاملہ کیا جاتا تھا۔ تمام مذاہب کے ساتھ دریا دلی اور رواداری کا معاملہ ہوتا تھا۔ بادشاہوں کی پوری کوشش ہوتی تھی کہ مختلف مذاہب رعایا کو ملا جلا رکھا جائے۔ اور ان میں اتحاد عمل پیدا کیا جائے۔ سب کی ترقی اور خوشحالی فارغ البالی کا انتظام اور خیال رکھا جاتا تھا۔ ہر مذہب اور ملت کے ساتھ عدل وانصاف مراحم خسروانہ اور الطاف شاہانہ برتا جاتا تھا۔ ظلم و ستم' ستانا اور تنگ کرنا بغیر کسی جرم قانونی کے روا نہ رکھا جاتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ مسلمان بادشاہوں نے رعیت کے دلوں میں جگہ کر لی تھی۔ بادشاہ لوہے کی سنگینوں اور تلواروں اور آگ و بارود کی بندوقوں اور توپوں سے حکومت نہیں کرتا تھا۔ تمام امور حکومت میں رعایا کو دخل تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس زمانہ میں ہندوستان دن دگنی اور رات چوگنی ترقی کرتا گیا۔ اور ضرب المثل امن عام ملک میں پھیلا ہوا تھا۔

میجر باسو کہتا ہے:

رعایا کی خوشحالی اور سرمایہ داری کے اعتبار سے بھی مسلمانوں کا دور حکومت سونے کے حروف سے لکھے جانے کے قابل ہے دولت مندی اور آرام و چین کا جو نقشہ شاہجہاں کے وقت میں دیکھنے میں آتا تھا بلاشبہ بے مثل و بے نظیر تھا۔

حالانکہ اس زمانہ میں رسل و رسائل کے طریقے اس زمانہ جیسے ملک میں نہ تھے۔ ریلیں اور تار' موٹریں اور ہوائی جہاز' دخانی جہاز' ٹیلیفون وغیرہ معدوم تھے۔ مگر انگریزی حکومت بالکل اس کے برعکس تھی اور ہے جیسا کہ ہم اوپر لارڈ ولیم بنٹنگ وائسرائے ہند کا قول

نقل کر آئے ہیں وہ لکھتا ہے برخلاف اس کے انگریزی پالیسی اس کے برعکس ہے۔ اب سرد مہری، خود غرضی، بے پروائی ہے جس میں ایک طرف حکومت کا آہنی پنجہ حکمراں ہے اور دوسری طرف ہر چیز پر اپنا قبضہ ہے اور ہندوستانیوں کو کوئی دخل نہیں ہے۔

سر جان سلیور (مدراس گورنمنٹ کا ممبر) کہتا ہے۔

> ”وہ لوگ (باشندگان ہند) ٹیکسوں کے لگانے میں جن کی ادائگی کے لیے وہ مجبور کیے جاتے ہیں کوئی اختیار نہیں رکھتے۔ قوانین کو جن کی تعمیل ان پر فرض ہوتی ہے۔ مرتب کرنے میں ان کی کوئی آواز نہیں ہوتی۔ اپنے ملک کے انتظام میں ان کا کوئی حقیقی حصہ نہیں ہوتا اور ان حقوق کے دیئے جانے سے اس شرمناک حیلہ سے انکار کیا جاتا ہے کہ ان میں اس قسم کے فرائض کے انجام دینے کے لیے ذہنی اور اخلاقی اوصاف کی کمی ہے۔“

مگر افسوس ہے کہ انگریزی راج نے ہندوستان کی ان تمام خوبیوں کو (جن کا گزشتہ صفحات میں ذکر ہوا) تقریباً مٹا دیا۔ اور ان کے بجائے تمام بد اخلاقیاں اور برائیاں پیدا کر دیں۔ لارڈ میکالے کہتا ہے۔

> ”زمانہ سابق میں جس طرح زور دار اور بااثر لوگوں کو افیون کے پوست پلا کر کاہل، پست ہمت اور بد عقل بنا دیا جاتا تھا۔ ہمارا نظام سلطنت اسی طرح اہل ہند کو بے کار کر دے گا۔ (50)“

حوالہ جات باب اول

1- رپورٹ آئینی اصطلاحات مانٹیگو چیمسفورڈ ص 38

2- مسلمانوں کا روشن مستقبل ص 14

3- علم المعیشت ص 33

4- ہندوستان میں عیسائیوں کی حکومت از میجر باسو جلد 4 ص 446

5- رسالہ تلک جلد اول نمبر 6

6- ایضاً

7- ایضاً

8- رسالہ مظلوم کسان ص 13

9- مسلمانوں کا روشن مستقبل ص 15

10- ایضاً ص 16

11- ایضاً ص 16

12- ایضاً

13- ایضاً

14- رسالہ مظلوم کسان ص 13

15- ایضاً ص 14

16- مسلمانوں کا روشن مستقبل ص 44

17- معاشیات ہند ص 317

18- معیشت الہند ص 314

19۔ ترجمہ تزک جہانگیری ص 18

20۔ علم المعیشت ص 725

21۔ ترجمہ تزک جہانگیری ص 162,98,91,42,41

22۔ مدینہ بجنور جلد 21 / 22 مورخہ 25 جولائی 1932ء

23۔ سفرنامہ الیگزنڈر ہملٹن جلد 2 ص 25

24۔ ایضا ص 392

25۔ معیشت الھند ص 315

26۔ رسالہ مظلوم کسان ص 13

27۔ رسالہ تلک ص

28۔ علم المعیشت ص 580 تا 582

29۔ معیشت الھند ص 698 تا 700

30۔ مالیات عامہ ص 15

31۔ مالیات عامہ ص 16 ازرادھا کمار مرجیس اے ہسٹری آف انڈیا شپنگ

32۔ مالیاب عامہ ص 16

33۔ ماخوذ رپورٹ صنعتی کمیشن ص 299

34۔ دادا بھائی حکومت خود اختیاری ص 88

35۔ ایضاً

36۔ ایضاً

37۔ حیات حافظ رحمت خاں ص 674

38۔ تاریخ باسو جلد 5 ص 14 بحوالہ روشن مستقبل ص 164

39۔ مسلمانوں کا روشن مستقبل ص 164

40۔ حکومت خود اختیاری ص 75

41 - اخبار خلافت روزانہ بمبئی 2 نومبر 1923ء

42 - ایضاً

43 - انتخاب لاجواب لاہور 21 اگست 1928ء 1923ء

44 - خلافت 2 نومبر 1923ء

45 - ماخوذ از تقریر پی سی رائے مسلمانوں کا روشن مستقبل ص 24

46 - مسلمانوں کا روشن مستقبل ص 21

47 - ترجمہ تزک جہانگیری

48 - اورنگ زیب اور ان کا عہد از ظہیر الدین فاروقی بی اے علیگ ص 202

49 - علماءِ ھند کا شاندار ماضی جلد اول

50 - روز نامہ خلافت جلد 5 نمبر 160 مورخہ 18 اگست 1926ء از ڈاکٹر بال کرشن پرنسپل راجہ کالج کولہار پور مترجم از فارسی

51 - سفر نامہ ہندوستان جلد اول ص 127 - 128

52 - سفر نامہ ہندوستان عہد اورنگ زیب از نواب سمیع اللہ بیگ چغتائی چیف جج ہائی کورٹ حیدر آباد دکن

53 - دعوت اسلام (پریچنگ آف اسلام) ص 278

54 - حکومت خود اختیاری ص 24

دوسرا باب

انگریزوں کی آمد کے بعد کا تباہ حال ہندوستان

- ○ انگریزوں کی آمد کا پس منظر
- ○ انگریزوں کے ہاتھوں ہندوستان کی مالی بربادی
- ○ انگریزوں کے ہاتھوں ہندوستان کی زرعی بربادی
- ○ انگریزوں کے ہاتھوں ہندوستانی صنعت و تجارت کی بربادی
- ○ انگریزوں کے ہاتھوں ہندوستان کی اخلاقی بربادی
- ○ انگریزوں کے ہاتھوں ہندوستان کی تعلیمی بربادی
- ○ انگریزوں کے ہاتھوں ہندوستان میں فرقہ واریت کا فروغ
- ○ حوالہ جات

دوسرا باب

انگریزوں کی آمد کے بعد کا تباہ حال ہندوستان

ہندوستان میں انگریزوں کی آمد کا پس منظر

ہندوستان میں انگریزوں کی آمد کا مختصر واقعہ یہ ہے کہ ”اولوالعزمی اور جہاز رانی میں پرتگال والے یورپ بھر میں سب سے بڑھے ہوئے تھے اور کوئی دوسری قوم ان سے ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتی تھی چنانچہ ہندوستان اور یورپ کے درمیان بحری راستہ سب سے پہلے انہیں پرتگیزوں نے دریافت کیا۔

انہوں نے سمندر میں جہاز چھوڑ کر افریقہ کے ساحل کے برابر چلنا شروع کیا حتیٰ کہ جنوب میں پہنچ کر جو مڑے تو بحر ہند آ نکلے۔ ہوتے ہوتے ایک مشہور پرتگیز کپتان ”واسکوڈے گاما“ چند جہاز لے کر 1498ء میں ہند کے مغربی ساحل پر آیا اور شہر کالیکٹ میں وارد ہوا۔ وہاں کا راجہ زمورن کہلاتا تھا۔ اس نے واسکوڈے گاما کو شاہ پرتگال کے نام ایک خط دیا۔ جس میں تحریر تھا کہ میرے ملک میں دارچینی ‘لونگ’ کالی مرچ اور ادرک

کثرت سے ہوتے ہیں۔ میں تمہارے ملک سے سونا چاندی مونگا اور قرمزی مخمل چاہتا ہوں۔

اس وقت سے سو برس بعد یعنی 1500ء سے 1600ء تک ہند کی بحری تجارت بالکل پرتگیزوں کے ہاتھ میں رہی۔ انہوں نے مقام "گوا" میں ایک مضبوط قلعہ بنالیا تھا۔ آج تک یہ مقام پرتگیزوں کے قبضہ میں چلا آتا ہے یورپ کی باقی قوموں نے جو دیکھا کہ ہندوستان کی تجارت سے پرتگال والے مالا مال ہو گئے ہیں اور انہوں نے اپنے ملک اور شہروں کو رشک جنت بنالیا ہے تو ان کے منہ میں پانی بھر آیا۔ اور شوق پیدا ہوا کہ کسی نہ کسی طرح اس تجارت میں شریک ہونا چاہیے پس ہالینڈ' انگلستان' فرانس' ڈنمارک' جرمنی اور سویڈن کے تاجروں نے اپنے اپنے جہاز بھیجنے شروع کئے مگر کچھ کامیابی ہوئی تو صرف ہالینڈ' انگلستان اور فرانس والوں کو باقی کو کچھ نفع نہ ہوا۔(1)"

چنانچہ 1599ء میں انگریز ہندوستان میں تجارت کی غرض سے آئے یہاں کی پبلک اور حکام ہمیشہ سے مہمان نواز واقع ہوئے تھے۔ انہوں نے انگریزوں کے ساتھ ہمدردانہ طریقہ پر مراعتیں ہر قسم کی کیں۔ صاحب معیشۃ الہند لکھتا ہے (صفحہ 318) برطانوی عہد کی ابتداء بھی کیا ہی عجیب ہوئی جو قوم آج اس طرح ہند پر مسلط اور حکمراں ہے وہ آج سے سوا تین سو سال پہلے محض تجارت کے خیال سے یہاں پہنچی تھی۔

خدا کی دین کا موسیٰ سے پوچھے احوال
کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری ملجائے۔

24 ستمبر 1599 انگلستان کے حق میں کیسا مبارک دن تھا جبکہ لندن کے چند تاجروں نے آپس میں مل کر تہیہ کیا کہ مشرقی ممالک سے تجارت شروع کرنی چاہیے۔ چنانچہ اس غرض سے باقاعدہ ایک کمپنی قائم ہوئی جس میں لندن کے دو سو سے زیادہ تاجر اور امراء شریک تھے۔ 21 دسمبر 1600 کو ملکہ الزبتھ نے اس کمپنی کو شاہی منشور کے ذریعہ سے بلا شرکت غیرے ممالک مشرق سے تجارت کرنے کے پورے حقوق عطا فرمائے گویا کمپنی کو مشرقی تجارت کا باضابطہ اجارہ مل گیا۔

کوئی اور انگریزی کمپنی اس میں دخل نہیں پا سکتی تھی۔ سترہویں صدی کے شروع میں کمپنی کی طرف سے کچھ انگریز تاجر ہندوستان پہنچے۔ چنانچہ 1612ء میں اول مغربی ساحل پر بمقام سورت انہوں نے کاروبار شروع کیا۔ شہنشاہ جہانگیر کا زمانہ تھا نوواردوں نے جن جن

رعایات کی بارگاہ سلطانی میں استدعا کی وہ بخوشی عطا ہوئیں۔

1616ء میں کمپنی نے مشرقی ساحل پر بمقام سولی پٹم کارخانہ کھولا۔ 1640ء میں مقامی راجہ سے مدراس کی زمین لگان پر حاصل کی اور اس کا کچھ حصہ خرید کر وہاں قلعہ تعمیر کیا۔ بنگال میں تجارت کرنے کی اجازت کمپنی نے شہنشاہ شاہجہاں سے 1634ء میں حاصل کی 1640ء میں بمقام ہگلی ایک کارخانہ قائم ہوا جو 1690ء میں بعض مصلحتوں کی وجہ سے کلکتہ کو منتقل ہو گیا۔ اور اسی کے طفیل سے موجودہ شہر کی بنیاد پڑی اور جہاں آج بمبئی آباد ہے یہ جزیرہ کبھی پرتگال والوں کے قبضہ میں تھا۔ چارلس دوم نے جب ایک پرتگالی شہزادی سے شادی کی تو پرتگال کی طرف سے 1662ء میں یہ جزیرہ دلہن کے جہیز میں ملا۔ چنانچہ چارلس نے آمدنی کے خیال سے 1668ء میں یہ آراضی ایسٹ انڈیا کمپنی کو 10 پونڈ سالانہ لگان پر اٹھا دی۔ (آج وہاں دس پونڈ سالانہ کرائے پر ایک جھونپڑی ملنی مشکل ہے۔ اس طرح ہندوستان کے تینوں باموقع بندرگاہ کلکتہ بمبئی، مدراس ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھ آ گئے اور پھر ملک میں کمپنی جس طرح پھیلی اظہر من الشمس ہے۔

انگریزوں کے ہاتھوں ہندوستان کی مالی بربادی

حکومت اور صولت (رعب) کے نشہ میں یہ بات یاد رکھنی یا تسلیم کرنی دشوار ہے کہ کسی زمانہ میں یورپ بالخصوص انگلستان کے نووارد تاجروں پر ہندوستان کے فرماں رواؤں نے اپنی بے تعصبی اور دریا دلی سے کیا کیا احسان کئے اور کیسی کیسی رعایات و مراعات روا رکھیں، جو بعد کو فریق ثانی کی چالاکی اور احسان فراموشی سے خود ان کے حق میں وبال جان بن گئیں اور دوسروں کے واسطے خیر اندیشی اپنے حق میں سخت ناعاقبت اندیشی ثابت ہوئی، اگرچہ تاریخ ہند کے اس پہلو پر بہت اہتمام اور احتیاط سے پردہ ڈالا گیا ہے۔ مگر گزشتہ تین صدی کی تاریخ ہند کا یہ سب سے بڑا سبق ہے کہ ہندوستانی فرمانرواؤں کی بیجا رعایت اور بے محل اعتماد نے ہندوستان کو آنکھوں دیکھتے ہاتھوں سے نکال دیا۔(2)”

غرضیکہ ایسٹ انڈیا کمپنی اور انگریزوں کو ہندوستان کے بادشاہوں اور فرمانرواؤں نے وہ وہ رعایتیں اپنی بے تعصبی اور دریا دلی سے عطا کیں کہ آج یورپ کی تمدن کی مدعی قومیں اور انسانیت کی خدمت گزاری کے بلند بانگ دعوے کرنے والی بادشاہتیں کسی دوسری قوم اور نووارد مسافروں کے ساتھ روا نہیں رکھتیں، یہ اور ایسی مراعات تو درکنار حقوق شہریت تک بھی دوسروں کو نہیں دیتیں۔ لارڈ کلایو لکھتا ہے۔

> ”شہر مرشد آباد مثل لندن کے وسیع آباد اور خوشحال ہے مگر فرق یہ ہے کہ مرشد آباد میں ایسے ایسے افراد ہیں جو جائداد کے مالک ہونے میں انگلستان کے لوگوں سے بدرجہا بڑھے ہوئے ہیں مرشد آباد میں لاکھوں آدمی رہتے ہیں اگر وہ یورپینز کو تباہ کرنا چاہتے تو محض لاٹھیوں اور پتھروں سے کر دیتے۔(3)”

چاہیے تو یہ تھا کہ اگر انگریزوں میں تہذیب اور انسانیت و شرافت 'عدل و انصاف' مروت اور اخلاق ہوتے تو ہمیشہ ممنون احسان رہ کر دائرہ قانون اور انصاف کے ماتحت شکر گزاری کے ساتھ اپنی جائز تجارت میں مشغول رہتے مگر انہوں نے ابتداء ہی سے ان مراعات سے ناجائز فائدہ اٹھایا اور اپنی بربریت اور جلعسازیوں اور چالاکیوں اور غداریوں کو ہمیشہ کام میں لاکر ہر طرح ہندوستان میں لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم رکھا۔ اور لوٹ کھسوٹ کو اس قدر دن رات مختلف پیرایوں سے کام میں لاتے رہے کہ ہندوستان کی دولت مندی

ایک کہانی بن کر رہ گئی اور ہندوستان تمام دنیا میں سب سے زیادہ غریب فاقہ زدہ کنگال ملک ہو گیا۔ یہاں کی آبادی کروڑوں کی مقدار میں بھوک کی وجہ سے ایڑیاں رگڑتی ہوئی موت کے گھاٹ اتر گئی’ یہ سلسلہ ابتدائی تجارت سے لے کر آخری ایام حکومت کے تین سو برس سے زائد عرصہ میں برابر جاری رہا’ مگر ان دنوں میں ذرا بھی رحم دلی پیدا نہ ہوئی اور ہندوستانیوں کی لاچارگی اور مصیبتوں کا خیال بھی نہیں آیا۔

بے شک سنگدل حملہ آوروں کی عادت رہی ہے کہ وہ فتح یابی پر اپنی مفتوح قوموں اور ملکوں کو لوٹا کرتے تھے۔ مگر امن قائم ہو جانے اور اطاعت کا دم بھر لینے کے بعد سخت سے سخت سنگ دل اور وحشی حملہ آور لوٹ کھسوٹ کا خیال بھی اپنے ذہن میں نہیں لاتے تھے۔ مگر انگریز قوم اطاعت اور فرماں برداری کا دم بھرنے والی ہندوستانی رعایا کے متعلق بھی اسی لوٹ کھسوٹ کی تگ ودو اور فکر و کوشش میں مشغول رہی۔ اور نئے نئے انسانیت سوز طریقوں اور قوانین سے ہندوستانی پبلک اور امراء کو برباد کرتی رہی۔ اس کی تفصیل تو بہت طویل ہے ہم معتمد انگریزوں کی شہادتوں سے مختصر طور پر کچھ شہادتیں نقل کرتے ہیں۔

سرولیم ڈگبی ممبرپارلیمنٹ اپنی کتاب پراسپرس برٹش انڈیا میں انگریزی ادوار کا نقشہ کھینچتے ہوئے کہتا ہے۔

> ”جو کی 1901ء میں (جبکہ ہندوستان میں نہایت مہلک قحط پڑا ہوا تھا اور روزانہ لاکھوں آدمی بھوک اور فاقوں سے مرتے تھے۔) ہمارے طریقہ حکومت ہند میں دکھائی دے رہی ہے۔ جہاں تک ہندوستانیوں کا تعلق ہے اور جو کہ غیر معمولی غربت ہندوستانی براعظم میں پھیل رہی ہے وہ ہماری اس طرز حکومت کا نتیجہ ہے جو نیک نیتی سے مگر غلطی سے پہلے سے شروع کی گئی اور اب تک بحال رکھی گئی وہ اصول حکومت تین قسم کے ہیں۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے تین دور

اول تسلط بذریعہ تجارت’ ہندوستان کی دولت علانیہ اور ننگے طور پر

سمیٹنا 1700ء سے 1757ء تک۔ (اس دور کا آغاز 1607 سے ماننا چاہیے یعنی جب سے ہندوستان میں کمپنی کا تجارت کا دور شروع ہوا(4)۔

دوم تسلط بذریعہ اطاعت بالجبر ہندوستان انگلینڈ کے لئے ہے آغاز سے انجام تک 1757ء سے 1832ء تک۔

سوم تسلط بذریعہ پوست۔ خوش معاملگی کا دکھاوا اور زور کے ساتھ ہندوستانی قوم کو ادنیٰ حالت میں لازی طور پر قائم رکھنا۔ 1833ء سے 1901ء تک۔(5)"

اب ہم ان تینوں اصول حکومت اور تینوں ادوار کے حالات تفصیلیہ مختصر طور پر بیان کرنا ضروری سمجھتے ہیں ان تینوں ادوار اور اصول حکومت میں یہ امر مشترک رہا ہے کہ ہندوستان کی دولت اور سرمایہ کو زیادہ سے زیادہ حاصل کیا جائے اور انگلستان کو پہنچایا جائے۔ اگرچہ طریقہ حصول میں اختلاف نظر آتا ہے۔

تسلط بذریعہ تجارت کمپنی کا پہلا دور جو دور تجارت کہلاتا ہے

از 1608ء تا 1757ء

پہلے دور کے متعلق سرولیم ڈگبی لکھتا ہے۔ "ننگے طور سے علانیہ ہندوستان کی دولت ابتداء سے 1757ء تک (یعنی جنگ پلاسی کے زمانہ تک) سمیٹ کر انگلستان کو پہنچائی گئی۔ اس کی کیفیت خود کمپنی کے ڈائرکٹروں کی مندرجہ ذیل یاد داشت سے معلوم ہوتی ہے وہ لکھتے ہیں۔

> ہمارے خیال میں یہ بڑی دولت جو ہم نے ہندوستانی تجارت سے حاصل کی ہے ظالمانہ اور جابرانہ دستور العمل سے مہیا ہوئی ہے۔ ایسا دستور العمل جس کی نظیر نہ کسی ملک میں ملتی ہے اور نہ کسی زمانے میں ملے گی۔(6)"

یادداشت مذکورہ بالا میں لفظ بڑی دولت کا جو ذکر کیا گیا ہے اس کی مختصر کیفیت اس سے معلوم ہوتی ہے کہ مصنف رسالہ۔ "ایسٹ انڈیا ٹریڈ۔" صفحہ 30 - 16 پر لکھتا ہے۔

> "سب سے پہلے 1601ء میں ہندوستان کو جہاز روانہ کئے اور کچھ ایسی مبارک گھڑی سے تجارت شروع کی کہ ہر سفر میں منافع بڑھتا ہی رہا۔ یہاں تک کہ بارہویں سفر میں ہر حصہ دار کو (334) فیصد نفع ہوا۔ انگلستان کی آمدنی میں بھی دن دونی اور رات چوگنی زیادتی ہو گئی۔ 1613ء میں برطانیہ کی سرکار کو کمپنی نے (13000) تیرہ ہزار پونڈ محصول ادا کیا۔ اور 1662ء میں یہ رقم چالیس ہزار تک پہنچی۔ ہندوستان میں پہلے بیس سال کے اندر یہ لوگ تقریباً ساڑھے پانچ لاکھ پونڈ کا سونا چاندی لائے جس کے بدلے ہندوستان کی مصنوعات خرید کر لے گئے۔ ان اعداد سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان کا کاروبار شروع ہی میں کس پیمانہ پر پہنچ گیا تھا۔ (حالانکہ کمپنی کا مشترک سرمایہ ابتداء میں کل تیس ہزار پونڈ تھا جس کو لندن کے ایک سو ایک تاجروں نے مل کر ہندوستانی تجارت کے لیے جمع کرکے ملکہ الزبتھ کے دربار میں محضر پیش کرتے ہوئے اجازت کا

> معیار بنایا تھا جس پر 31 دسمبر 1600ء میں شاہی منشور کیا گیا تھا۔ (7)"
>
> لیکن یہ بڑے بڑے منافع اٹھانا ناممکن تھا۔ اگر ہندوستانی تاجروں اور ہندوستانی حکومتوں نے ان کو محبت کے ساتھ اپنے دامن میں جگہ نہ دی ہوتی۔ (8)"

بادشاہ انگلستان چارلس اول نے (جن کا زمانہ حکومت 1625ء لغایت 1649ء ہے) کمپنی سے دس ہزار پونڈ بطور نذرانہ بنام قرض حسنہ طلب کیا تو کمپنی یہ مقدار پیش نہ کر سکی جس سے چارلس اول خوش نہ ہوا اور کمپنی کی حسب خواہش امداد میں اس نے کوتاہی کی پھر کرام ول بادشاہ انگلستان کا دور آیا۔ (جو 1650ء سے 1660ء تک رہا اور اسی کے عہد میں انگلستان میں جمہوری طریقہ قائم ہوا) کمپنی نے اس کو ساٹھ ہزار پونڈ بطور نذرانہ بنام قرض د ـ پیش کیا۔ کیونکہ اس نے کمپنی کی دل کھول کر امداد کی تھی۔

صاحب معیشت الہند لکھتا ہے۔

> "غرضیکہ کرام ول کی حمایت نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو آخری وقت میں تباہی سے بچا لیا اور مردہ تن میں روح پھونک دی۔ کمپنی کا سرمایہ ضرورت اور توقع سے زیادہ بڑھ گیا کاروبار کی گرم بازاری شروع ہو گئی کمپنی نے اپنی حیثیت کے موافق کرام ول کا بہت شکریہ ادا کیا۔ تقریباً ساٹھ ہزار پونڈ قرض حسنہ کے نام سے بطور نذرانہ پیش کئے تاہم کمپنی کرام ول کی بہت شکر گزار تھی۔ (9)"

پھر چارلس دوم 1661ء سے فرمانروائے انگلستان ہوا اس نے کمپنی کی امداد میں بہ نسبت سابق بادشاہوں کے بہت زیادہ حصہ لیا۔ صاحب معاشیات ہند ص 672 پر لکھتا ہے۔

> "کرام ول نے آخری زمانہ میں کمپنی کے مردہ تن میں جان ڈالی تو چارلس دوم نے اس کو جوان رعنا بنا دیا۔ بادشاہ کی موافقت اور حمایت سے کمپنی کے کاروبار کو خوب فروغ ہوا۔ چنانچہ چارلس دوم کا عہد کمپنی کی تاریخ میں ایک مستقل دور شمار ہوتا ہے۔ کمپنی نے بھی احسان شناسی اور شکر گزاری میں کوئی کمی نہیں کی۔ دل کھول کر نذرانے پیش کئے اور مختلف مواقع پر قرض حسنہ کے نام سے معقول رقمیں داخل کیں چنانچہ تخمینہ کیا جاتا ہے کہ تین چار لاکھ پونڈ چارلس کو کمپنی سے وصول

ہوئے۔"

مذکورہ بالا شہادتوں سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ کمپنی جس کا سرمایہ ابتدائی 1601ء میں کل تیس ہزار پونڈ تھا تقریباً ساٹھ برس تجارت کرنے کے بعد اس قدر وہ دولت مند ہو جاتی ہے کہ بادشاہ انگلستان کو تین چار لاکھ پونڈ بطور نذرانہ پیش کرتی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس نے اس مدت میں ہندوستان کی اس عجیب و غریب تجارت سے خدا جانے کتنے کروڑ پونڈ حاصل کر لیے ہوں گے۔ جب لاکھوں پونڈ نذرانہ پیش کرتی ہے۔ حالانکہ اس زمانہ میں کمپنی کو پرتگیزوں ' ہالینڈ ڈچوں ' فرانسیسیوں ' جرمنوں وغیرہ سے مقابلہ کرنا پڑا اور ایسی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا کہ بارہا اپنے کاروبار تجارت بلکہ اپنے وجود کو بھی فنا کے گھاٹ اتر جانے کا خطرہ نظر آنے لگا اگر چارلس اول اور کرام ول چارلس دوم اپنے اپنے زمانہ میں کمپنی کے سنبھالنے میں حصہ نہ لیتے تو وہ یقیناً صفحہ ہستی سے مٹ جاتی۔

اس زمانہ میں کمپنی کے علاوہ انگریزوں کی دوسری جماعتیں بھی انفرادی یا اجتماعی طور پر ہندوستان میں تجارت کرتی تھیں اس لیے کمپنی کو خوب کھل کر لوٹ کھسوٹ اور من مانی کاروائیوں میں پوری آزادی نہ تھی ' آپس میں مخالفتیں اور روک ٹوک رہا کرتی تھی بالآخر 1700ء میں ان سبھوں کی ایک ہی جماعت بنا دی گئی جو کہ زیر سرپرستی حکومت انگلستان تجارت میں پیش قدمی اور انہماک کرتی رہی اور حکم ہو گیا کہ کوئی انگریز انفراد یا اجتماعاً علاوہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے تجارتی کاروبار ہندوستان میں نہ کرے۔

چنانچہ 1700ء سے کمپنی نے نیا مگر زور دار قدم اٹھایا اسی لیے سر ولیم ڈگبی 1700ء ہی سے پہلا دور بتلاتا ہے۔ حالانکہ اس وقت تک کروڑوں اشرفیاں یہاں سے انگلستان کو لے جائی جا چکی تھیں۔ مگر 1700ء سے تجارتی لوٹ کھسوٹ نئے اور پرزور طریقہ پر جاری ہوئی اور 1757ء تک خالص تجارتی طور پر جاری رہی۔ اس وقت میں پرتگیز بالکل اور ڈچ تقریباً ختم ہو چکے تھے۔ اب کمپنی بالکل کھل کھیلی اور اس قدر نفع کمایا کہ اس کی کوئی حد اور نہایت ہی باقی نہ رہی

ڈائرکٹروں کی یادداشت میں جو ظالمانہ اور جابرانہ دستور العمل سے اس تجارت کے مہیا ہونے اور اس کی کسی ملک اور کسی زمانہ میں نظیر نہ ملنے کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اس کی حقیقت مندرجہ ذیل شہادتوں سے معلوم ہوتی ہے۔ ہم پہلے ایسی شہادتیں پیش کر چکے ہیں کہ کمپنی کے کارکن ہمیشہ یہی کوشش کرتے تھے کہ کوئی جنٹلمین اور شریف آدمی

ہندوستان میں کمپنی کا ملازم ہو کر نہ آئے' کیوں کہ وہ شریفانہ طریقہ تمام لین دین اور معاملات میں اختیار کرے گا تو وہ جابرانہ لوٹ کھسوٹ جو کہ بے اندازہ منافع حاصل کرنے کے لیے ہم عمل میں لاتے اور سرکار کمپنی کو سالانہ پہنچاتے رہتے ہیں وہ بند ہو جائے گی تو خطرہ ہے کہ وہ اپنے اپنے سرمایہ کو واپس لے لیں اور کمپنی ٹوٹ جائے۔

اس لیے تمام کارکنان کمپنی جرائم پیشہ ڈاکو 'قاتل 'چور' جعلساز' بدمعاش اور غیر شریف لوگوں کو جمع کرتے تھے اور ایسے ہی لوگوں کو وہاں سے بلاتے تھے اور انتہائی بربریت اور جبرو ظلم عمل میں لاتے تھے۔ چنانچہ ہم مسٹر جیمس مل کا مقالہ تاریخ برٹش انڈیا صفحہ 23 سے نقل کر چکے ہیں کہ 1600ء میں جبکہ کمپنی نے ہندوستان میں تجارت کرنے کی اجازت حاصل کرنے کے لیے درخواست دے رکھی تھی اور منظوری کا مسئلہ زیر غور تھا تو گورنمنٹ انگلستان کی طرف سے کمپنی والوں کو لکھا گیا کہ تم اپنی مہم میں سرایڈورڈ مائیکل بوردن کو نوکر رکھ لو تو اس کے جواب میں ایک عجیب و غریب ریزولیوشن کی نقل بھیجی گئی جس کا مطلب حسب ذیل تھا۔

> "کسی ذمہ داری کے کام پر جنٹلمین کو نہ رکھا جائے اور گورنمنٹ سے درخواست کی جائے کہ ہمیں اپنے کاروبار کے لیے اپنے ہی قسم کے لوگوں کا انتخاب کرنے کی اجازت دی جائے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ شرفاء کو نوکر رکھنے سے کمپنی کے عوام الناس حصہ دار شبہ میں پڑ کر روپیہ واپس لینے لگیں۔"

الغرض کمپنی کی بناوٹ ایسے ہی لوگوں سے تھی اور چونکہ اس وقت کمپنی کا مقصد اصلی اور نصب العین تجارتی منافع تھا اس کے حصہ داروں کی مجلس منتظمہ (کورٹ آف ڈائرکٹرس) سب سے پہلے اپنے سالانہ منافع پر نظر رکھتی تھی۔ لہٰذا کمپنی کے وہ ملازم جو ہندوستان میں خرید و فروخت پر مقرر تھے چھوٹی چھوٹی تنخواہیں پاتے تھے۔ فیکٹری کے صدر کو تین سو پونڈ سالانہ ملتے تھے جو کہ سب سے اونچی تنخواہ تھی۔ محرروں اور دوسرے ملازمین کو دس سے لے کر چالیس پونڈ سالانہ تک دیے جاتے تھے۔ اور قیام و طعام کمپنی کے ذمہ ہوتا تھا۔ چونکہ اس زمانہ میں پونڈ دس روپیہ کا ہوتا تھا اس لیے کمپنی کے عام ملازمین کو آٹھ روپیہ ماہوار اور کھانے سے لے کر تینتیس روپے ماہوار اور کھانا تک ملتا تھا اور ملازمت کے ساتھ تجارت کا نفع ایک غیر معین چیز تھی۔ اس کے لیے وہ لوگ چھ ماہ کا

سفر کر کے یہاں آتے تھے۔ ان تنخواہوں پر بھلے مانس اور شریف لوگ تو کاہے کو اپنے گھر بار چھوڑ کر آتے تھے۔ چنانچہ ملک کے نکمے اور شریر جرائم پیشہ لوگ جن کو وہاں روٹی ملنی مشکل تھی بالخصوص اس وجہ سے کہ اس زمانہ میں انگلستان میں قحط بہت زیادہ پڑتا تھا اور ہندوستان میں بہت زیادہ ارزانی تھی ہندوستان کے لیے ٹوٹ پڑے۔ جن کی وجہ سے کمپنی کی فیکٹریاں بداعمالیوں کے اڈے بن گئیں ان لوگوں نے ہر قسم کے مظالم اور وحشیانہ کاروائیاں بے تحاشہ جاری کیں۔ اور ہر طریقہ پر روپیہ پیدا کرنے میں جدوجہد عمل میں لاتے رہے۔ چنانچہ نواب کرناٹک کا مندرجہ ذیل مقالہ ہم پہلے نقل کر آئے ہیں جو کہ انہوں نے کمپنی کے ڈائرکٹروں کو لکھا تھا۔

> "آپ کے نوکروں کا اس ملک میں کوئی کاروبار تو ہے نہیں۔ نہ آپ انہیں معقول تنخواہ دیتے ہیں پھر بھی چند ہی سال میں وہ کئی کئی لاکھ اشرفیاں کما کر واپس جاتے ہیں۔ اتنی قلیل مدت میں بغیر کسی ظاہری ذرائع کے یہ بے حساب کمائی کہاں سے آتی ہے ہم اور آپ دونوں سمجھ سکتے ہیں۔"

انہیں جیسے لوگوں کے متعلق وارن ہسٹنگز نے مندرجہ ذیل مقالہ لکھا تھا جس کو ہم پہلے نقل کر آئے ہیں۔

> "انگریز ہندوستان میں آکر بالکل نیا انسان بن جاتا ہے۔ جن جرائم کی وہ اپنے ملک میں کبھی جرات کر ہی نہیں سکتا' ہندوستان میں ان کے ارتکاب کے لیے انگریز کا نام جواز کا حکم رکھتا ہے اور اس کو سزا کا خیال تک نہیں ہو سکتا۔"

سرٹامس ہنسبم کہتا ہے۔

> "میں ہمیشہ سے دیکھتا ہوں کہ بمقابلہ اور قوموں کے انگریز غیر ممالک میں سب سے زیادہ چیرہ دستی کرتے ہیں۔ اور ہندوستان میں بھی یہی واقعہ پیش آ رہا ہے۔"

مدراس کے بڑے پادری صاحب کی اس تحریر کو جو انہوں نے انگریز جرائم پیشہ' رذیل اور شریر لوگوں سے تنگ آکر کمپنی کے ڈائرکٹروں کو 1676ء میں لکھی تھی ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں جو کہ حسب ذیل تھی۔

> ”آپ کے ملازموں کی بد اعمالیوں سے ہندوستانیوں کی نظر میں آپ کے خدا کی جتنی بے عزتی ہوتی ہے اور آپ کا مذہب جتنا بدنام ہو رہا ہے اس کی کیفیت اگر آپ کو معلوم ہو جائے تو آپ کے آنسوؤں کی ندیاں بہہ جائیں۔ جو لوگ آتے ہیں ان میں بعض قاتل ہوتے ہیں۔ بعض آدمیوں کو بھگا لے جانے کا کام کرنے والے اور بعض انگلستان میں بیویاں چھوڑ کر آتے ہیں اور یہاں پھر شادیاں کر لیتے ہیں۔“

غرض کہ کمپنی نے تمام کارکن ایسے ہی دنی الطبع (کمینہ طبیعت) اور غیر شریف قصداً جمع کئے تھے جن کو کسی شرمناک اور انسانیت سوز کاروائی سے رکاوٹ نہ تھی اور اپنے مقاصد ملعونہ لوٹ کھسوٹ اور زرکشی میں نہایت آزادی سے بلاخوف و خطر ہر قسم کی کاروائی کرتے تھے۔ مشتے نمونہ از خروارے کرناٹک کا ایک تاریخی واقعہ ملاحظہ ہو۔

ان کے روپیہ کمانے کے مختلف قسم کے طریقے تھے ان میں سے ایک قرضہ دینا بھی تھا مگر جس نوعیت کے یہ قرضے ہوتے تھے ان کی نظیر دنیا میں ملنی مشکل ہے۔ چنانچہ مسٹر برک نے ایک قرضہ کی نسبت لکھا ہے:

> ”نواب کرناٹک کو روپیہ کی ضرورت ہوئی۔ کیونکہ فوج کی تنخواہ تقسیم نہ ہوتی تھی جس سے وہ فساد برپا کرتی رہتی تھی۔ مدراس کونسل نے دوستانہ طور پر سمجھایا کہ ان شوریدہ سر فوجیوں کو دبایئے۔ نواب نے جواب دیا کہ روپیہ سے مجبور ہوں کیا کروں۔ اس پر انگریزی حکومت نے چند ساہو کاروں کو آمادہ کر دیا کہ نواب کو چار لاکھ اشرفی (پگوڈا) قرض دے دیں۔ یہ ساہو کار مسٹر ٹیلر، مسٹر میجنڈی، مسٹر کال تھے۔ یہ راضی تو ہو گئے مگر اس شرط پر کہ مدراس کی انگریزی حکومت نواب کی ضمانت دے۔ چنانچہ ضمانت دے دی گئی اور طے پایا کہ چند اضلاع قرض خواہوں کے سپرد کر دیئے جائیں جن کی مالگزاری سے وہ اپنا سود وصول کرتے رہیں۔ اس کے مطابق نواب سے معاہدہ ہو گیا اور اس نے فوراً سپاہیوں کو علیحدہ کرکے اعلان کر دیا کہ ان کی چڑھاؤ تنخواہیں ادا کر دی جائیں مگر ان انگریز ساہو کاروں کے پاس سے قرضہ کا روپیہ نہ آیا۔ بڑے تقاضوں کے بعد جواب آیا تو یہ تھا کہ نقد روپیہ اس وقت نہیں ہے۔ چار

> ماہ کے اندر ادا کر دیا جائے گا۔ سردست ہم آپ کو رقعہ لکھے دیتے ہیں کہ اس میعاد کے اندر روپیہ دے دیں گے۔ نواب نے افسروں کو بلا کر حال بتایا اور کہا کہ فوجیوں کو سمجھا بجھا کر مطمئن کر دو کہ چار مہینہ بعد تنخواہ مل جائے گی۔ مگر چار مہینے کی جگہ پورے دو سال گزر گئے اور فوجیوں کی بقایا تنخواہ پوری ادا نہ ہوئی۔ جس کی وجہ سے نواب کو مزید دو سال کی تنخواہیں دینا پڑیں۔ مگر ساہوکاروں کی اس قدر نا دہندی کے باوجود نواب کی ریاست کی مال گزاری قرضہ کے سود میں اسی دن سے جس دن سے کہ رقعہ لکھا گیا تھا جانے لگی۔ گویا انہیں اضلاع کی مال گزاری سے موعودہ رقم باقساط دی گئی۔ غالباً دنیا میں یہ ایک ہی مثال ہو گی کہ روپیہ کی ادائیگی سے قبل قرض خواہوں کو جائداد پر قبضہ مل جائے۔ اور اس سے وہ اپنے سود کا روپیہ وصول کرنا شروع کر دیں اور پھر الٹا قرض داروں کے نام غیرادا شدہ رقم کا رقعہ لکھیں اور مرہونہ جائداد سے وصول کر کے دو سال بعد قرض داروں کو روپیہ دیں۔ (10)

یہی وہ کیمیا بنانے کے نسخے تھے جن سے تھوڑے ہی دنوں میں انگریز ساہوکار اور تاجر اور ان کا ملک مالا مال ہونے لگا۔ ابھی کرناٹک کی مرہونہ جائداد سے کمائی کرنے کا سلسلہ جاری ہی تھا کہ بنگال کے خزانوں کے دروازے ان پر کھل گئے۔ بہر حال 1757ء تک کمپنی کا یہ شرافت اور انسانیت سوز طریقہ تجارت جابرانہ اور ظالمانہ طور کا جاری رہا جس سے نہایت عظیم الشان دولت ہندوستان سے چوس لی گئی۔

کمپنی کا دوسرا دور تسلط بذریعہ اطاعت بالجبر

از 1757ء تا 1832ء

اس کے بعد دوسرا دور شروع ہوتا ہے جس کی ابتداء جنگ بنگال یعنی نواب سراج الدولہ کی پلاسی کی لڑائی سے ہوتی ہے۔ سرولیم ڈگبی اس کے متعلق مندرجہ ذیل الفاظ لکھتا ہے:۔

> کمپنی کا دوسرا دور جو کہ جبر کا کہلاتا ہے۔

دوم تسلط بذریعہ اطاعت بالجبر۔ ہندوستان انگلینڈ کے لیے ہے آغاز سے انجام تک 1757ء سے 1832ء تک۔ اس کی تفصیل نہایت ہی دردانگیز اور دہشت ناک ہے اور اس قدر طویل ہے کہ اس کے لیے کئی جلدوں کی ضرورت ہے ہم اس مقام پر نمونہ کے طور پر چند شہادتیں پیش کریں گے جن سے حقیقت ظاہر ہو جائے گی۔ مگر ان شہادتوں سے پہلے واقعہ کی تفصیل پر مختصر روشنی ڈالنی ضروری معلوم ہوتی ہے۔

کلکتہ میں بیٹھ کر انگریزوں نے ایک سازش کا سلسلہ شروع کیا جس میں میر جعفر اور امی چند شریک تھے۔ انگریز مورخ واقعات لکھتے نہیں بلکہ تصنیف کرتے ہیں۔ اس سازش کو اس بد دلی کا نتیجہ بتلاتے ہیں جو بنگال کے ہندو محکوم کو مسلمان حاکم سے پیدا ہو گئی تھی۔ اس الزام کی تردید ہمارے مبحث سے خارج ہے بہرکیف سازش مکمل ہوتے ہی جنگ چھیڑ دی گئی اور پلاسی کے میدان میں دونوں لشکر بالمقابل آگئے۔ سراج الدولہ کے چالیس ہزار پیادے اور پندرہ ہزار سوار انگریزوں کے صرف تین ہزار سپاہ کے مقابلہ میں تھے۔ لیکن انگریزوں کی قوت کا مدار تعداد پر نہیں بلکہ نظم اور دوسری چیزوں پر تھا۔ یہ دوسری چیزیں کیا تھیں؟ یہ فریب اور نمک حرامی دغا اور سازش تھیں جن میں سراج الدولہ گھرا ہوا تھا اور باوجود نام نہاد کثیر جمعیت کے درحقیقت اکیلا اور بے یار و مددگار تھا چنانچہ صبح کے آٹھ بجے سے دن کے بارہ بجے تک کل چار گھنٹہ میں اس تاریخی جنگ کا فیصلہ سراج الدولہ کے خلاف ہو گیا۔

انگریزوں کی طرف سے سراج الدولہ کے وزیر میر جعفر کو نمک حرامی کے صلہ میں مرشد آباد کی مسند دی گئی۔ اس جنگ کی اہمیت کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ انگریزی فوج میں سے صرف بتیس سپاہی اور نواب کی فوج میں پانچ سو آدمی کام آئے یہ تعداد جلیانوالہ باغ اور بلوہ کانپور کے مقتولین سے زیادہ نہ تھی۔ لیکن اس جنگ نے ایک وسیع اور شاداب ملک کی قسمت کا فیصلہ کر دیا۔ فورٹ ولیم میں سونے کا مینہ برسنے لگا۔ میر جعفر کی طرف سے تین لاکھ پونڈ یعنی تیس لاکھ روپیہ کلایو کو نذر کیا گیا۔ اور کلکتہ کا جنوبی علاقہ اسے جاگیر میں دیا گیا۔ جس کی آمدنی دس لاکھ روپیہ سالانہ تھی۔ اس طرح ساٹھ ہزار پونڈ یعنی چھ لاکھ کونسل کے ممبروں کو پیش کیا گیا۔ یہ تو ذاتی انعامات تھے۔ کمپنی کے ہر خرچہ اور تاوان کے مطالبات ان سے الگ تھے جن کو اس وقت پورا کرنے کی گنجائش خزانہ میں نہ رہی تھی اس لیے صرف نصف کی ادائیگی ہو سکی۔ چوبیس پرگنہ کا علاقہ کمپنی کی جاگیر

ٹھہری- بقول میکالے-

> ”کمپنی اور اس کے نوکروں پر موسلا دھار بارش شروع ہو گئی- اسی لاکھ روپیہ دریا کے راستہ مرشد آباد سے کلکتہ روانہ کر دیا گیا- سو سے زیادہ کشتیاں تھیں- جھنڈیاں اڑ رہی تھیں اور باجا بجتا جاتا تھا- چند ماہ پہلے جو کلکتہ ویران تھا آج ایسا خوشحال ہو گیا کہ کبھی دیکھنے میں نہ آیا تھا تجارت چمک اٹھی- ہر انگریز کے گھر میں دولت کے آثار دکھائی دینے لگے-(11)“

اس جنگ کی کامیابی سے جو 1757ء میں ہوئی کمپنی کے خالص تجارتی دور کا خاتمہ ہو گیا جو 1608ء سے شروع ہو کر پورے ڈیڑھ سو سال تک رہا اور اب ایک وسیع ملک ہاتھ میں آجانے سے تجارت کے ساتھ حکومت کا دور شروع ہوا-(12)

علاوہ اس مقدار کے جو میر جعفر سے حاصل کی گئی عام لوٹ کا بازار بھی گرم کیا گیا چنانچہ لارڈ کلایو بنگال کی لوٹ کے بارے میں کہتا ہے

> ”تین کروڑ انسانوں کو لوٹ کر کلکتہ میں عظیم الشان دولت بہت جلد جمع کر لی گئی تھی- ہندوستانی قدیم زمانوں میں معمولی معمولی نظام کی خرابی پر اپنے حاکموں کو برطرف کر دیا کرتے تھے- مگر انگریزی حکومت سنگدل سے سنگدل وحشی اور مستبد حکومتوں کی طرح ظالم اور سخت تھی- مزید برآں تمام تمدنی طاقتور ہتھیاروں سے مسلح تھی-(13)“

یہی لارڈ کلایو دوسری جگہ کمپنی کے کارکنوں کے متعلق لکھتا ہے-

> ”میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس قدر بد عملی، رشوت خواری اور زیادہ ستانی کا منظر بجز بنگال کے کسی ملک میں دیکھا یا سنا نہیں گیا-“

بروکس اینڈمسن کہتا ہے (کتاب قانون تمدن و تنزل)

> یہ مالا مال خزانے کروڑوں آدمیوں کی کمائی انگریزوں نے ہتھیا کر لندن اسی طرح بھیج دی جس طرح رومن نے یونان اور پونٹس کے خزانے اٹلی بھیج دیئے تھے- ہندوستانی خزانے کتنے قیمتی تھے، کوئی انسان بھی اس کا اندازہ نہیں کر سکتا- لیکن وہ کروڑوں اشرفیاں ہوں گی- اتنی دولت اس وقت کی مجموعی یورپین دولت سے بہت زیادہ تھی جب میں 1750ء میں انگلستان آیا تو یہاں بڑے بڑے شہر تھے جہاں کوئی بینک نہ تھا- بنگال

> کی چاندی نے انگلستان پہنچ کر نہ صرف دولت میں بے شمار اضافہ کیا بلکہ اس کی رفتار بھی بہت تیز کر دی۔(14)"

سر ولیم ڈگبی لکھتا ہے۔ از کتاب "قانون تہذیب و تنزل" مصنفہ بروک ایڈمسن ا "معرکہ پلاسی کے بعد ہی بنگالہ کی دولت لٹ لٹ کر لندن پہنچنے لگی اور اس کا اثر فوراً ہی ظاہر ہو گیا۔ کیونکہ ماہرین فن اس امر پر متفق ہیں کہ صنعت و حرفت کا انقلاب 1760ء سے شروع ہوا۔ بقول بینز کے 1760ء سے پہلے لنکا شائر میں سوت کاتنے کے جو چرخے رائج تھے وہ ایسے ہی سیدھے سادے ہوتے تھے جیسے ہندوستانی چرخے۔ ایجاد بجائے خود ایک بیجان چیز ہے۔ بہت سی ایجادات صدیوں تک دبی پڑی رہیں اور جب تک انہیں حرکت دینے والی قوت پیدا نہ ہو گئی وہ دنیا کے سامنے نہ آ سکیں۔ یہ قوت ہمیشہ روپیہ سے فراہم ہوتی ہے۔ صنعت و حرفت میں انگلستان کی برتری کرناٹک اور بنگال کے خزانوں کا فیض ہے جو اس وقت کے فائدے کے لیے حاضر تھے۔ پلاسی کی جنگ فتح ہونے سے پہلے جبکہ سونے کا دریا انگلستان کی طرف بہنا شروع نہ ہوا تھا ہماری صنعت و حرفت کا بازار ٹھنڈا تھا۔ چرخوں کے لحاظ سے سوت کاتنے اور کپڑا بننے میں لنکاشائر کو ہندوستان پر کوئی فوقیت حاصل نہ تھی۔ البتہ وہ دستکاری جس نے ہندوستانی کپڑے کو صناعی کا عجوبہ بنا رکھا تھا لنکاشائر میں کیا مغرب میں کہیں بھی موجود نہ تھی جو حال روئی کا تھا وہی لوہے کا بھی تھا کان کنی اور آہن گری دونوں کام انگلستان میں بہت معمولی رفتار سے چل رہے تھے۔(15)"

میجر وینگیٹ کہتا ہے۔

> "ایسٹ انڈیا کے ڈائرکٹروں کے سرسری اندازہ کے ساتھ بڑی آسانی سے دعوی کیا جا سکتا ہے کہ جنگ پلاسی اور جنگ واٹرلو کے درمیانی زمانہ میں ہندوستان سے انگلستان کو پندرہ ارب روپیہ جا چکا تھا۔"

لارڈ میکالے بنگال کی لوٹ کے بارے میں لکھتا ہے۔

> "اس طریقہ سے بے شمار دولت بہت جلد کلکتہ میں جمع ہو گئی دراں حالیکہ تین کروڑ انسان حد درجہ برباد کر دیئے گئے بیشک ان لوگوں کو مظالم میں رہنے کی عادت تھی مگر وہ مظالم اس قسم کے نہ تھے کمپنی کے لوگوں کی چھوٹی انگلی انہیں سراج الدولہ کے پٹھے سے زیادہ موٹی معلوم ہوتی تھی پرانے زمانے کے حکام کے زمانہ میں ان کے ہاتھ میں ایک

> علاج تھا وہ یہ کہ جب ظلم ناقابل برداشت ہو جاتا تو وہ بغاوت کر کے حکومت توڑ دیتے تھے مگر انگریزی حکومت ہلائے ہل نہیں سکتی تھی۔ یہ حکومت وحشیوں کی سی حد درجہ ظالمانہ حکومت ہونے کے ساتھ جدید تہذیب کے آلات کی طاقت سے مضبوط تھی۔ (16)"

سر ولیم ڈگبی کہتا ہے۔

> "قبل اس کے کہ جنگ پلاسی فتح ہوئی اور ہندوستان کے خزانے بہہ بہہ کر انگلستان میں آنے شروع ہوئے ہمارے ملک انگلستان کا جوار بھاٹا نہایت نیچا تھا۔ خود انگلستان کی صنعتی ترقی بنگال کے بے شمار دولت کے ذخیروں اور کرناٹک کے خزانوں کی بدولت ہوئی۔ (17)"

لارڈ میکالے لکھتا ہے۔

> "دولت کے دریا یہاں سے انگلستان کو بہتے چلے جاتے تھے۔ (18)"

سر جان شور (جس کا تعلق بنگال سول سروس سے تھا قانون 1933ء پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

> "لیکن ہندوستان کا عہد زریں (سنہرا زمانہ) گزر چکا ہے۔ جو دولت کبھی اس کے پاس تھی اس کا جزو اعظم ملک سے باہر کھینچ کر بھیج دیا گیا ہے۔ (19)"

اس زمانہ میں کمپنی نے ایک اور عجیب و غریب نئی تجارت کی بنا ڈالی اور وہ گدیوں کی تجارت تھی۔

محمد علی کرناٹک میں اور میر جعفر کو بنگال میں تخت دلانے سے یہ تجربہ ہوا تھا کہ سلطنت کے ہر انتقال سے انگریزی خزانہ مالا مال ہو جاتا ہے۔ چنانچہ میر جعفر کو ہٹا کر میر قاسم کو مسند پر بٹھایا گیا۔ میر قاسم نے بغاوت کی تو پھر میر جعفر سے سودا کر لیا گیا۔ اس کے بعد نجم الدولہ سے سودا کیا گیا۔ اس سوداگری سے انگریزوں نے جو نفع حاصل کیا اس کی مقدار پانچ کروڑ کے قریب ہوتی ہے۔ تفصیل حسب ذیل ہے۔

1757ء میں میر جعفر کی تخت نشینی پر	30610750 کروڑ
1760ء میں میر قاسم کی تخت نشینی پر	2627690 لاکھ

1763ء میں میر جعفر کی دوسری تخت نشینی پر	14184990 کروڑ
1765ء میں نجم الدولہ کی تخت نشینی پر	1976900 لاکھ
میزان------------------------------	49400330 کروڑ

اسی قسم کے طریقوں سے 1771ء تک جو رقم کمپنی اور اس کے ملازمین کے پاس پہنچی اس کی میزان ساڑھے انتیس کروڑ روپیہ کے قریب ہوتی ہے۔ جس میں فوجی اخراجات تاوان' نذرانے اور مالگزاری کی بچت بھی شامل ہے۔(20)"

کمپنی کی لوٹ کھسوٹ اور زرکشی کا سلسلہ اسی طرح برابر جاری رہا اور تقریباً بیس برس کے بعد مسٹر برک نے ہسٹنگز کے مقدمہ کے دوران میں اس کل رقم کا جو اس وقت تک یہاں سے انگلستان پہنچ چکی تھی چالیس کروڑ کے قریب اندازہ کیا تھا۔(21)"

حکومت اور اس نئے اور عجیب طریقہ کی لوٹ کھسوٹ کی تجارت کے ساتھ ایک اور عجیب و غریب طریقہ حاصل کیا گیا کہ فرخ سیر بادشاہ دہلی کی لڑکی جل گئی اس کا علاج دہلی کے اطباء کے قابو میں نہیں آیا تو ڈاکٹر ہملٹن کو کمپنی نے پیش کیا اتفاق ایسا پیش آیا کہ ڈاکٹر ہملٹن مذکور کا علاج کامیاب رہا اور لڑکی درست ہو گئی۔ فرخ سیر بہت خوش ہوا اس نے حسب عادت بادشاہان ہند اس کو زرو جواہر سے مالا مال کرنا چاہا۔ ڈاکٹر ہملٹن نے اس کے لینے سے انکار کر دیا اور اس کے عوض میں یہ استدعا کی کہ کمپنی کو اس ٹیکس سے جو تجارت پر لیا جاتا ہے مستثنیٰ کر دیا جائے۔ اہل دربار شاہی اس کے زہریلے نتائج تک نہ پہنچ سکے اور بادشاہ سے فرمان اس قسم کا جاری کرا دیا کہ کمپنی کے تمام کارکن تجارتی ٹیکس سے مستثنیٰ رکھے جائیں۔ یہ حکم جاری ہونا تھا کہ انگریزوں نے تمام ملک میں اودھم مچا دی اور ہر قسم کی تجارت میں گرم بازاری شروع کر دی اور کروڑوں کا سودا کرنے لگے۔ ہندوستانی تاجروں کے تمام کاروبار بند ہو گئے۔ اور طرح طرح سے انگریزوں نے ہر قسم کی تجارت پر قبضہ کر لیا۔ اس وقت کی کیفیت کا نقشہ مندرجہ ذیل تاریخی تحریر سے معلوم ہو گا۔

> ”پلاسی کی لڑائی کے بعد بنگال کی حکومت اب برائے نام میر جعفر کی رہ گئی اور سلطنت پر دروبست قبضہ کمپنی کا ہو گیا۔ اس طرح ذمہ داری نواب کی رہی اور اختیارات کمپنی کے ہاتھ میں چلے گئے۔ اس صورت

حال میں کمپنی کو ناجائز مالی فائدے اٹھانے کا خوب موقعہ ملا جو اس کا اصلی مقدمہ تھا اور اس نادر موقعہ کے مل جانے سے کمپنی کے سینوں میں حرص و آز کے جذبات بہت مشتعل ہو گئے زر کشی اور اخاذی (لوٹ) کی لگن بے لگام ہو گئی۔ اس سے قبل ڈاکٹر ہملٹن فرخ سیر کا معالج رہ کر انگریزی مال کو تمام محصولوں سے مستثنیٰ کرا چکا تھا۔ حالات سب سازگار جمع ہو گئے تھے اس لیے کمپنی کے ملازموں نے نجی تجارت شروع کر دی اور ایسی شروع کی کہ بنگال میں شاید ہی کوئی بڑی منڈی ہو گی جہاں گھی، پان، بانس، چاول بھس وغیرہ کی خرید و فروخت انگریز نہ کرتے ہوں۔ دیسی سوداگر جنہیں سرکاری محصول بھی دینا پڑتے تھے کمپنی کے مال کا کیا مقابلہ کر سکتے تھے انگریز تاجروں سے خود نواب ڈرتا تھا۔ اس لیے اس کو پولیس اور اس کی کچہریاں ان کو سزا نہ دے سکتی تھیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تجارت کے نام سے لوٹ شروع ہو گئی۔ انگریز سوداگر جس مال پر ہاتھ رکھ دیتے اس کو خریدار آنکھ اٹھا کر نہ دیکھ سکتا تھا اس لیے یہ لوگ اس مال کو من مانی قیمت پر خرید لیتے تھے اور اپنا مال نکالنا ہوتا تو جب تک کہ اس کی نکاسی نہ ہو جاتی دوسرے سوداگر دوکان بند رکھنے پر مجبور ہوتے تھے۔

اس کے علاوہ جس ہندوستانی تاجر کو محصول سے بچنا ہوتا تو وہ کسی انگریز گماشتہ کی مٹھی گرم کر کے اس سے ایک دستک حاصل کر لیتا جس سے کسی محصل کی مجال نہ تھی کہ مال پر محصول مانگ سکتا اس کی وجہ سے کمپنی کے ادنیٰ ادنیٰ محرر دیسی سوداگروں کے ہاتھ دستکیں بیچ بیچ کر دو تین تین ہزار روپیہ ماہوار پیدا کر لیتے تھے۔ خود نواب بے دست و پا تھے۔ زیادہ سے زیادہ کر سکتے تھے تو یہ کہ ظالم ملازموں کی شکایت انہیں کے بے رحم افسروں سے کرتے چنانچہ میر قاسم نے حکام کمپنی سے حسب ذیل فریاد کی۔

"ہر پرگنہ گاؤں اور منڈی میں انگریزی گماشتے نمک، چھالی، گھی، چاول، بھس، بانس، مچھلی، تمباکو وغیرہ کی خرید و فروخت کرتے ہیں رعایا کا مال

> زبردستی اٹھا لے جاتے ہیں اور چوتھائی قیمت بھی نہیں دیتے۔ اور ان کے ظلم و جبر کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ اپنے مال کے بدلہ ایک کی جگہ پانچ زبردستی لے لیتے ہیں۔ ان بے عنوانیوں کی بدولت تیز محصولوں کی معافی کے سبب مجھے پچیس لاکھ روپے کا نقصان ہو رہا ہے۔(22)"
>
> مگر ایسی شکایتوں کا اثر ہی کیا ہوتا دولت کی چاٹ نے کمپنی کے لوگوں کو رحم و انصاف کے جذبات سے خالی کر دیا تھا۔ بالآخر مجبور ہو کر میر قاسم نے دیسی سوداگروں کو بھی محصول سے معاف کر دیا اس پر انگریز بگڑ گئے اور ایسے بگڑے کہ میر قاسم کو بنگال چھوڑ کر شمالی ہند کی طرف جانا پڑا اور پھر وہاں سے شجاع الدولہ والئ اودھ اور شاہ عالم کی مدد لے کر بنگال کا رخ کیا تو انگریزوں سے 1764ء میں بکسر کے مقام پر شکست کھائی اس سے اگلے سال 1765ء میں الہ آباد کا مشہور صلح نامہ ہوا جس کی رو سے کمپنی کو بادشاہ دہلی کی طرف سے بنگالہ کا دیوان یعنی مال گزاری وصول کرنے والا افسر مقرر کر دیا گیا اور اس کے بدلے میں بادشاہ کا نذرانہ مقرر ہو گیا۔ نواب بنگال کے ذاتی مصاریف اور انتظامی محکموں کے اخراجات کے لیے ایک رقم معین کر دی گئی۔ اور قرار پایا کہ ان دو مصارف کی منہائی کے بعد جو بچے وہ کمپنی کا ہو اس معاہدہ کے وقت تک تو انگریزی عمل دخل بے ضابطہ طور پر تھا۔ اب شاہی فرمان کی رو سے انگریزی قبضہ کے جواز کی سند مل گئی۔(23)"

اس کے بعد کمپنی کے لیے ایک اور نیا طریقہ لوٹ کھسوٹ کا ہاتھ آ گیا۔ زمین کا بندوبست اور اس کا لگان ٹھیکہ اور نیلام اس کی مال گزاری کا اضافہ یہ سب نئے نئے ذرائع پیدا ہو گئے۔ دیوانی ملنے کے بعد ہی اضافہ مالگزاری کیا گیا۔ اور پہلے لگان پر نوے فیصد یا اس سے زائد اضافہ کیا گیا۔ جس سے کاشتکار بالکل تباہ ہو گئے اور کمپنی کے یہاں سونے کی بارش ہونے لگی۔ الحاصل اس تمام دور میں جس کی ابتداء جنگ پلاسی 1757ء سے ہوتی ہے جابرانہ طور پر طرح طرح سے دولت اور سرمایہ کی لوٹ جاری ہوئی اور بے شمار خزانے ہر طرف سے لٹ لٹ کر لندن میں پہنچنے لگے۔ کمپنی ایک طرف تو قسم قسم کی تجارت سے خوب ہاتھ پاؤں پھیلا کر لوٹتی تھی دوسری طرف حکومت کے ذریعہ سے خوب

من مانی لوٹ کھسوٹ کرتی تھی۔ بکسر کی فتح کے بعد لارڈ ویلزلی کے عہد میں ایسٹ انڈیا کمپنی گورکھپور روہیلکھنڈ جنوبی دوآبہ کے علاقوں پر قابض ہو گئی اور اس عہد میں کرناٹک کے نواب کو معزول اور ٹیپو سلطان کو شہید کر دینے کے بعد وہ تمام علاقے حاصل کر لیے گئے جو اب مدراس کے احاطہ میں شامل ہیں اور وہاں کے تمام خزانے لوٹ کر انگلستان میں پہنچا دیئے گئے (ان علاقوں کے حاصل کرنے میں جو بدنیتی اور بدعہدی کمپنی کی طرف سے عمل میں لائی گئی اس کی تفصیل اس جگہ خارج از مبحث ہے) یہ جابرانہ اور غیر آئینی طریقہ 1832ء تک برابر جاری رہا۔

کمپنی کا تیسرا دور تسلط بذریعہ پوست یعنی خوش معاملگی کا دکھلاوا

از 1833ء تا 1901ء

اس کے بعد تیسرا دور شروع ہوتا ہے جس کو سرولیم ڈگبی تسلط بذریعہ پوست (یعنی خوش معاملگی کا دکھلاوا اور زور کے ساتھ ہندوستانی قوم کو ادنیٰ حالت میں لازمی طور پر قائم رکھنا) بتلاتا ہے یہ دور 1833ء سے آخر تک قائم رہا۔ یہ دور آئینی دور کہلاتا ہے اس دور میں مطیع اور فرماں بردار رعایا کے لوٹنے اور زائد سے زائد کھسوٹنے کے نئے نئے قوانین طرح طرح کے بنائے گئے ہیں جن میں ہندوستانیوں کو کوئی دخل نہیں ہوتا تھا اور انگریز اپنے مقاصد و اغراض کے ماتحت اپنی آہنی قوت اور مضبوط شکنجہ کے بل بوتے پر گھمنڈ کر کے بغیر رحمت اور عدل و انصاف کے قانون چاہتے تھے بناتے تھے اور خوشنما الفاظ میں شائع کرتے رہتے تھے۔ محکوم رعایا ہند کی خواہشوں اور ضرورتوں کا کوئی لحاظ نہیں ہوتا تھا بلکہ ان سے زیادہ دولت چوستے رہنا اور ان کو دائمی غلامی میں جکڑ بند رکھنا انگریز کا مطمع نظر ہوتا تھا۔ چوں کہ تاج برطانیہ پر کمپنی کی دو رخی پالیسی تاجرانہ اور ملوکانہ کی شکایتیں بہت زیادہ ظاہر کی گئی تھیں اور کہا گیا تھا کہ تاجرانہ ہوس اور طمع زر کشی میں کمپنی کے ارکان اس قدر بدمست ہیں کہ ان کو ذرہ برابر بھی رعایا کی بہبودی اور زندگی کی پرواہ نہیں ہے۔ تاجرانہ ہوس اور حصول منفعت کے لیے انہوں نے حکومت کو ذریعہ بنا لیا ہے جس کی وجہ سے تمام ملک برباد ہوتے ہوتے آخری رمق پر پہنچ گیا ہے۔ بادشاہت کے جذبہ

رعایا پروری ان میں ذرا بھی موجود نہیں ہے اس وجہ سے تاج برطانیہ نے کمپنی کو 1832ء سے تجارتی حیثیت سے نکال دیا اور حکم دیا کہ وہ صرف ملک گیری اور حکومت کے فرائض انجام دے اور علاوہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے دوسرے انگریز اور ان کی کمپنیاں آزادی سے تجارتی خواہشات پوری کریں۔ اس میں اگرچہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے اراکین کی چیرہ دستی ہندوستانیوں پر کچھ کم ہو گئی مگر اس کے ملازموں کے بجائے دوسرے انگریز تاجروں اور ان کی کمپنیوں کی چیرہ دستی پہلے سے زیادہ قائم ہو گئی ادھر ایسٹ انڈیا کمپنی کی چونکہ تجارتی آمدنی کم ہو گئی اس لیے اس کے کارکنوں نے نئے نئے طریقے لوٹ کھسوٹ کے برتنے شروع کر دیے اور ہوس ملک گیری کی سازشیں روز افزوں ہونے لگیں۔ ہندوستانی راجاؤں کا ہمیشہ سے دستور تھا کہ اگر کوئی راجہ لاولد ہوتا تھا تو وہ اپنے خاندانی یا غیر خاندانی بچے کو اپنا متبنیٰ قرار دیتا تھا اور وہ ریاست کا بعد میں حقیقی بیٹے کی طرح مالک قرار دیا جاتا تھا۔ اس طرح کی متعدد ریاستیں ہندوستان میں موجود تھیں۔ ہندوستانی بادشاہ اور رجواڑے اور خود کمپنی کے آفیسر ہمیشہ سے اس کو تسلیم کرتے چلے آتے تھے مگر ہوس ملک میں کمپنی نے یکبارگی اس طریقہ کو ناجائز قرار دے کر غیر معتبر ہونے کا اعلان کر دیا اور تقریباً پندرہ ریاستیں اپنے قبضہ میں کر لیں۔ اسی طرح بلاوجہ صوبہ سندھ صوبہ اودھ، صوبہ پنجاب وغیرہ کو یکے بعد دیگرے اپنے قبضہ میں لے آئے۔ الحاصل اس زمانہ میں ایسے ایسے طریقے عمل میں لائے جانے لگے کہ جن پر ملمع تو بہت خوبصورت ہوتا تھا اور لوٹ کھسوٹ پہلے سے زیادہ ہوتی تھی اور ساتھ ساتھ بسا اوقات بغیر ملمع کے بھی دوسرے دور کی یادگاریں قائم کی جاتی تھیں۔ اسی دور کے متعلق سر ولیم ڈگبی پر اسپرس برٹش انڈیا میں لکھتا ہے۔

> “مگر اس میں شبہ نہیں کہ آج ہندوستان اس سے زیادہ شرمناک طور پر لوٹا جا رہا ہے جتنا کہ اس سے پہلے کبھی لوٹا گیا تھا۔ ہماری ابتدائی حکومت کی باریک چابک اب آہنی زنجیر بن گئی ہے۔ کلایو اور ہسٹنگز کی لوٹ اس نکاس کے مقابلہ میں ہیچ ہے جو روز افزوں ترقی کے ساتھ ایک ملک دوسرے ملک کا خون جان بہا کر مالا مال کر رہا ہے۔(24)”

منٹگمری مارٹن 1838ء میں لکھتا ہے۔

> اگر دولت کا ایسا مسلسل اور روز افزوں سیلان انگلستان سے ہونے لگے تو ایک دن وہ بھی محتاج ہو جائے۔ پھر خیال فرمایئے کہ ہندوستان پر کتنا

سخت اثر ہونا چاہیے جہاں معمولی مزدور کو دو یا تین پنس روزانہ اجرت ملتی ہے۔ (25)"

سر جان سلیور نے جو کہ مدراس کے بورڈ آف ریونیو کا صدر رہا تھا لکھا ہے۔

> "ہمارا طرز حکومت اسپنج سے بہت مشابہت رکھتا ہے وہ گنگا کے دہارے سے تمام نعمتیں چوس لیتا ہے اور ٹیمز کے کنارے نچوڑ دیتا ہے۔ (26)"

سر جان شور (جس کا تعلق بنگال سول سروس سے تھا اور بعد میں وائسرائے بھی ہو گیا تھا) 1833ء کے قانون کے متعلق 1837ء میں بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

> "برطانیہ نے جو طرز حکومت قائم کیا ہے اس کے تحت ملک اور باشندگان ملک رفتہ رفتہ محتاج ہوتے جاتے ہیں اور یہی سبب ہے کہ ان (پرانے تاجروں) پر جلد تباہی آ گئی۔ انگریزی حکومت کی پیس ڈالنے والی زیادہ ستانی نے ملک اور اہل ملک کو اتنا مفلس کر دیا ہے کہ اس کی نظیر ملنا مشکل ہے انگریزوں کا بنیادی اصول یہ رہا ہے کہ ہر صورت سے تمام ہندوستانی قوم کو اپنی اغراض کا غلام بنا لیا جائے۔ ان پر محصولات اتنے لگا دیئے ہیں کہ ان پر اضافہ کی گنجائش نہیں چھوڑی ہے یکے بعد دیگرے جو صوبہ ہمارے تصرف میں آیا ہے اس کو مزید وصولیابی کا میدان بنا لیا گیا ہے اور ہم نے اس بات پر ہمیشہ فخر کیا ہے کہ دیسی والیان ملک جتنا وصول کرتے تھے اس سے ہماری آمدنی کس قدر زیادہ ہے۔ ہر وہ عہدہ عزت اور منصب جس کو قبول کرنے کے لیے ادنیٰ سے ادنیٰ انگریز کو آمادہ کیا جا سکتا ہے ہندو کے لیے بند کر دیا گیا ہے مختصر یہ کہ ہندوستان میں جتنی انتہائی سخت اور جابر حکومتیں گزری ہیں ان میں ایک برطانوی حکومت ہے جس کے دور میں حکومت اور ذی ثروت افراد بشرطیکہ وہ بے اندازہ دولت رکھتے ہوں۔ دونوں انصاف کا خون کر سکتے ہیں اور کر چکے ہیں جس کے عہد میں ظلم کی داد رسی تقریباً ایک ناممکن چیز ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ رعایا ہم سے نفرت کرتی ہے اور ہر طاقت کا خیر مقدم کرنے اور اس کے پرچم کے نیچے جمع ہونے کے لیے تیار ہے بشرطیکہ اس میں قدرت ہو کہ ہمیں تباہ کر سکے۔ (27)"

مسٹر اے، جی ولسن اپنے ایک آرٹیکل میں جو کہ 1882ء میں فورٹ نائٹ لی ریویو میں شائع ہوا تھا لکھتے ہیں۔

> "اس بدقسمت ملک (ہندوستان) سے ہر سال پورے تین کروڑ پونڈ (پینتالیس کروڑ روپیہ) ہم مختلف طریقوں سے کھینچ لیتے ہیں۔ وہاں کے باشندے کی اوسط کمائی پانچ پونڈ سالانہ ہے بلکہ بعض جگہ اس سے بھی کم ہے مگر زیادہ کہیں نہ ہو گی۔ اس حساب سے ساٹھ لاکھ سے زیادہ کمانے والوں کی آمدنی ہمارے خراج میں چلی آتی ہے۔ گویا متعلقین کو شامل کرنے کے بعد تین کروڑ انسانوں کی وجہ کفاف (روز مرہ معاش) ہم لے لیتے ہیں جس کے یہ معنی ہیں کہ ہندوستان کے کل سرمایہ معاش کا دسواں حصہ ہر سال ہمارے پاس کھنچ آتا ہے۔ (28)"

مذکورہ بالا اندازہ اس دولت کا جو کہ ہر سال ہندوستان سے کھینچ کر انگلستان پہنچتی رہتی تھی۔ 1882ء کا ہے مگر اس میں ہر سال اضافہ ہی ہوتا رہتا تھا۔ اگرچہ ہندوستان کی حالت روز بروز گرتی جاتی تھی مگر بے رحم اور سنگ دل برطانیہ کی وحشیانہ بھوک روپیوں کی ہمیشہ بڑھتی رہی اس لیے ہندوستانی خراج بھی ہمیشہ بڑھتا رہا۔ مسٹر ہنڈومن (مشہور حسابدان انگلستان) 1906ء میں اس مقدار کا تخمینہ چالیس ملین پونڈ سالانہ کرتا ہے۔ یعنی ساٹھ کروڑ روپیہ سالانہ (29)

چونکہ ایک ملین دس لاکھ کا ہوتا ہے اس لیے یہ مقدار چھ ارب آٹھ کروڑ پونڈ ہو گئی چونکہ اس زمانہ میں پونڈ کا بھاؤ پندرہ روپیہ تھا اس لیے 1900ء تک آئینی طریقہ پر ہندوستان سے نکلنے والی دولت کی مقدار اکیانوے ارب بیس کروڑ روپیہ ہوئی یعنی 1912000,00,000 روپے۔

اور ابتدائی 1901ء سے 1946ء تک مسٹر ہنڈومن کے تخمینہ کے مطابق ایک ارب چوراسی کروڑ پونڈ ہوتی ہے جس کے روپے ستائیں ارب ساٹھ کروڑ ہوتے ہیں 127,60,00,00,000 ارب روپے۔ لہذا 1832ء سے 1945ء تک آئینی طریقہ پر نکلنے والی دولت کا اندازہ 118800,00,00,00 ایک کھرب اٹھارہ ارب اسی کروڑ روپیہ ہے۔

مگر امریکہ میں تقریر کرتے ہوئے 1833ء میں وٹھل بھائی پٹیل سابق پریزیڈنٹ آل انڈیا اسمبلی نے بتلایا تھا کہ "بنک آف انگلینڈ میں ہندوستان کا تیس ارب پونڈ جا چکا

ہے(یہ مطالبہ معہ اس کے سود کے برطانیہ کو ادا کرنا چاہیے) ہندوستان انگلستان کے ذمہ واجب الاداء قرضہ پر چار کروڑ پونڈ سالانہ سود کا مطالبہ کرتا ہے۔

وٹھل بھائی پٹیل کے ذکر کردہ اعداد کے حساب سے انگلستان پہنچنے والے روپیوں کی مقدار چار سو پچاس ارب روپیہ ہوتی ہے۔ جو کہ بنک آف انگلینڈ میں 1933ء تک پہنچے۔ یعنی چار کھرب پچاس ارب روپیہ۔

یہ مقدار اس سرسری اندازہ کے روپیوں کی ہے جو انگلستان بنکوں میں آئینی اور غیر آئینی طریقوں سے 1933ء تک پہنچے تھے اور مذکورہ بالا مقدار یعنی ایک سو اٹھارہ ارب اسی کروڑ کی مقدار اسی آئینی طریقوں سے پہنچنے والے روپیوں کی ہے جس کو سر ولیم ڈگبی اور مسٹر ہنڈوسن نے 1832ء سے لے کر 1945ء تک کی ذکر کی ہے مگر وہ مقدار جو کہ غیر آئینی طریقہ پر مختلف طریقوں سے لوٹ کھسوٹ کرکے دور ثانی یعنی 1775ء سے 1832ء تک اور تجارتی طریقوں سے 1607ء سے 1757ء تک دور اول میں گئی ہے اس سے خارج ہے جس کا اندازہ کرنا سخت مشکل ہے البتہ مسٹر بروکس ایڈمسن نے اس کے اس حصہ کی مقدار جو کہ واٹر لو اور پلاسی کی جنگ وغیرہ کے زمانہ میں حاصل کی گئی تھی مجمل طریقہ پر یہ بتلائی تھی کہ وہ کروڑوں اشرفیاں ہوں گی۔ اور کہا تھا کہ اس عہد میں یورپ والوں کے پاس سونے چاندی کی مقدار جتنی تھی نسبتاً ہندوستان سے جانے والی دولت کی مقدار زیادہ تھی۔ اس سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح انگریزوں نے ہندوستان کے سونے اور چاندی کے سمندر کو خشک کیا ہے۔

مذکورہ بالا طریقوں میں ایک عجیب و غریب طریقہ زر کشی اور لوٹ کا یہ جاری کیا گیا کہ 1760ء سے ہندوستان کے قومی قرضہ کی مد قائم کی گئی۔ ابتداء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے تجارت کے لیے اپنی قوم سے کچھ قرضہ لیا تھا (جس کی مقدار آئندہ اعداد و شمار میں آئے گی) اور جو برابر بڑھتا گیا۔ بقول لالہ لاجپت رائے انگریزوں نے ہندوستانیوں کو قبضہ میں کیا ہے تو اس میں لطف یہ ہے کہ روز اول سے آخر دم تک برطانیہ کی گرہ سے ایک کوڑی بھی خرچ نہیں ہوئی اور ہندوستانیوں ہی کے مال اور انہیں کے خون سے ملک قبضہ میں لے لیا گیا۔ اسی پر بس نہیں کی گئی' ملک گیری تجارت کی توسیع علمی تحقیقات غرض کہ ہر قسم کے مصارف جو انگریزوں کو ایشیاء بھر میں کہیں اٹھانا پڑے ہندوستان کے خزانے سے ہی پورے کیئے گئے۔ ان کے منافع ہمیشہ انگریزوں کی جیب میں جاتے رہے اور خرچہ یا

خسارہ ہوتا تھا تو ہندوستان کے سر مڑھا جاتا تھا۔

مسٹر آر سی۔ دت کہتے ہیں۔

> "ہندوستان کا سارا قومی قرضہ جو کمپنی کے صد سالہ عہد میں بڑھا وہ صرف اس وجہ سے کہ جو مصارف انگلستان میں ہوتے تھے ان کا بار ہندوستان پر ڈالا جاتا تھا۔"

ہندوستان کے قومی قرضہ کی یہ نوعیت معلوم کرنے کے بعد دیکھنا چاہیے کہ اس میں سال بسال کیا اضافہ ہوتا رہا۔ ذیل کے اعداد "ان پیپی انڈیا" سے ماخوذ ہیں۔

1792ء	70 لاکھ پونڈ	1846-45	4 کروڑ 35 لاکھ
1799ء	ایک کروڑ پونڈ	1851-50	5 کروڑ 50 لاکھ
1805ء	دو کروڑ دس لاکھ	1857ء	6 کروڑ 50 لاکھ
1829ء	3 کروڑ	1858ء	6 کروڑ 95 لاکھ
1836ء	3 کروڑ تیس لاکھ	1860ء	10 کروڑ
		1913-14ء	تیس کروڑ ستر لاکھ

ذیل کے اعداد انڈین ایربک سے لیے گئے۔

1924ء اڑتالیس کروڑ اٹھاون لاکھ چالیس ہزار
1925ء اکیاون کروڑ سترہ لاکھ اسی ہزار (31)
1928ء میں ہندوستان کا غیر ملکی قرضہ ایک ارب پونڈ ہو گیا۔
یعنی پندرہ ارب روپیہ (32)"

اس قرضہ پر ہندوستان کو ہر سال (80) کروڑ روپیہ سود کے طور پر ادا کرنا پڑتا ہے۔ اس کے ساتھ (40) کروڑ روپیہ وہ ہے جو ہندوستان کو وزیر ہند کی وساطت سے ادا کرنا پڑتا ہے اگر اس میں سے سترہ کروڑ نکال دیئے جائیں جو سرکاری قرضوں کے طور پر دئے جاتے ہیں اس لیے کہ یہ رقم بھی ایک ارب پونڈ میں شمار ہو چکی ہے۔ تو بقیہ (23) کروڑ روپیہ باقی رہ جاتا ہے اس طرح کل سالانہ واجب الاداء رقوم ایک سو کروڑ روپیہ یا ایک ارب روپیہ بنتی ہے۔ (33)"

اس قرضہ کی ایک دوسری نوعیت نہایت پر لطف اور عجیب ہے وہ یہ کہ اپنے مقاصد ملعونہ کے لیے جو جنگ بھی ایشیا یا افریقہ وغیرہ میں کی جاتی ہے۔ یا توسیع مملکت کی غرض سے ہندوستانی ریاستوں اور صوبوں کو اپنے قبضہ میں لایا جاتا ہے۔ ان میں ہندوستانی سپاہی اور

رسد اور اسلحہ استعمال کئے جاتے ہیں۔ ہندوستانیوں کی جانیں ضائع ہوتی ہیں۔ غنیمت یعنی لوٹ اپنے قبضہ میں لائی جاتی ہے اور مصارف جنگ ہندوستان کے ذمہ رکھ کر انڈین نیشنل ڈیٹس کی مقدار میں شامل کر لیا جاتا ہے اور سب سے عجیب تر یہ ہے کہ 1857ء میں تاج برطانیہ ہندوستان کو کمپنی سے چار کروڑ ساٹھ لاکھ پونڈ پر خریدتا ہے اور وہ مقدار بھی ہندوستان ہی کے ذمہ اسی مقدار میں شامل کی جاتی ہے اور اس کا سود اور سود در سود ہندوستان سے ہی دلوایا جاتا ہے گویا کہ بکری خریدی گئی اور اس سے کہا گیا کہ تو ہی اپنی قیمت ادا کر۔

اسی میں مصارف جنگ نوابان بنگال و مرہٹہ و نیپال و افغانستان و جنگ ثانی کابل و سوڈان و مصر و تبت و چین و جنوبی افریقہ ٹرانسوال وغیرہ سب داخل ہیں۔

1832ء سے امید افزا شاہی اعلانات اور فصیح و بلیغ تقریروں کے ساتھ کمپنی کا خالص انتظامی دور شروع ہوا۔ مگر اسی کے ساتھ شجر ہند کے تنہ میں کمپنی کے قرضہ کا گھن مستقل طور پر لگا دیا گیا اور عملاً یہ قرار دیا گیا کہ یہ قرضہ کبھی ادا نہ ہو گا۔ واضح ہو کہ 1833ء میں انگلستان کے قانون کی رو سے انتہائی شرح سود پانچ فیصد تھی اور ہندوستان میں دام دوپٹ کا قانون رائج تھا جس کی رو سے دائن (قرض دینے والا) کو خواہ قرضہ پر سو برس کیوں نہ گزر جائیں اصل رقم قرضہ سے زیادہ سود نہ مل سکتا تھا۔ مگر سلطنت برطانیہ نے کمپنی کے تمام تجارتی سرمایہ کی کثیر رقم پر بر خلاف انگلستان اور ہندوستان کے رواج کے ساڑھے دس فیصد سود قرار دیا اور یہ طے کیا کہ چالیس سال یعنی 1874ء تک قرضہ ادا نہ کیا جائے بلکہ صرف سالانہ سود دیا جائے اور باوجود سال بسال سود دیتے رہنے کے 1874ء کے بعد سو فیصد زائد رقم دے کر قرضہ سے سبکدوشی حاصل کی جائے۔(34)"

"ظاہر ہے کہ ہر شخص ہر ریاست ' ہر سلطنت کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ قرضہ سے سبکدوشی حاصل کی جائے مگر کمپنی کا قرضہ وہ ہے جس کی ادائیگی عملاً ناممکنات سے ہے کتنے نیک خیال وائسرائے ایسے آئے ہیں جنہوں نے ملک کے اخراجات میں تخفیف کر کے بچت بڑھائی چنانچہ نیک دل وائسرائے سر ولیم بنٹنگ نے جن کے زمانہ میں کمپنی سے تجارتی حق لے لیا گیا۔ ملک میں بیشمار اصلاحات اور تحقیقات کیں جو کہ سب ہوم چارجز کی نذر ہوئیں مگر جس نسبت سے صاحب موصوف ہندوستان میں ہر دل عزیز بنے اسی نسبت سے انگلستان میں مطعون ہوئے۔(35)"

”ہندوستان میں 1857ء سے 1875ء تک مسلسل ایسے حکمراں رہے جو ہر طرح ملک کی ترقی میں ساعی رہے اور انہوں نے اپنے زمانہ میں کوئی ایسی لڑائی نہ لڑنے دی جس سے ہندوستان پر خرچہ کا بار پڑتا اسی کے ساتھ زرعی صنعتی اور تجارتی ترقی کے لیے انہوں نے دوامی بندوبست کئے اور ہندوستان کے مال پر محصول میں کمی اور انگلستان کے مال پر بیشی کرنے کی کوشش کی لیکن ایک بھی پیش نہ چلی اور باوجود ایسی صلح کے اور مصالحانہ پالیسی کے ان اٹھارہ سال میں ہندوستان کے قرضہ کا بار آٹھ کروڑ پونڈ سے بڑھ کر سوا تیرہ کروڑ پونڈ تک پہنچ گیا۔ (36)“

اسی زمانہ میں انگریزوں میں توسیع مملکت کا ولولہ (کوئن وکٹوریہ کے اعلان 1858ء کے خلاف) پیدا ہوا اور فارورڈ پالیسی (پیش قدمی) کی جدوجہد شروع ہوئی۔ لارڈ ناتھ بروک پر (جو کہ اس زمانہ میں وائسرائے ہند تھے) زور ڈالا گیا کہ وہ اس پالیسی پر عمل کریں۔ وہ اس کو ہندوستان کے لیے مضر سمجھتے تھے۔ بالاخر ان کو مجبور ہو کر 1876ء میں استعفیٰ دے کر انگلستان واپس ہونا پڑا۔ ان کی جگہ پر لارڈ لٹن کو مقرر کیا گیا۔ انہوں نے پیش قدمی کی تعمیل میں کابل کو مشن بھیجا اور کوئن وکٹوریہ کے اعلان مشہور کے توڑنے اور بدعہدی کے معاملہ کو عملدرآمد کرتے ہوئے کابل کی لڑائی عمل میں لائی گئی۔ جس پر دو کروڑ پونڈ صرف ہوا۔ اس میں انگلستان نے صرف پچاس لاکھ پونڈ دیا اور باقی ڈیڑھ کروڑ کا بار ہندوستان پر رکھا گیا جو کہ اس کے قومی قرضہ میں شمار کیا گیا۔

لارڈ سالسبری 1881ء میں جبکہ وہ وزیر ہند تھا لکھتا ہے۔

> ہندوستان سے اتنی کثیر رقم بھیج دی جاتی ہے اور اس کا نعم البدل کچھ نہیں دیا جاتا۔ یہ زخم بجائے خود کیا کم ہے لیکن ہندوستان کے بدن پر لگتا ہے تو اور زیادہ گہرا لگتا ہے۔ اگر خون ہی بہانا ہے تو چھری اس حصہ جسم میں بھونکنا چاہیے جہاں لہو بہت سا یا کافی جمع ہو۔ نہ کہ دیہاتی رگوں میں جو پہلے ہی سے خون کی قلت کی وجہ سے نحیف و ناتواں ہو رہے ہیں۔ اب وقت ہے کہ ہندوستان کے بدن سے یہ لہو بہنا رک جانا چاہیے۔ (37)

خلاصہ کلام یہ ہے کہ ہندوستان کے قرضہ اور سود اور سرمایہ کے سیلاب بجانب انگلستان کے اعداد و شمار اور اس کی تاریخ سے ظاہر ہے کہ وہ کس قدر خوفناک ہے۔ ان

حالات میں تعجب ہے کہ ہندوستان کے لوگ زندہ کس طرح ہیں۔ یقیناً ان احوال میں خوشحالی اور فارغ البالی (جس کی تفصیلات پہلے باب میں گزر چکی ہیں) جو کہ زمانہ قدیم میں اہل ہندوستان کی امتیازی شان تھی۔ بالکل معدوم ہوگئی اور ان کی زندگی نہایت گری ہوئی اور کشاکش بلکہ مردگی کی زندگی رہ گئی۔ سر چارلس ایلیٹ چیف کمشنر آسام 1888ء میں لکھتا ہے۔

> "میں بلا تأمل کہہ سکتا ہوں کہ کاشتکاروں کی نصف تعداد ایسی ہے جو سال بھر تک نہیں جانتی کہ ایک وقت پیٹ بھر کر کھانا کسے کہتے ہیں۔(38)"

مسٹر ارون ڈپٹی کمشنر رائے بریلی کہتے ہیں۔

کوئی شک نہیں کہ یہ لوگ (شہروں کے باشندے) خوراک کی قلت سے جو تکلیف اٹھاتے ہیں وہ اس سے کہیں زیادہ ہے جو کسانوں کو برداشت کرنا پڑتی ہے بالخصوص پردہ نشین مسلمان عورتیں اور مفلس شرفاء کو جن کا وقت بگڑ گیا ہے جو شرم سے بھیک تک نہیں مانگ سکتے اور جن کو بچی کھچی جائداد پر گزر کرنا پڑتی ہے نرخ کی گرانی بری طرح ستاتی ہے۔(39)

مسٹر اے برسل ممبر پارلیمنٹ ہندوستان کے سفر سے واپس ہو کر ہندوستان کے مزدور پیشہ لوگوں کے متعلق لکھتا ہے۔

> "یہ لوگ مکھیوں کی طرح مر رہے ہیں۔(40)"

ایک امریکن مشنری کا مقالہ لالہ لاجپت رائے نقل کرتے ہیں۔

> "جنوبی ہندوستان کے لوگ زندگی بسر نہیں کرتے بلکہ زندگی کے دن پورے کرتے ہیں۔ میں نے ایسے گھر دیکھے ہیں جہاں لوگ مردار گوشت کھا کھا کر رہتے ہیں اور اس زمانہ میں کوئی عام قحط بھی نہیں بتایا جاتا تھا۔(41)"

مسٹر ڈبلیو ایس بلنٹ کہتا ہے۔

"میں ہندوستانی مالیہ کے اسرار بہترین استادوں سے حاصل کر رہا ہوں اور یہ معلم گورنمنٹ کے سیکرٹری اور کمشنر وغیرہ ہیں۔ اس مطالعہ سے میں جس نتیجہ پر پہنچا ہوں وہ یہ ہے کہ اگر ہم اسی طرح ملک کو ترقی دیتے رہے تو ایک دن آئے گا کہ ہندوستانی مجبور

ہو کر ایک دوسرے کو کھانے لگیں گے۔ کیوں کہ اپنے ہم جنسوں کے سواء کوئی دوسری چیز ہی نہ مل سکے گی۔(42)“

مسٹر سیول میریٹ ممبر کونسل نے 1836ء میں لکھا تھا۔

> برطانیہ کا دور حکومت مہربان اور مقبول بتایا جاتا ہے مگر اس عہد میں ملک جس حالت کو پہنچ گیا ہے اگر اس کا مقابلہ دیسی حکمرانوں کے عہد سے کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ اس وقت لوگ خوشحال تھے۔ یہ ملک فلاکت کی انتہائی پستی تک پہنچ گیا ہے۔(43)“

مسٹر اے برسل ممبر پارلیمنٹ 1928ء میں لکھتا ہے۔

> (ہندوستان میں دورہ کرنے اور کئی مہینہ یہاں کی حالت اپنی آنکھ سے دیکھنے کے بعد) ہندوستان کی آبادی کا بہت بڑا حصہ ایسا ہے جسے اپنی پیدائش سے لے کر اپنی وفات تک کبھی پیٹ بھر کر کھانے کو نہیں ملتا۔ درانحالیکہ برطانیہ کو حکومت کرتے ہوئے سو برس سے زائد ہو چکے ہیں۔ لیکن جن علاقوں میں برطانوی تعلق بہت گہرا ہے اور گہرا رہا ہے۔ مثلاً صوبجات بمبئی و بنگال میں وہاں صفائی و حفظان صحت کا کوئی قابل ذکر انتظام موجود نہیں۔ چھپی ہوئی بغاوت سارے ملک میں موجود ہے۔
>
> 25 کروڑ سے زیادہ تعداد اس آبادی کی ہے جسے ساری عمر پیٹ بھر کر چاول بھی نہیں نصیب ہوتے۔(44)“

مسٹر سائمن اپنی رپورٹ میں لکھتا ہے۔

> (الف) عام آبادی انتہائی افلاس میں ہے۔
>
> (ب) سوشل خدمات مثلاً تعلیم، حفظان صحت، صفائی وغیرہ کا صرفہ مغربی معیار سے نہایت گرا ہوا ہے۔ اور بعض شعبوں میں تو بالکل صفر ہے۔(45)“

ایچ۔ ایم۔ ہنڈمن (مشہور ماہر اقتصادیات)

> ”ہندوستان روز بروز کمزور و ناتواں ہوتا جا رہا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ عوام کی زندگی کا خون آہستہ آہستہ مگر دن بدن تیز روی کے ساتھ نکلا جا رہا ہے۔“

(ایچ ہنڈ مینس بینک کراپٹ سی آف انڈیا از مالیات عامہ ڈاکٹر روڈر فورڈ (1927ء کے متعلق)

> "ہر جگہ زندگی کی کش مکش اندوہ ناک ہے۔"

یہی ڈاکٹر روڈر فورڈ (دیہاتیوں کی تکالیف بیان کرتا ہوا) کہتا ہے۔

> "میرے غم و افسوس کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ میں برطانوی باشندہ ہونے کی حیثیت سے ان کی جسمانی حالت کا ذمہ دار ہوں جس نے ان کو دھیمے مگر تکلیف دہ طریقہ پر موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ہم برطانوی باشندے ان کی اس حالت کے ذمہ دار ہیں جس نے تخفیف مالیہ اور اجراء نہر کی کوئی اسکیم جاری نہیں کی جس سے قحط کا سد باب ہوتا۔(46)"

مسٹر پیٹر فریمین (ممبر پارلیمنٹ و صدر کامن ویلتھ آف انڈیا لیگ) 1930ء میں کہتا ہے

> "برطانیہ عہد و پیمان کے ذریعہ ہندوستان کے بھلے کے لیے حکومت کرنے کا پابند ہے۔ لیکن کیا ہم نے اس عہد کی پابندی کی ہے میں نے اوپر جو واقعات و حقائق بیان کیئے ہیں وہ اس سوال کا جواب دیں گے۔ بعض اوقات کہا جاتا ہے کہ اگر ہندوستان کو ہوم رول مل گیا تو عوام جمہور پر مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑے گا۔ ایک سو برس کے برطانوی راج سے جو مصیبت ہندوستان پر نازل ہوئی ہے اس سے زیادہ مصیبت ناممکن ہے۔ جو قانون ساز مجلسیں ہم نے قائم کی ان میں عوام کی نمائندگی نہیں ہوتی اور ہم نے محصول کا بوجھ سب سے زیادہ غریبوں ہی کے دوش بے کسی پر رکھا ہے۔ سرکاری رپورٹ میں ہندوستان کے متعلق یہ الفاظ ہیں۔ "قحط ہندوستان کی فاقہ کشی کی منہ بولتی تصویر ہے۔" مسلسل فاقہ کرنے والوں کی تعداد چار کروڑ سے لے کر سات کروڑ تک ہے الخ(47)

مسٹر ڈبلیو۔ جی۔ پیڈر 1873ء میں کہتا ہے۔ موصوف صوبہ جات متوسط میں ملازم تھا)

> "ایک ایسی رائے جس پر ہر شخص متفق ہے اگر قابل اعتماد ہو سکتی ہے تو یہ صحیح ہے کہ اہل ہند ہماری زیر حکومت بد سے بدتر حالت کو پہنچے

جاتے ہیں۔ یہ اہم مسئلہ ہے جس پر حکومت کو توجہ کرنا ضروری ہے۔(48)"

افسوس کہ ہندوستان کی انتہائی بربادی اور فاقہ کشی اس قدر بدحالی پر پہنچ جانے کے بعد بھی برطانیہ کو رحم نہ آیا بلکہ اس کی درندگی اور لوٹ کھسوٹ کی گرم بازاری بڑھتی ہی رہی مندرجہ ذیل اعداد سے معلوم ہو گا کہ کس طرح ٹیکس کی زیادتی ہندوستانی عوام کے ضعیف و ناتواں کندھوں پر جاری رہی۔ ٹیکسوں کی تفصیلی بحساب فی کس۔

1871ء	میں فی کس	1 روپیہ 13 آنے	9 پائی
1881ء	=	2 روپیہ 2 آنے	11 پائی
1891ء	=	2 روپیہ 3 آنے	11 پائی
1901ء	=	2 روپیہ 10 آنے	2 پائی
1911ء	=	2 روپیہ 13 آنے	11 پائی
1913ء	=	3 روپیہ 1 آنہ	9 پائی
1920ء	=	5 روپیہ 11 آنے	
1922ء	=	6 روپیہ 7 آنے	
نومبر 1923ء	=	7 روپیہ	

(49)

باوجودیکہ ہندوستان 1871ء سے پہلے فلاکت کی انتہائی پستی کو بقول سول میریٹ اور سر جان شور وغیرہ پہنچ چکا تھا مگر سنگدل انگریزوں کے لالچ کی آگ بھڑکتی ہی رہی اور دولت حاصل کرنے کی بھوک ہمیشہ روز افزوں ہوتی رہی حتیٰ کہ پہلی جنگ عمومی کے بعد تو تحصیل دولت کی جدوجہد بہت ہی زیادہ بڑھ گئی جس سے ہندوستانیوں کی بربادی اور ذلت بے حد اور بے نہایت ہو گئی۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

انگریزوں کے ہاتھوں ہندوستان کی زرعی بربادی

زراعت کے متعلق بھی انگریزوں کی پالیسی نہایت اندوہناک اور دلخراش ہے۔ انگریزوں سے پہلے کاشتکاروں سے مالگزاری چوتھ کی صورت میں وصول کی جاتی تھی۔ کھیت میں غلہ تیار ہونے پر حکومت کے افسر کن (غلہ) کو تولا کرتے تھے اور پیداوار کے تخمینہ پر چوتھائی حکومت کے لیے درج رجسٹر کیا جاتا تھا۔ غلہ حاصل ہونے پر حسب رجسٹر کاشتکار چوتھائی غلہ یا اس کی قیمت حکومت کو دیتا تھا۔ اس طرح اگر پیداوار اچھی ہوتی تھی تو حکومت اور کاشتکار اور زمیندار سب کو نفع ہوتا تھا اور اگر نہیں ہوتی تھی یا کم ہوتی تھی تو سب کو نقصان رہتا تھا۔ اور حکومت کاشتکار کے نفع اور نقصان میں یکساں طریقہ پر شریک رہتی تھی۔ مگر انگریزوں نے قبضہ پاتے ہی پختہ لگان کر دیا۔ اور زمینوں پر نقد معین کر دیا۔ خواہ زمین میں پیداوار ہو یا نہ ہو۔ غلہ خواہ عمدہ قسم کا ہو یا خراب قسم کا ہر حالت میں حکومت اپنی مقرر کردہ مقدار وصول کرنے لگی خواہ کاشتکار کے یہاں کچھ بھی پیدا نہ ہوا ہو۔ عدم وصولیابی پر کاشتکار کی قرقی کر لی جاتی تھی اس کے گھر کا سامان' عورتوں کے زیورات اس کی زراعت کے وسائل بیل' ہل وغیرہ نیلام کر دیے جاتے تھے جس کی بناء پر عام زراعت پیشہ انتہائی فلاکت میں مبتلا ہو گئے۔ لگان پر زیادتی برابر جاری رہی۔ مسٹر جی ہر بارڈی موسس لیبر پارٹی اپنی کتاب انڈیا میں جو کہ 1909ء میں ہندوستان میں شائع ہوئی لکھتا ہے۔"

> "عام طور پر دعویٰ کیا جاتا ہے کہ برطانوی حکومت کے ماتحت ہندوستان کے کسانوں کو اس سے بہت کم لگان ادا کرنا پڑتا ہے جو سلطنت مغلیہ اور دوسرے بادشاہوں کے زمانہ میں ادا کرنا پڑتا تھا اس دعویٰ کی تردید و تغلیط کئی طرح کی جا سکتی ہے لیکن اس مقام پر صرف چند اعداد و شمار پیش کئے جاتے ہیں تاکہ دروغ گوئی اور غلط بیانی کا اندازہ ہو جائے۔
>
> 1817ء میں بمبئی برطانیہ کے زیر حکومت آیا۔ اس وقت حالت یہ تھی کہ اس کے حکمرانوں کی طرف سے صوبہ کے تمام کاشتکاروں سے لگان میں صرف اسی لاکھ کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ اسی زمانہ میں لگان وصول

کرنے کا طریقہ یہ تھا کہ کسان سے اس کی پیداوار کا خواہ پیداوار اچھی ہو یا بری چوتھائی یعنی چہارم لیا جاتا تھا۔ اس طرح اگر فصل اچھی ہوتی تھی تو حکومت کو کاشتکاروں کے ساتھ فائدہ ہوتا تھا اور خشک سالی کے زمانہ میں جتنا کاشتکاروں کو نقصان ہوتا تھا اسی تناسب سے حکومت کو بھی نقصان اٹھانا پڑتا تھا لیکن اب صورت برعکس ہے۔ اور کاشتکار سے سالانہ ایک مقررہ رقم وصول کرلی جاتی ہے اور اس کا کوئی لحاظ نہیں رکھا جاتا کہ فصل خراب ہوئی ہے یا اچھی اور خرابی پیداوار کے باعث کاشتکار اس قابل بھی ہے کہ وہ لگان ادا کرسکے یا نہیں۔

1817ء کے بعد سے جبری لگان کا طریقہ اختیار کیا گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ 1823ء میں لگان کی تعداد بڑھ کر ایک کروڑ پچاس لاکھ ہوگئی۔ حتیٰ کہ 1875ء میں لگان کی مجموعی رقم چار کروڑ اسی لاکھ ہوگئی۔ ہندوستان میں ٹیکسوں کا 80 فیصد زمینوں کے لگان سے وصول کیا جاتا ہے۔ گورنمنٹ متواتر زمیندار طبقے کو نظرانداز کر رہی ہے جو گورنمنٹ اور کاشتکار کے درمیان ایک واسطہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ کاشتکار سے اس کی پیداوار کا 50 فیصد سے لے کر 65 فیصد تک حکومت وصول کرلیتی ہے۔ اس کے علاوہ اسے دوسرے ٹیکس بھی ادا کرنے پڑتے ہیں اس طرح تمام ٹیکسوں میں اسے اپنی پیداوار کا تقریباً 75 فیصد دینا پڑتا ہے۔ ہندوستان میں کاشتکاروں پر اس قدر بار پڑا ہوا ہے جس کا اندازہ دوسرے لوگ مشکل سے کرسکتے ہیں۔ اگر گھر کی آمدنی پر 5 فیصد ٹیکس لگا دیا جاتا ہے۔ تو ٹیکس دہندہ چیخ اٹھتا ہے اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ہندوستان کی حالت کس قدر ردی اور ناگفتہ بہ ہوگی جہاں پیداوار پر 5 فیصد نہیں بلکہ 75 فیصد ٹیکس لیا جاتا ہے۔ حکومت آئے دن شرح لگان پر نظرثانی کرتی رہتی ہے تاکہ ان کسانوں سے جو پہلے ہی بھاری بھاری ٹیکسوں کے بوجھ کے نیچے دبے ہوئے ہیں اگر ممکن ہو سکے تو ان کے جیب کی آخری پائی بھی حاصل کرلی جائے۔ تیس فیصد لگان تو عموماً بڑھا دیا جاتا ہے۔ حالانکہ ہمارے پیش نظر ایسی مثالیں موجود ہیں جہاں 50

فیصد 70 فیصد اور 100 فیصد لگان میں اضافہ کیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستانی ہمیشہ افلاس و نکبت کی ہولناک مصیبتوں میں مبتلا رہتے ہیں۔(50)

صوبہ بنگال کا لگان نواب بنگال کے آخری عہد یعنی 1764ء میں اکیاسی لاکھ پچھتر ہزار پانچ سو بیس روپیہ تھا مگر اضافہ کرتے کرتے ایسٹ انڈیا کمپنی نے 1794ء میں دو کروڑ اڑسٹھ لاکھ وصول کیا۔(51)

اسی طرح ہر صوبہ میں اضافہ ہوتا رہا۔ چنانچہ حسب ذیل تفصیل قابل ملاحظہ ہے۔ یہ تفصیل پورے ہندوستان کی ہے۔

1856ء	سترہ کروڑ تیس لاکھ روپیہ
1870ء	انیس کروڑ چھیانوے لاکھ روپیہ
1880ء	اکیس کروڑ اکیانوے لاکھ روپیہ
1890ء	چوبیس کروڑ پانچ لاکھ روپیہ
1900ء	چھبیس کروڑ پچیس لاکھ روپیہ
1914ء	اکتیس کروڑ پچیس لاکھ روپیہ

یہ اضافہ معیادی بندوبست کے حلقوں میں ہوتا رہا۔ دوامی بندوبست کے حلقے حسب معاہدہ لارڈ کارنوالس اضافہ سے محفوظ رہے۔(52)

انگریزوں نے دیوانی کے اختیارات شہنشاہ دہلی سے حاصل کرتے ہی نہایت ظالمانہ حیثیت سے گرانبار اضافہ لگان میں جاری کر دیا تھا اور باوجودیکہ مختلف وجوہ سے لوگ قحط اور افلاس میں مبتلا ہو کر مر رہے تھے مگر سنگدل انگریزوں کو رحم نہیں آتا تھا اور دولت و مال کی ہوس میں لگان کا اضافہ غریب کسانوں پر لگاتار جاری کر رہے تھے۔ مسٹر آر۔ سی۔ دت لکھتا ہے۔

> "ہندوؤں اور مغلوں کی حکومت میں جس حساب سے لگان لیا جاتا تھا اس سے بہت زیادہ باوجود افلاس بڑھ جانے کے اب وصول کیا جاتا ہے 1793ء سے 1882ء تک سرکار نے بنگال کے زمینداروں سے نوے فیصد اور شمالی ہند میں اسی فیصد لگان وصول کیا۔ بنگال کے آخری نواب نے اپنی حکومت کے آخری سال 1764ء میں (8175520) لاکھ

> روپیہ وصول کئے تھے لیکن بنگال ‘بہار’ اڑیسہ کی سلطنت حاصل کرتے ہی ایسٹ انڈیا کمپنی نے 1794ء میں لگان کی رقم 2,68,00,000 روپیہ کر دی 1802 میں ممالک متحدہ آگرہ واودھ کے بعض اضلاع انگریزی عملداری میں شامل ہوئے جن کا مالیہ نوابوں کے عہد میں 1,35,13,470 کروڑ روپیہ مقرر تھا مگر اس میں سے کس قدر معاف کر دیا جاتا تھا اور کس قدر رقم وصول کی جاتی تھی اس کا ٹھیک پتہ نہیں مل سکتا اب انگریزی عملداری ہونے میں تین ہی سال میں ان اضلاع کی (1,68,23,090) کروڑ روپیہ سالانہ آمدنی بنا لی گئی- پہلے پہل جب مہاراشٹر کا تاج انگریزوں کے ہاتھ آیا اس وقت وہاں کا مالیہ اسی لاکھ مقرر تھا مگر تھوڑے ہی سالوں میں انگریز اس علاقہ سے ایک کروڑ پچاس لاکھ روپیہ وصول کرنے لگے- اس وقت سے لے کر برابر زمین کا مالیہ بڑھ رہا ہے-"(53)

ڈائرکٹرز ایسٹ انڈیا کمپنی 12 فروری 1717ء میں ایک خط میں لکھتے ہیں-

باوجودیکہ سابقہ قحط بہت ہولناک تھا اور اس سے بے شمار موتیں ہوئیں مگر پھر بھی اس سال کے واسطے نئے بندوبست میں بنگال اور بہار کا لگان بڑھا دیا گیا-

پھر 10 جنوری 1772ء میں انہوں نے لکھا:

> ریونیو (مال) کے ہر ایک محکمہ میں وصولی اس طرح کامیابی کے ساتھ کی جارہی ہے جیسی کہ ہماری خواہش تھی-

وارن ہسٹنگز لکھتا ہے-

> اس صوبہ میں ایک تہائی آبادی کے بھوک سے مر جانے اور کھیتی میں بہت کمی واقع ہو جانے کے باوجود بھی 1771ء میں لگان کی رقم 1768ء کے لگان کی رقم سے بہت بڑھ گئی ہے-(54)

مسٹر ولیم وڈربرن نے 1897ء میں ہاؤس آف کامنس (دارالعوام) میں تقریر کرتے ہوئے مندرجہ ذیل الفاظ کہے-

> "ہندوستانی رعایا کی تباہ حالی اور مفلسی کے تین خاص وجوہ ہیں-
>
> اول مالگزاری کی زیادتی- اگرچہ گورنمنٹ برطانیہ کے احکام یہ تھے

> کہ مالگزاری ایسی نہ ہونی چاہیے کہ اس میں زمین کا کل منافع آ جائے بلکہ اس طرح مقرر کی جانی چاہیے کہ کاشتکار کو اس کی محنت کا معاوضہ اور جو سرمایہ اس نے کاشت میں لگا رکھا ہے اس کا سود اور منافع خالص کا نصف حصہ اس کے پاس بچ سکے۔ لیکن یہ بات خود ہندوستان کے حکام تسلیم کر چکے ہیں کہ ان ہدایات پر ہندوستان میں کبھی عملدرآمد نہیں ہوا یہاں مال گزاری اس قدر زیادہ ہوتی ہے کہ وہ سرمایہ کے سود اور کاشتکار کی مزدوری کے حصہ کو ہضم کرلیتی ہے اور باوجود یہ امر تسلیم کر لینے کے کہ مال گزاری اس طرح بڑھائی جاتی ہے کہ بعض مواضعات میں تو سو فیصد اور بعض خصوصی آراضیات پر ہزار فیصد تک پہنچ جاتی ہے۔
>
> دوسرا خاص سبب رعایا کی تباہی کا یہ ہے کہ وصولی لگان و مال گزاری کا طریقہ نہایت سخت ہے جس کی رو سے ایک مقررہ سالانہ رقم وقت معینہ پر وصول کی جاتی ہے اور خراب فصلوں میں جو نقصان ہوتا ہے اس کا بوجھ کاشتکار پر ڈالا جاتا ہے۔ یہ بوجھ ایسا ہے کہ کاشتکار اس کو برداشت نہیں کر سکتا اور اس کو سودی قرضہ لینا پڑتا ہے۔
>
> اور تیسرا سبب یہ ہے کہ یورپ کے نمونہ پر قرضہ وصول کرنے کے لیے عدالتیں قائم کر دی گئی ہیں جن کی وجہ سے قرض خواہ کی پشت پناہی پر تمام سلطنت کی قوت ہوتی ہے اور اس کو اس قابل بنا دیتی ہے کہ وہ رعایا کو غلامی کے ادنیٰ درجہ تک پہنچا دے)

یہ چند شہادتیں بطور اختصار ہم نے پیش کی ہیں جن سے صاف اور واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ سنگدل اور خود غرض برطانویوں نے کس طرح ہندوستان کے غریب کاشتکاروں کو بے رحمی سے برباد کیا ہے اور کاشتکاری کو بھی فنا کے گھاٹ اتار دیا۔ لگان کے ثقیل بوجھ اور وصولی کے انتہائی جابرانہ طریقہ کی وجہ سے کسان ہر سال زمین جوتنے پر مجبور تھا زمین کو لگاتار بوتا تھا اور اپنی گلو خلاصی کی فکر کرتا تھا جس کی وجہ سے ہندوستان کی زمین انتہائی درجہ میں کمزور ہو گئی اور پیداوار میں نہایت زیادہ کمی ہو گئی۔ پیداوار کا اوسط فی ایکڑ زمین باعتبار دیگر ممالک حسب ذیل ہے۔

چاول کی پیداوار فی ایکٹر زمین		رقبہ کاشت
ہسپانیہ	62,9	6963 ہزار ایکڑ
اطالیہ	43,0	1,37,500 لاکھ ایکڑ
ہندوستان	14.9	3,26,07,091 کروڑ ایکڑ

گندم کی پیداوار فی ایکٹر زمین

بلجیم	فی ایکڑ	26من
برطانیہ	〃	22 من
ہندوستان	〃	8 من

ناظرین خیال فرمائیں 'وہ ہندوستان جو کہ بقول تھارن ٹن' مریڈتھ ٹاونسنڈ لارڈ کلایو وغیرہ اپنی پیداوار اور زراعت میں تمام دنیا میں نہایت مشہور تھا جس کی شہادت آئین اکبری کے صفحات بھی دیتے ہیں انگریزی عہد میں تمام دنیا سے کس قدر گر گیا۔

انگریزوں کا ملعون اقتدار اور منحوس زمانہ آیا اور حالت پلٹنی شروع ہوئی اور بجائے ارزانی کے گرانی اور بجائے کثرت قلت اور بجائے آسودگی فرسودگی ظاہر ہونے لگی۔ انگریزی اقتدار سے پہلے اناج منوں کے حساب سے فروخت ہوتا تھا اگر اس کے بعد کم ہوتے ہوتے سیروں اور چھٹانکوں تک نوبت پہنچ گئی۔ عام آبادی قحط اور گرانی کی وجہ سے لاکھوں بلکہ کروڑوں کی تعداد میں موت کے گھاٹ اترنے لگی۔ چنانچہ خاص کلکتہ میں جو انگریزی اقتدار کا مرکز بن گیا تھا حسب ذیل مہنگائی بڑھتی رہی۔

سنہ	فی روپیہ	چاول	گندم	سرسوں کا تیل
1738ء	〃	30 سیر دو من	20 سیر دو من	12 سیر
1750ء	〃	10 سیر دو من	10 سیر دو من	10 سیر
1758ء	〃	30 سیر ا من	35 سیر ا من	ساڑھے آٹھ سیر
1782ء	〃	5 سیر ا من	5 سیر ا من	7 سیر
1825ء	〃	30 سیر	32 سیر	6 سیر
1858ء	〃	15 سیر	18 سیر	5 سیر
1880ء	〃	12 سیر	11 سیر	ساڑھے چار سیر

(55)

جس طرح کلکتہ میں گرانی بڑھتی رہی اسی طرح جہاں جہاں بھی انگریزی اقتدار پہنچتا رہا گرانی تیز ہوتی رہی۔ چنانچہ کمپنی کے آخری زمانہ میں یعنی 1857ء میں خوردو نوش کی اشیاء کا بھاؤ حسب ذیل تھا۔

گندم فی روپیہ	چاول فی روپیہ	چنائی روپیہ	گھی فی روپیہ 4 سیر
32 سیر پختہ	ساڑھے 18 سیر پختہ	ساڑھے 15 سیر پختہ یعنی ایک من ساڑھے 11 سیر	

(56)

ملکہ وکٹوریہ کا عہد حکومت 1890ء میں

گیہوں فی روپیہ	چاول فی روپیہ	چنائی روپیہ	گھی فی روپیہ	دودھ فی روپیہ
25 سیر	12 سیر	28 سیر	2 سیر	9 سیر

(57)

جارج پنجم کا عہد حکومت

گندم فی روپیہ	چاول فی روپیہ	چنائی روپیہ	گھی فی روپیہ	دال فی روپیہ
8 سیر	4 سیر	9 سیر	8 چھٹانک	4 سیر

دودھ فی روپیہ 4 سیر(58)

جارج پنجم کے بعد کا زمانہ اس سے بھی زیادہ منحوس اور تاریک آیا جس میں 1940ء سے لے کر آج تک چار سیر فی روپیہ بھی گندم نہیں مل سکتی بلکہ عموماً فی روپیہ دو سیر پختہ بھی ملنا مشکل ہوتا ہے۔

یوپی میں گندم چھبیس روپیہ من اور چاول چالیس روپیہ من اور بنگال میں ساٹھ روپے من چاول فروخت ہو رہا ہے۔ چور بازار (بلیک مارکیٹ) کھلا ہوا ہے لاقانونی کا زور ہے۔ کنٹرول کا بھاؤ بھی چار سیر فی روپیہ نہیں ہے۔ اس طرح تمام ضروریات زندگی' نہایت زیادہ مہنگی ہو گئی ہیں۔ جس کی نظیر کبھی بھی اس ملک ہندوستان میں پائی نہیں گئی۔ سابقہ زمانہ میں قحط کے زمانہ میں بھی اس قدر گرانی نہیں ہوتی تھی۔ انگریزی عہد حکومت میں اس طرح گرانی کے اسباب مختلف ہیں ان میں سے زیادہ تر موثر مندرجہ ذیل امور ہیں۔

گرانی کے اسباب

(1) یہاں کے نقود اور سونے چاندی سے جن کو لوٹ کھسوٹ کر انگریزوں نے انگلستان پہنچایا وہاں پر ان سے بڑے بڑے بینک کھولے گئے تجارت کی انتہائی گرم بازاری کی گئی۔ ملیں اور مشینیں قائم کی گئی۔ اور ہندوستان سے خام اشیاء کو کھینچ کر انگلستان پہنچایا گیا۔

(2) جب تک ہندوستان کی صنعت اور تجارت زندہ تھی مامون تجارت کے اصول کو جاری کر کے انگلستان میں ہندوستانی مال پر زیادہ سے زیادہ ٹیکس اور قانونی پابندیاں قائم کی گئیں اور ہندوستانی مال کو انگلستان سے نکال باہر کیا گیا۔

(3) ہندوستان کی صنعت اور تجارت کو مٹایا گیا جس کی تفصیل آگے آئے گی۔

(4) ہندوستان کی صنعت اور تجارت کے بند اور قریب المرگ ہو جاتے ہی فری ٹریڈ (آزاد تجارت) کی پالیسی کا اعلان کیا گیا اور ہر قسم کے مصنوعات اور تجارتی اشیاء کو نہایت معمولی اور کم سے کم ٹیکس کے ساتھ ہندوستان میں داخل کر کے ہندوستان کو یورپین بالخصوص انگریزی مال کی منڈی بنا دیا گیا۔ ہر شہر میں ہر منڈی میں ولائتی مال بے شمار ٹھونسا گیا اور ان کی قیمتوں کے اکثر حصوں سے غلہ اور خام اشیاء خرید کر انگلستان اور دوسرے ملکوں کو بھیجا گیا۔ جس کی بناء پر جوں جوں بدیسی مال ہندوستان میں زیادہ داخل ہوا اسی مقدار پر خام اشیاء یہاں سے نکلتی رہیں اور اناج کی مہنگائی بڑھتی رہی۔ مندرجہ ذیل اعداد و شمار کلکتہ کے ملاحظہ ہوں۔

سن	انگریزی کپڑا	چاول فی روپیہ	گندم کا آٹا فی روپیہ	تیل فی روپیہ
1800ء	بالکل نہیں آیا	5 سیر 1 من	5 سیر 1 من	ساڑھے 6 سیر
1814ء	8 لاکھ گز کپڑا آیا	37 سیر	37 سیر	ساڑھے 5 سیر
1821ء	2 کروڑ گز	30 سیر	33 سیر	5 سیر
1835ء	5 کروڑ گز	24 سیر	22 سیر	ساڑھے 4 سیر
1875ء	61 کروڑ گز	17 سیر	14 سیر	1 سیر
	1 ارب 56 کروڑ گز	ساڑھے 4 سیر	ساڑھے 4 سیر	سوا ایک سیر

(5) ہندوستان سے غلہ نہایت فراوانی اور کثرت سے جہازوں میں بھر بھر کر انگلستان اور دیگر ممالک میں بھیجا گیا چنانچہ اخبار ملت دہلی مورخہ 16 جولائی 1931ء لکھتا ہے کہ

رائل ایگریکلچر سوسائٹی کی 1883ء کی رپورٹ میں درج ہے کہ 1883ء میں 11 کروڑ 86 لاکھ 83 ہزار 7 سو 10 من گندم ہندوستان سے باہر گئی یعنی فی منٹ دو سو انتیس من اوسطاً ہندوستان سے گندم نکالی گئی سرکاری اعدادو شمار کی چوتھی اشاعت میں مندرجہ ذیل اعداد و شمار اوسطاً ہر منٹ میں اناج نکلنے کے درج کئے گئے ہیں۔

چاول ہر منٹ میں	گندم ہر منٹ میں	ارہر کی دال ہر منٹ میں	مسور کی دال ہر منٹ میں	مونگ پھلی ہر منٹ میں
118 من	65 من	50 من	55 من	55 من

1913ء میں غلہ وغیرہ کی برآمد کے مندرجہ ذیل اعداد شائع کئے گئے۔

چاول	گندم	کپاس	جوٹ	چاۓ
8 کروڑ 76 لاکھ من	3 کروڑ 50 لاکھ من	ڈیڑھ کروڑ من سے کم	سوا دو کروڑ من	چھتیس لاکھ من سے زیادہ

پنڈت دیا شنکر دوبے نے گندم کی بیرونی برآمد سال وار حسب ذیل دکھلائی ہے۔

1915ء ـ 16	تیئس لاکھ اسی ہزار ٹن گندم
1916ء ـ 17	انتیس لاکھ دس ہزار ٹن گندم
1917ء ـ 18	پینتالیس لاکھ دس ہزار ٹن گندم
1918ء ـ 19	چاول کی برآمد چھپن کروڑ پچاس لاکھ من دکھلائی ہے۔

یہ وہ اعدادو شمار ہیں جو (ہندوستان سے غلہ کی برآمد کے) سرکاری محکموں نے شائع کئے تھے۔ جب کہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس قسم کے امور میں بہت زیادہ راز داری اور پردہ پوشی سے کام لیا جاتا تھا تاکہ تنقید کرنے والوں کو زیادہ موقع اعتراض کرنے کا ہاتھ نہ آئے۔ بہر حال یہ اعدادو شمار بھی کچھ کم نہیں ہیں اس قدر اناج کے نکل جانے سے جو تباہی فاقہ اور گرانی ہندوستان میں آسکتی تھی وہ محتاج بیان نہیں۔ چنانچہ ہندوستان تمام دنیا کے ملکوں میں سب سے زیادہ مفلس ملک ہوگیا اور ہندوستانیوں کی آمدنی کا تناسب ساری دنیا کے مہذب ملکوں میں سب سے کم ہوگیا اور ان کی زندگی دنیا بھر کے فاقہ مستوں کے مقابلہ میں سب سے زیادہ اجیرن بن گئی۔

(6) آئین اکبری اور دوسری قدیمی تاریخوں سے پتہ چلتا ہے کہ انگریزی عروج سے پہلے ہندوستان کی پیداوار کسی زرخیز سے زرخیز ملک سے کم نہ تھی بلکہ دنیا میں کوئی ملک غذائیات کی پیداوار میں ہندوستان کی برابری نہیں کر سکتا تھا مگر انگریزی عہد حکومت میں پیداوار نہایت گھٹ گئی ہے۔ جس کی معنوی وجہ بادشاہ کی بدنیتی اور خود غرضی تھی جو کہ

رعایا کی بہبودی کا ارادہ نہیں کرتا بلکہ ہر امر میں اس کا مطمح نظر ہندوستانیوں کو لوٹنا اور اپنی قوم اور ملک کو پرورش کرنا اور نفع پہنچاتا رہنا ہے۔ روحانی پیشواؤں کی واضح تصریحات پائی جاتی ہیں کہ بادشاہ کی نیک نیتی اور بدنیتی کا اثر رعایا کی خوشحالی اور بدحالی پر نہایت زیادہ پڑتا ہے اور ظاہری وجہ کاشتکاری اور زیادتی پیداوار کے ذرائع اور وسائل میں کمی اور ناپیدگی تھی۔ کاشتکار اور زمیندار پر مختلف قسم کی مالیات کا اتنا بوجھ ڈال دیا گیا تھا کہ وہ کھاد‘ آلات کشاورزی‘ بیل‘ جانوروں کا چارہ‘ زمین چھوڑے رکھنا‘ مزدوروں کو زیادہ سے زیادہ لگانا آبپاشی حاصل کرنا اور اس قسم کی دوسری سہولتوں کو پوری طرح مہیا نہیں کر سکتا تھا۔ خصوصاً حیوانات زراعت کی انتہائی گرانی اور ان کے چارہ کی کمی اور مہنگائی کاشتکاروں کے لیے ہر ہر قدم پر سخت رکاوٹ پیدا کرتی تھی۔ جو بیل فیروز تغلق کے زمانہ میں دو روپیہ کو آتا تھا وہ آج دو سو روپے میں حاصل نہیں ہوتا۔ مندرجہ ذیل اعدادو شمار سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ہندوستان جو کہ زراعتی صلاحیت کی حیثیت سے تمام دنیا میں امتیازی شان والا شمار کیا جاتا تھا اس دور حکومت میں کس قدر پست کر دیا گیا۔

1907ء کی پیداوار کی اوسط گندم کی فی ایکڑ بہ نسبت دیگر ممالک حسب ذیل ہے

سلطنت متحدہ انگلستان و آئرلینڈ فی ایکڑ	جرمنی فی ایکڑ	فرانس فی ایکڑ
25 من کے قریب	24 من کے قریب	16 من کے قریب

ریاست ہائے متحدہ امریکہ فی ایکڑ	11 من سے کم
ہندوستان فی ایکڑ	9 من سے کچھ زیادہ

(59)

چاول کی پیداوار فی ایکڑ حسب ذیل ہے۔

هسپانیہ	اٹالیہ	ہندوستان
62،9	43،0	14،9

جبکہ دنیا کی تمام مملکتیں اپنی اپنی سلطنتوں اور حکومتوں سے زراعت کی ترقی کے بے شمار امدادیں حاصل کر رہی تھیں ہندوستان زراعتی ترقی کے ذرائع میں مثل دیگر تعمیری امور کے نہایت بے بس اور کمزور تھا۔ بقول مسٹر پیٹر فریمین (ممبر پارلیمنٹ و صدر کامن ویلتھ آف انڈیا لیگ) ہندوستانی گورنمنٹ زراعت پر ہندوستان کی آمدنی سے صرف ایک فیصد خرچ کرتی ہے۔ (60) ظاہر ہے کہ ایسی بے توجہی میں زراعت کس طرح ترقی کر سکتی

تھی۔ حالانکہ تنزل زراعت کے بے شمار اسباب چاروں طرف سے بڑھتے چلے جاتے رہے جن میں سے عام ہندوستانیوں کا روز افزوں افلاس اور اس پر روز افزوں ٹیکس و مال گزاری سب سے بڑا سبب تھا اور یہی وجوہ اس کے باعث ہوئے کہ وہ انگلستان جس میں زمانہائے سابق میں یعنی برطانیہ کے ہندوستان پر قبضہ کرنے سے پہلے بہت زیادہ قحط پڑتا رہتا تھا۔ قحط سے تقریباً محفوظ ہو گیا۔ کیوں کہ اس میں بے شمار دولت اور اناج ہندوستان سے کھنچ کھنچ کر پہنچنے لگا۔ اور وہ ہندوستان جس میں ہمیشہ غلہ کی افراط اور انتہائی ارزانی رہا کرتی تھی قحط اور کال کا گھر بن کر رہ گیا۔ 1000ء یعنی گیارہویں صدی عیسوی سے لے کر 1700ء یعنی سترہویں صدی کے ختم تک سات سو برس کے قحط کے دونوں ملکوں کو مقابلتا اعدادو شمار حسب تصریح سر ولیم ڈگبی صدی وار حسب ذیل ہیں۔

صدی	انگلستان	ہندوستان	وسعت قحط
گیارہویں صدی 1000ء سے 1100 تک	20 قحط	2 قحط	ہر دو مقامی
بارہویں صدی 1100ء سے 1200ء تک	15 قحط	1 قحط	دہلی کے گرد و نواح
تیرہویں صدی 1200ء سے 1300ء تک	19 قحط	3 قحط	مقامی
چودہویں صدی 1300ء سے 1400ء تک	16 قحط	3 قحط	مقامی
پندرہویں صدی 1400ء سے 1500 تک	9 قحط	2 قحط	مقامی
سولہویں صدی 1500ء سے 1600ء تک	15 قحط	3 قحط	مقامی
سترہویں صدی 1600ء سے 1700ء تک	6 قحط	3 قحط	غیر معین

سترہویں صدی تک انگلستان کے کل قحط 100 اور ہندوستان کے 17 قحط ہوتے ہیں مگر ہندوستان میں برطانیہ کے آنے اور اقتدار حاصل کرنے کے بعد دونوں ملکوں کی حالت میں نمایاں انقلاب ہو گیا۔ مندرجہ ذیل اعدادو شمار ملاحظہ ہوں۔

اٹھارویں صدی (از 1700ء تا 1800ء) انگلستان میں 7 قحط اور ہندوستان میں 1700ء سے 1745ء تک 4 قحط اور 1769ء سے 1800ء تک 7 قحط (کل 11 قحط)
صوبہ جات شمالی مغربی۔ دہلی و سندھ (مقامی)

انیسویں صدی (از 1801ء تا 1900ء) انگلستان میں صرف ایک قحط اور ہندوستان میں 31 قحط۔ جس کی وسعت تمام ہندوستان پر حاوی تھی اور جو اپنی نوعیت میں شدید تھے۔

ہندوستان میں انیسویں صدی کے اکتیس قحطوں کی تفصیل حسب ذیل ہے جس میں سرولیم ڈگبی نے ہر چوتھائی صدی کا حساب علیحدہ علیحدہ دکھایا ہے۔

1800ء سے 1825ء تک 5 قحط اس چوتھائی صدی میں قحط سے پچاس لاکھ آدمی مر گئے۔

1826ء سے 1850ء تک 2 قحط اس چوتھائی صدی میں قحط سے دس آدمی مر گئے۔

1851ء سے 1875ء تک 6 قحط اس چوتھائی صدی میں قحط سے پچاس لاکھ آدمی مر گئے اور دوسرے مورخ ایک کروڑ لکھتے ہیں۔

1876ء سے 1900ء تک 18 قحط اس چوتھائی صدی میں دو کروڑ ساٹھ لاکھ آدمی صرف قحط سے مر گئے۔(61)

الغرض انگریزی حکومت سے پہلے ہندوستان میں قحط عموماً مقامی ہوتے تھے اور نہایت کم ہوتے تھے اور جلدی جلدی نہیں پڑتے تھے چھ سو برس میں کل قحطوں کی تعداد ہندوستان میں سترہ اٹھارہ سے زائد نہیں ہے مگر انگریزی عہد حکومت میں نہایت وسیع اور بہت زیادہ اور جلد جلد ایک ہی صدی میں اکتیس قحط ایسے ایسے واقع ہوئے جن سے ملک نہایت زیادہ برباد ہو گیا اور یورپ کے بہت سے ملکوں کی آبادی سے زیادہ آدمی بھوک سے مر گئے۔ مسٹر جے۔ کیر ہارڈی۔ (موسس لیبر پارٹی آف انگلینڈ) اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ:

> "1860ء سے 1910ء تک یعنی پچاس برس کے عرصہ میں بھوک اور فاقہ سے مرنے والوں کی تعداد ہندوستان کی تین کروڑ نفوس کی تھی۔"

سرولیم ڈگبی پراسپرس برٹش انڈیا میں لکھتا ہے۔

> "ساری دنیا میں جنگوں کی وجہ سے ایک سو سات برس میں یعنی 1793ء سے 1900ء تک پچاس لاکھ کے قریب جانی نقصان ہوا ہے، مگر ہندوستان میں قحطوں سے صرف 1891ء سے 1900ء تک ایک کروڑ نوے لاکھ سے زیادہ جانیں ضائع ہوئیں۔"

پہلے زمانہ کے قحطوں میں وسعت نہیں ہوتی تھی اور نہ جلدی جلدی پڑتے تھے وہاں جانیں ضائع نہیں ہوتی تھیں لوگوں کے پاس سرمایہ وافر تھا اناج کتنا بھی مہنگا ہو جاتا تھا خرید کر جان بچا لیتے تھے مگر انگریزی زمانہ میں سرمایہ لٹ کر باہر چلا گیا تھا۔ گراں اناج کے

خریدنے کی قوت لوگوں میں باقی نہیں رہی تھی اس لیے موت کے گھاٹ عام لوگوں کو اترنا پڑتا تھا۔ سر ولیم ڈگبی لکھتا ہے کہ:

> ”ان قحطوں اور اموات کا سبب انگریزی مورخ آسمانی اسباب یعنی بارش کو قرار دیتے ہیں مگر یہ عذر نہایت لنگ ہے بارش کا نہ ہونا قلت فصل اور غلہ کی کمی کا باعث ہو سکتا ہے مگر اصلی سبب اس ہلاکت کا افلاس ہے کہ لوگ ناداری کی وجہ سے غلہ اپنے گردو نواح کے ان صوبوں میں سے خرید نہیں سکے جن میں غلہ بکثرت پیدا ہوا تھا۔ سخت افلاس کے باعث لوگ ذرا سا بھی بار اٹھا نہیں سکتے۔(62)“

مگر حقیقت میں اس صدی یعنی 1800ء سے 1900ء تک میں بارش کی قلت بھی نہیں ہوئی۔ سر ولیم ڈگبی نے قحط کے سالوں کے متعلق اعدادو شمار اور متعدد انگریزی ماہرین کی شہادتیں پیش کرتے ہوئے ثابت کیا ہے کہ ان ایام میں بارش کی کبھی بھی ایسی کمی نہیں ہوئی جس سے قحط پڑتا اور ایسی ہولناک بربادیاں ہوتیں۔ ماہرین اقتصادیات کا اندازہ ہے کہ ملک کے ہر حصہ میں اگر اکیس انچ بارش ہو جائے تو فصلیں بغیر آبپاشی کے تیار ہو سکتی ہیں مگر قحط کے سالوں میں بارش کا اوسط ہر جگہ ہمیشہ بیس انچ سے زائد ہی رہا۔ 1866ء میں بمبئی میں قحط پڑا حالانکہ وہاں پر بارش چھیاسٹھ انچ ہوئی اور یہ بھی ثابت کیا ہے کہ اناج بازاروں میں بکثرت موجود بھی رہتا ہے مگر صرف افلاس اور انتہائی غربت ہی باعث ہلاکت ہوئی قحط کے کمیشن کی رپورٹ ہے کہ موافق موسموں میں چودہ کروڑ ٹن غلہ ہندوستان میں سال بھر میں خرچ کرنے کے بعد بچ رہتا تھا بعض انگریز مورخین نے یہ بھی ناکام کوشش کی ہے کہ آبادی کی زیادتی کو باعث قحط و ہلاکت قرار دیں مگر یہ بھی غلط ہے ہندوستان کی آبادی فی مربع میل یورپ کے بہت سے ممالک سے اوسطاً زیادہ تھی اور نہ اس میں آبادی کی افزائش سے زیادہ ہوئی۔ مندرجہ ذیل نقشہ سے معلوم ہو جائے گا کہ ہندوستان آبادی کی حیثیت سے کیا درجہ رکھتا ہے۔

1911ء میں	1921ء	1921ء میں
بلجیم فی مربع میل	ہالینڈ	انگلستان و ویلز
589 نفوس	454 نفوس	405 نفوس
1921ء میں	1921ء میں	1921ء میں

جاپان فی مربع میل	اٹالیہ	جرمنی
317 نفوس	293 نفوس	290 نفوس
1921ء میں	1921ء میں	1921ء میں
چین	آسٹریا	ہندوستانی فی مربع میل
266 نفوس	366 نفوس	211 نفوس

(نوٹ) : اگرچہ بعض خاص خاص حصوں میں ہندوستان میں آبادی فی مربع میل تمام ملکوں سے بہت زیادہ ہے۔ مگر مجموعہ ہندوستان کی آبادی کا اوسط دو سو گیارہ ہی ہے۔

الغرض ہندوستان باعتبار اوسط آبادی ان تمام ملکوں سے بہت کم ہے مگر افلاس اور قحط کی حیثیت سے سب سے زیادہ بڑھاہوا کر دیا گیا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس ہندوستان میں اضافہ آبادی سات فیصد ہوا ہے۔ مگر اضافہ کاشت آٹھ فیصد یا اس سے بھی زائد ہوا ہے۔

مندرجہ بالا حقائق کے پیش نظر اس پروپیگنڈے کی حقیقت بھی کھل جاتی ہے جو کہ بہت سے انگریز اور ان کے ایجنٹ انگریزی حکومت کی برتری کے حق میں کیا کرتے ہیں۔ کہ انگریزی حکومت سے پہلے ہندوستان میں امن و امان کسی طرف بھی اطراف ہند میں نہ تھا۔ عموماً لڑائیاں ہوا کرتی تھیں جن سے مخلوق تباہ و برباد ہوا کرتی تھی۔ مگر انگریزی حکومت نے تمام ملک میں ہر طرف امن وامان ایسا قائم کر دیا جس کی نظیر زمانہائے گزشتہ میں نہیں ملتی۔" کیونکہ اولاً یہ کہنا ہی غلط ہے کہ انگریزی حکومت کے زمانہ میں ہمیشہ اطراف ملک میں امن وامان رہا۔

1757ء یعنی جنگ پلاسی سے لے کر 1857ء تک کا ایک صدی کا زمانہ داخلی ہندوستان میں تمام لڑائیوں اور جنگ سے بھرا ہوا ہے جن میں عموماً ہندوستانی زیادہ تر ہلاک ہوتے رہے اور ہندوستان ہی کا سرمایہ لوٹا جاتا رہا اسی صدی میں نواب سراج الدولہ والی مرشد آباد بنگال کی لڑائی میر قاسم نواب اودھ وغیرہ کی پٹنہ اور بکسر کی لڑائی۔ روہیلکھنڈ کی طویل و عریض۔ کرناٹک اور دکن کی لڑائیاں سلطان ٹیپو مرحوم کی لڑائیاں۔ مرہٹوں سے لڑائیاں' نیپال اور بھوٹان کی لڑائیاں پنجاب اور اودھ اور سندھ بمبئی وغیرہ کی لڑائیاں ہیں جن میں بے شمار جانیں ضائع ہوئیں۔ اور آخر 1857ء کی مشہور لڑائی ہے جس سے تمام ہندوستان انتہائی بربادی کے گھاٹ پر اتار دیا گیا تھا۔ اس کے بعد بیرون ہند کی لڑائیوں کا سلسلہ جاری ہوا جس میں افغانستان پر چار مرتبہ حملوں میں لاکھوں ہندوستانی مارے گئے

مغربی شمالی سرحد کے آزاد قبائل سے صوات، بنیر، چترال، بنوں، کہجواری آفریدیوں، مسعودیوں مہمندیوں، وزیروں وغیرہ سے یکے بعد دیگرے مختلف اوقات میں باربار لڑائیاں ہوئیں۔ اور لاکھوں نفوس کام آئے۔ نیز بلوچستان کی لڑائیاں، برہما جنوبی اور شمالی، تبت وغیرہ اطراف ہند کی لڑائیاں۔ پھر بیرون ہند چین، شمالی لینڈ، سوڈان، مشرقی افریقہ، جنوبی افریقہ مصر وغیرہ کی لڑائیاں اور آخر میں 1914ء میں جنگ عظیم اول جس میں ہندوستانی جانیں بے حدو بے حساب ضائع ہوئیں۔ یعنی عراق (ماسوپوٹامیہ) عدن۔ فلسطین۔ شام (سوریہ) چناق قلعہ، سمرنا، ایشیائے کوچک، بلجیم فرانس، وغیرہ کی لڑائیاں ہیں جو کہ جرمنوں اور ترکوں اور ان کے خلفاء سے واقع ہوئیں۔ اور ان میں ہندوستانی جانیں پانی کی طرح ضائع ہوئیں اور کروڑوں اشرفیاں اور روپیہ اور کروڑوں ٹن رسد وغیرہ برباد ہوئی کیا یہ چیزیں ہندوستان کی بربادی میں کچھ کم اثر انداز ہوئی تھیں۔ حالانکہ ان لڑائیوں کی بنیاد محض انگریزی شہنشاہیت واقتدار اور برطانوی تجارت کی برتری تھی۔ ہندوستان کا کوئی مفاد پیش نظر نہ تھا۔ پھر اس کے بعد جنگ عظیم ثانی جو کہ 1939ء سے شروع ہو کر 1943ء کے آخر تک جاری رہی اور برطانوی مفاد کی خاطر ہندوستان کی ہر چیز کو یورپین قربانگاہ پر چڑھا دیا گیا۔ ان لڑائیوں میں جس قدر ہندوستان کا دو سو برس کے اندر نقصان ہوا ہے۔ انگریزی اقتدار سے پہلے زمانہ میں ہزاروں برس میں بھی نہیں ہوا تھا۔ ہم اگر ان لڑائیوں سے قطع نظر کرلیں تو ان قحطوں کی وجہ سے باوجود امن و امان جس قدر جانی نقصان تمام ہندوستان کو صرف ڈیڑھ صدی میں برداشت کرنا پڑا ہے تمام دنیا کو ایک ہزار برس کی جنگوں سے برداشت کرنا نہیں پڑا۔

فاعتبروا یااولی الابصار

انگریزوں کے ہاتھوں ہندوستان کی صنعتی و تجارتی بربادی

صاحب علم المعیشت ص 582 میں ہندوستانی تجارت کی خارجہ سرگزشت لکھتے ہوئے کہتا ہے۔

"اٹھارویں صدی کے نصف تک ہندوستانی مصنوعات بلا تکلف انگلستان جاتی رہیں۔ لیکن انگریز جیسی معاملہ فہم اور وقت شناس قوم فورا تاڑ گئی کہ اگر یہی لیل و نہار رہے اور ہندوستانی مصنوعات یونہی بلا روک ٹوک بکثرت ملک میں آتے رہے تو ملکی صنعت کا پنپنا محال ہے بلکہ رہی سہی جو کچھ ہے وہ بھی خاک میں مل جائے گی۔ اور ہمیشہ کے واسطے ہندوستان کا دست نگر بننا پڑے گا عام مرفہ الحالی اور ملکی ترقی پر صنعت و حرفت کے زوال سے جو تباہ کن اثر پڑتا وہ اس بیدار مغز اور مال اندیش قوم سے مخفی نہ تھا۔ چناں چہ جونہی دیکھا کہ ہندوستانی مصنوعات کا ملک پر تسلط ہوتا جاتا ہے فورا چونک اٹھی اور ہر قسم کی پیش بندی شروع کر دی۔ جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے' سوتی اونی' ریشمی' زریں غرضیکہ ہر قسم کے کپڑے تیار کرنے میں ہندوستان نے وہ کمال حاصل کیا تھا کہ اگر صریح ثبوت موجود نہ ہوتے تو اس کا یقین کرنا دشوار ہوتا اور جامہ بافی کا ملک بھر میں اس قدر کاروبار پھیلا ہوا تھا کہ زراعت کے مانند وہ بھی قومی صنعت کہلاتا تھا۔ نہ صرف غرباء اور متوسط الحال لوگوں کی مستورات بوقت فرصت سوت کات کر نفع اٹھاتی تھیں بلکہ اچھے اچھے گھر کی بہو اور بیٹیاں چکن اور کشیدے کاڑھنا اور طرح طرح کی سوزن کاری باعث فخر و امتیاز خیال کرتی تھیں۔ کروڑ ہا بندگان خدا کی روزی اسی صنعت و حرفت سے وابستہ تھی۔ دیگر ممالک کو کپڑا بھی بکثرت بھیجا جاتا تھا۔ .

چنانچہ ہندوستان میں پارچہ بافی کا عروج دیکھ کر انگلستان والوں کے

منہ میں پانی بھر آیا اور بنظر دور اندیشی رقابت کے جوش میں انہوں نے سب سے اول ہندوستان کی اسی صنعت پر وار کیا اور وہ ایسا کاری پڑا کہ کچھ ہی عرصہ میں ہندوستانی پارچہ بافوں کا حال زار و نزار ہو گیا۔

اس واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ ولایت کے کپڑا بننے والوں نے یہ محسوس کیا کہ وہ نہ کپڑے کی عمدگی میں ہندوستان والوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں اور نہ اس کی ارزانی میں۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ ہندوستانی کپڑا انگلستان میں خود وہاں کے کپڑے پر غلبہ پا رہا تھا اور اندیشہ تھا کہ انگلستان کی یہ صنعت کسی روز بالکل بے جان ہو جائے گی تو انہوں نے شور مچانا شروع کیا۔ حکومت قوم کے ہاتھ میں تھی۔ حکمران طبقہ مستعد اور بیدار مغز تھا۔ صناعوں کی معروضات پر فورا توجہ کی ان کی شکایات کو معقول اور بجا پاکر اختیارات حکومت سے کام لیا۔ اور نہ صرف ملک کو تباہی سے بچا لیا بلکہ اس مستقل عظمت و طاقت کی بنیاد قائم کر دی یعنی جامہ بافی کی صنعت کو بذریعہ قانون مامون کر دیا اور کون نہیں جانتا کہ انگلستان کی مرفہ الحالی و اقتدار کو لنکاشائر مانچسٹر اور لورپول کی کپڑے کی ملوں نے شروع سے آج تک کس قدر سیراب و شاداب بنا رکھا ہے۔

17ء مارچ 1769ء کو ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائرکٹروں نے ولایت سے اپنے اعلے عہدہ داروں کے نام بنگال کو ایک عام خط بھیجا جس میں بتاکید تحریر تھا کہ ہر طرح سے بنگال میں ریشم خام کی پیداوار بڑھانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اور ساتھ ہی ساتھ ریشمی کپڑوں کی تیاری گھٹانی۔ بلکہ روکنی چاہیے۔ تاکہ ریشم خام ہندوستان سے ولایت آئے اور ریشمی کپڑا یہاں سے تیار ہو کر ہندوستان جائے۔ اس غرض کو پورا کرنے کا ایک یہ طریقہ بھی بتایا گیا تھا کہ کپڑا بننے والوں کو کسی نہ کسی طرح خود کمپنی کے کارخانوں میں کام کرنے پر مجبور کیا جائے اور بطور خود کام کرنے سے ان کو روکا جائے۔ تاکہ کل کاروبار کمپنی کے ہاتھ میں آ جائے اور وہ اس میں جیسی ردو بدل مناسب سمجھے باآسانی کر سکے۔

انگلستان کے دارالعوام کے طرف سے جو ایک منتخب کمیٹی ہندوستان کے حالات پر غور کرنے کے واسطے مقرر کی گئی تھی اس نے اپنی رپورٹ میں جو 1783ء میں شائع ہوئی تھی ڈائرکٹران کمپنی کے

مذکورہ بلا خط کی تعریف اور تائید کی ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ اس خط میں ہندوستانی پیداوار خام کی ترقی اور مصنوعات کی مزاحمت کے بارہ میں جو پالیسی صاف صاف بیان کی گئی ہے اس سے بنگال کی صنعت و حرفت کو ضرور صدمہ پہنچے گا- اگر اس خط کی ہدایات پر عمل ہو سکا تو نتیجہ یہ ہو گا کہ ہندوستان جیسے صنعت و حرفت والے ملک میں ایسا انقلاب نمودار ہو گا کہ اس میں نری پیداوار خام پیدا ہونے لگے گی جو انگلستان کے مصنوعات میں کام آئے گی- سب سے عمدہ اثر جو ظاہر ہو چکا وہ یہ ہے کہ ریشم بننے والے اب کمپنی کے کارخانوں میں کام کرنے لگے- اگر اب وہ لوگ بطور خود کام کرنا چاہیں تو بھی ان کو روکنا چاہیے- اور اگر نہ مانیں تو سرکار ان کو سخت سزا دے اور بطور خود کام کرنے کی قطعاً ممانعت کر دے-

بربادی صنعت و تجارت کے ڈپلومیٹک طریقے

خلاصہ کلام یہ کہ ہندوستان کی صنعت اور تجارت کے مٹانے کے لیے تین طریقے اختیار کئے گئے۔

اول یہ کہ ہندوستانی کاریگروں کو صنعت سے روکا جائے۔

دوم یہ کہ ہندوستان کے مال کو انگلستان میں داخل نہ ہونے دیا جائے اور تجارت مامون کے فلسفہ کو اس قدر خوشنما اور ضروری بتایا جائے کہ لوگ چاروں طرف اس کے گرویدہ ہو کر اسی کو حق اور صحیح ماننے لگیں اور کہنے لگیں کہ ہر ملک کا فرض ہے کہ دوسرے ملکوں کی سستی پیداوار کی درآمد ٹیکس وغیرہ کے ذریعہ سے روک کر اپنے یہاں کی صنعت و حرفت کو ترقی دینے کی کوشش کرے تاکہ کچھ عرصہ میں ملکی پیداوار بھی اسی قدر ارزاں ہو جائے اور خارجی پیداوار کی ضرورت ہی نہ رہے۔

سوم یہ کہ اپنی مصنوعات کو ہندوستان میں ٹھونسا جائے اور اس کو اس قدر ارزاں کر دیا جائے کہ ہندوستانی صنعت گھٹنے ٹیک کر فنا ہو جائے اور اس امر کے لیے آزاد تجارت کا فلسفہ بروئے کار لایا جائے اور تمام دنیا کو سمجھایا جائے کہ حق یہی ہے کہ اپنے ملک اور غیرملک کی پیداوار میں کوئی اور امتیاز نہ ہونا چاہیے۔ اگر کوئی چیز دوسرے ملک سے ارزاں دستیاب ہو سکے تو بلا تکلف اس کو منگا لیا جائے اور ٹیکس قائم کرکے اس کی درآمد روکی نہ جائے۔ اور اگر کوئی چیز اپنے یہاں پیدا نہ ہو سکے تو سرکاری امداد سے اس کو ترقی دینے کی اور اس کی برآمد کا راستہ نکالنے کی کوشش نہ کی جائے۔ انگریز ڈپلومیٹروں نے ہندوستان کے ساتھ تینوں طریقے نہایت معصومانہ انداز میں اختیار کئے جن کی کچھ تفصیل ہم ہدیہ ناظرین کرتے ہیں۔

پہلا طریقہ۔

اول الذکر (یعنی ہندوستانیوں کو صنعت اور دستکاری سے جابرانہ طریق پر روکنا) اس کی ابتداء 17 مارچ 1769ء سے ہوئی۔ اور پھر اس کے قوانین اور جابرانہ اعمال درندگی کی وحشیانہ مثالیں سامنے آ جاتی ہیں۔ 1769ء کے خط میں ہدایات کی گئی ہیں کہ بنگال کے کاریگروں کو کمپنی کے کارخانوں میں کام کرنے پر مجبور کیا جائے گا اور اگر وہ نہ مانیں اور بطور خود کام کرنا چاہیں تو ان کو روکا جائے۔ چنانچہ 1783ء کی مذکورہ بالا رپورٹ میں اس

کے نتائج ذکر کرتے ہوئے منتخب کمیٹی کہتی ہے۔

> سب سے عمدہ اثر جو ظاہر ہو چکا وہ یہ ہے کہ ریشم بننے والے اب کمپنی کے کارخانوں میں کام کرنے لگے۔ اگر اب وہ بطور خود کام کرنا چاہیں بھی تو ان کو روکنا چاہیے اور اگر نہ مانیں تو سرکار انکو سخت سزا دے اور بطور خود کام کرنے کی قطعاً ممانعت کردے۔"

اس بندش کا مطلب صاف ظاہر ہے کہ اولاً ریشمی کپڑے کی پیداوار اپنے قابو میں کر کے حسب ہدایات ڈائرکٹران اس کی مقدار گھٹائی جائے۔ ثانیاً جس قدر کپڑا بھی تیار کرایا جائے من مانی اجرت دے کر ارزاں تیار کرایا جائے۔ ریشمی کپڑوں کی خوبی اور نفاست نے دنیا کو گرویدہ بنا رکھا تھا وہ یا تو تیار ہی نہ ہوں یا اگر ہوں تو ہندوستانیوں کو نفع واجبی حاصل نہ ہو۔ اس طرح مجبور کرنے کے لیے کاریگروں کے ساتھ جو معاملے کئے گئے ان پر مندرجہ ذیل اقتباسات سے روشنی پڑتی ہے۔

> سرتھامس منرو 1813ء میں پارلیمنٹ کی منتخبہ کمیٹی کے سامنے کہتا ہے۔
>
> "ملازمان کمپنی نے خاص خاص نور بافوں کو ایک عمارت بارہ محل میں جمع کر کے ان پر پہرہ بٹھا دیا اور اس وقت تک رہا نہ کیا جب تک کہ انھوں نے معاہدہ نہ کیا کہ وہ سوائے کمپنی کے اپنا مال کسی اور کے ہاتھ فروخت نہ کریں گے۔ جب کبھی نرخ پر نور بافوں کی طرف سے اعتراض ہوتا تو کمپنی کی ایک کمیٹی اپنی رائے کے موافق نرخ قرار دیتی اور نور بافوں کو قبول کرنا پڑتا ان کو کچھ رقم پیشگی دے دی جاتی ہے جس کی ادائیگی سے ان کو عمر بھر سبکدوش ہونا محال ہے۔ اگر کوئی نور باف معاہدہ کی پوری پابندی نہ کرتا تو اس کی نگرانی کے واسطے ایک شحنہ (کوتوال) تعینات کر دیا جاتا تھا۔ جس کا طلبانہ ایک آنہ روز اسی نور باف سے وصول کیا جاتا تھا شحنہ کے پاس ایک سونٹا بھی ہوتا تھا جس سے وہ بلا تکلف تنبیہہ الغافلین کا کام لے سکتا تھا اور لیتا تھا۔ مزید برآں نور بافوں پر جرمانہ کیا جاتا تھا جو کہ ان کے تانبے پیتل کے برتن نیلام کرنے سے وصول ہوتا تھا۔ اس طرح سے کپڑا بننے والی جماعت بالکل کمپنی کے پنجے میں دبی رہتی تھی۔"(64)

مسٹر کاکس بیان کرتے ہیں۔

"صرف اس ایک کارخانہ میں جس کے وہ نگراں تھے ڈیڑھ ہزار نور باف کام کیا کرتے تھے۔ نور بافوں کے ساتھ جو کچھ برتاؤ کیا جاتا تھا وہ کوئی بے ضابطہ کاروائی نہ تھی۔ بلکہ قوانین کی رو سے اس کو جائز قرار دیا گیا تھا۔ چنانچہ 1792ء کے ریگولیشن نمبر31 میں یہ سب حالات مذکور ہیں اور نیز ہندوستانی زمینداروں کو تنبیہ ہے کہ کمپنی کے تجارتی افسروں کو نور بافوں سے معاملہ کرنے میں وہ کبھی نہ روکیں۔ نہ اور کسی طرح کی مزاحمت کریں اور ہمیشہ ادب سے پیش آئیں۔ جبکہ ہندوستان کے سرمایہ ناز صناعوں کے ساتھ من حیث الجماعت ایسا برتاؤ کیا جائے جیسے کہ کوئی صیاد پرندوں کو پنجرے میں بند کرکے کرے تو صنعت و حرفت کا جو کچھ حشر ہو گا اور ہوا محتاج بیان نہیں۔ یہ چمن تو آزادی کی آب و ہوا میں لہلہاتا ہے۔ غلامی اس کے حق میں خزاں کا حکم رکھتی ہے۔" (65)

فرانسس براؤن پارلیمنٹ کی منتخبہ کمیٹی کے سامنے شہادت دیتے ہوئے کہتا ہے۔

"آگے چل کر ہندوستانی کپڑے کی تجارت کو تباہ کرنے کے لیے کمپنی نے جولاہوں کے چرخوں، کپڑا بنانے کے اوزاروں اور کرگھوں تک پر بھاری ٹیکس لگا دیا۔"

انگریزی سوداگر سر ولیم بولٹس کا بیان حسب ذیل ہے (از پارلیمانی رپورٹ)

"کمپنی کے گماشتے بازار کے بھاؤ سے چالیس فیصد کم قیمت پر جولاہوں سے زبردستی کپڑا لیتے تھے۔ اگر وہ مچلکہ کے مطابق کپڑا نہیں دے سکتے تھے تو ان کا سامان اسی وقت فروخت کرکے کمی پوری کی جاتی تھی۔ اور کچا ریشم نکالنے والے ناگواروں کے ساتھ اتنا ظلم کیا جاتا تھا کہ ایسی مثالیں پائی گئی ہیں کہ ریشم نکالنے کے لیے انھوں نے اپنے انگوٹھے کاٹ ڈالے ہیں۔"

سر ولیم بولٹس 1772ء میں کہتا ہے۔

"اصل یہ ہے کہ تمام اندرون ملک کی تجارت اور ایک خاص طریقے سے کمپنی کا پورب (مشرق) میں روپیہ لگانا یہ سب مسلسل مظالم کا ایک

> منظر رہا ہے جس کے مضر اثرات شدت کے ساتھ ہر نور باف اور ہر کاریگر محسوس کر رہا ہے۔ ہر سامان جو تیار کیا جاتا ہے وہ کمپنی کی مخصوص ملکیت ہو جاتا اور انگریز اپنے بنیوں اور کالے رنگ کے گماشتوں کی مدد سے خودرائی کے طریقے سے طے کرتے ہیں کہ ہر کاریگر کتنا مال اور کس قیمت پر دے گا۔ اور ان امور میں بالعموم غریب جولاہے کی رضا مندی ضروری نہیں سمجھی جاتی تھی۔ کیونکہ گماشتے جو کمپنی کے ملازم ہوتے ہیں ان لوگوں سے جس چیز پر چاہتے ہیں دستخط کرا لیتے ہیں اور اگر جولاہے وہ روپیہ لینے سے انکار کرتے ہیں تو وہ روپیہ زبردستی ان کی کمر میں بندھوایا جاتا ہے اور پھر ان کو کوڑے مارے جاتے ہیں۔ اس محکمہ میں جو جو بدمعاشیاں کی جاتی ہیں وہ وہم و قیاس میں بھی نہیں آ سکتیں۔ ہر چیز کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ غریب جولاہے کو خوب ٹھگا جاتا ہے کیونکہ کمپنی کے گماشتے جو قیمت مقرر کرتے ہیں وہ بالعموم بازار کی قیمت سے (15) فیصد سے لے کر (40) فیصد تک کم ہوتی ہے۔ اسی قسم کا غیر منصفانہ برتاؤ خام ریشم بننے والوں کے ساتھ بھی کیا جاتا ہے اور اس امر کی مثالیں موجود ہیں کہ ان لوگوں نے ریشم کاتنے کی تکالیف سے تنگ آکر خود اپنے انگوٹھے کٹوا ڈالے تاکہ وہ اس جبرو تعدی سے محفوظ رہیں۔(66)"

28 فروری 1928ء کو روزنامہ خلافت جلد 7 نمبر 48 میں ولیم بولٹس وغیرہ سے نقل کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

> (1) جو کپڑا بننے والے کمپنی کے ایجنٹوں کے بنائے ہوئے راضی نامے جنہیں مچلکہ کہا جاتا تھا اس پر عمل کرنے سے قاصر رہتے تھے۔ ان کا مال ضبط کر کے کھڑے کھڑے نیلام کر دیا جاتا تھا۔ کچا ریشم نکالنے والوں کے ساتھ طرح طرح کی زیادتیاں کیں جاتی تھیں۔ حتی کہ ان کے انگوٹھے کاٹ لیے جاتے تھے تاکہ وہ اپنا کام نہ کر سکیں۔
>
> (2) کپڑا بننے والوں کو مجبور کیا جاتا تھا کہ اپنے مفاد کے خلاف کمپنی کا کام کریں۔ چنانچہ ان پر بڑے بڑے جرمانے کئے جاتے تھے۔ تاکہ وہ کمپنی

کاکام کریں۔ کپڑا بننے والوں کو سخت سے سخت سزائیں دی جاتی تھیں اور اس طرح انہیں مجبور کیا جاتا تھا کہ وہ کپڑا بننے کا کام چھوڑ دیں۔

(3) تجارتی بورڈ کی ڈائری بابت 1796ء اور 1811ء ان غریب کپڑا بننے والوں اور ملک کے کاریگروں کو جو غلاموں کی طرح کمپنی کا کام کرتے تھے سخت سخت سزائیں دی جاتی تھیں۔ ان پر جرمانے ہوتے تھے قید دی جاتی تھی کوڑے پڑتے تھے اور ان پر ایسی پابندیاں لگائی جاتی تھیں جس کے باعث کپڑا بننے والوں کی تعداد بہت کم ہوتی جاتی تھی۔

مزید۔ تھم ٹاوشنڈ اپنی کتاب ایشیاء اور یورپ میں لکھتا ہے۔

"ہندوستان کے معمولی کاروباری لوگوں کے واسطے ہماری حکومت کسی طرح بھی مبرا از خطا نہیں ہو سکتی اور ہماری حکومت سے یہ خرابی کبھی دور نہیں ہو سکتی۔ سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ ہماری حکومت نے ہندوستانیوں کی زندگی بالکل بے لطف بنا دی ہے عام انگریزوں کو یہ سمجھانا مشکل ہے کہ ہماری حکومت سے پہلے ہندوستانی زندگی کیسی پر لطف تھی اور کاروباری اور باہمت لوگوں کے واسطے ہر ایک کاروبار میں کیسی آسانیاں میسر تھیں مجھے پختہ یقین ہے کہ انگریزوں کے آنے سے پہلے کاروباری ہندوستانی نہایت آرام کی زندگی بسر کرتے تھے۔(67)"

"کمپنی کی پالیسی یہ تھی کہ ہندوستان کی صنعت کو برباد کر دیا جائے۔ چنانچہ کھلے ہوئے احکام صادر کیے گئے کہ بنگال میں ریشم پیدا کرنے کی کوشش کی جائے لیکن ریشم کے کپڑے تیار کرنے سے روکا جائے اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ریشم بافوں کو جبریہ کمپنی کے کارخانوں میں ملازم رکھ لیا گیا۔ اور دوسرے کسی گاہک کی فرمائش پر کپڑا بننے کی ممانعت کر دی گئی۔(68)"

اسی طرح جنوبی دکن کی چھینٹوں اور سوتی کپڑوں کی صنعت برباد کر دی گئی۔ جولاہوں کو زبردستی گھیر کر لایا جاتا۔ ان پر سپاہی مسلط کر دیے جاتے تھے اور جب تک وہ معاہدہ نہ کر لیتے کہ اور کسی کے لیے کپڑا نہ بنیں گے انہیں نکلنے نہ دیا جاتا اگر کمپنی کا کپڑا پہنچانے میں دیر کرتے تو سزا کے مستوجب ہوتے۔(69)"

"ہندوستان کی ان صنعتوں کو تباہ کرنے کے لیے کمپنی اور برطانوی حکومت دونوں

یکساں آرزو مند تھے۔ اس کا اندازہ اس شرح محصول سے کیا جا سکتا ہے جو برطانیہ کے ساحل پر ہندوستانی مال کے لیے مقرر کی گئی تھی۔ 1813ء میں اکثر کپڑوں پر 68‘ اور 78‘ فیصد لیا جاتا تھا۔(70)"

صاحب معیشت الہند لکھتا ہے۔

> "سترہویں صدی میں انگریزی صناع اور دستکاروں پر جو وقت گزرا اس سے کہیں زیادہ مصیبت ہندوستانی صناعوں اور دستکاروں کے سر پر اٹھارویں صدی عیسوی میں آ پڑی ان کا روزگار بھی مارا گیا۔ اور کوئی پرسان حال بھی نہ تھا۔ اول تو خانہ جنگیوں کی بدولت ملک خود پامال دوسرے صنعت و حرفت کا گلا گھونٹا گیا۔ لوگوں پر مصیبت کا آسمان ٹوٹ پڑا۔ ہندوستانی تاریخ میں اٹھارویں صدی بہت خوفناک اور بہت افسوس ناک ہے۔ اچھے اچھے شہر ویران ہو گئے۔ صنعتیں برباد ہو گئیں۔ صناع تباہ ہو گئے۔ اور بحالت مجبوری زراعت عام لوگوں کا پیشہ بن گئی۔(71)"

آگے چل کر صفحہ (297) میں لکھتا ہے۔

> "بہر حال اٹھارہویں صدی سے ہندوستان کی تجارت کا نقشہ بدل گیا چنانچہ کمپنی کے خطوط جو ولایت سے آتے تھے ان میں ہدایات درج ہیں کہ جہاں تک ہو سکے سامان خام کی پیداوار بڑھانی چاہیے اور مصنوعات روکنی چاہیں۔ اور اس کام میں قانون سے مدد لینے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں سمجھا گیا۔ مثلاً بنگال کے ریشم بننے والوں کو قانوناً ممنوع تھا کہ کمپنی کے کارخانہ کے سوا گھر پر کام کریں اور اس کی خلاف ورزی تعزیری جرم تصور کی جاتی تھی۔ جس کی سخت سزا ملتی تھی۔ علاوہ بریں ہندوستانی مصنوعات کی درآمد پر انگلستان میں کروڑ گیری از حد بڑھا دی گئی اور اس کے برعکس ولایتی مصنوعات کی درآمد پر ہندوستان میں کوئی کروڑ گیری نہ تھی اور تھی تو برائے نام مقرر تھی۔ چنانچہ پارلیمنٹ میں بھی تسلیم ہو گیا کہ بے شک ایسٹ انڈیا کمپنی نے ایسا انتظام کر دیا ہے کہ ہندوستان میں مصنوعات گھٹیں اور خام سامان بڑھے اور اگر یہ انتظام رہے گا تو اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ ہندوستان کا نقشہ بدل جائے گا۔ صنعتیں

> غائب ہو جائیں گی اور برطانیہ عظمیٰ کی صنعتوں کے واسطے وہاں صرف سامان خام پیدا ہونے لگے گا۔ فہوالمراد۔"

مذکورہ بالا شہادتوں اور اقتباسات سے صاف ظاہر ہے کہ انگریزوں نے ہندوستان کی صنعت و حرفت مٹانے کے لیے نہایت وحشیانہ مظالم اور بربرانہ تعدیاں کی ہیں جن کی بناء پر صناعوں اور کاریگروں نے مجبور ہو کر صنعت و حرفت چھوڑ دی۔ ممکن ہے کہ ناظرین کو تعجب پیدا ہو کہ انگریزوں نے اپنی ہندوستانی رعایا پر اس قدر بے دردی اور جفا کاری کے مظاہرے کس طرح روا رکھے جو کہ بالکل خلاف انسانیت ہیں اور پھر اس زمانہ میں ہندوستانی حکومتوں اور غیرت مند رعایا نے ان مظالم کو کس طرح برداشت کیا اسی شبہ کے جواب میں صاحب علم المعیشت صفحہ (589) میں لکھتا ہے۔

> "تعجب ہو گا کہ آخر انگریزوں نے ایسی چیرہ دستی ہندوستانی صناعوں پر کیوں کی اور کس طرح کی۔ کاروباری لوگوں کی منفعت طلبی اور خود غرضی ضرب المثل ہے انگریز اس وقت آج کل کی طرح تو حکمراں تھے نہیں گو بعض حصے ان کے قبضہ میں آنے شروع ہو گئے تھے لیکن اب تک وہ اپنا خاص کام تجارت سمجھتے تھے نہ کہ حکومت پس ان کو تو اپنے نفع سے غرض تھی۔ رعایا کی آسائش اور بہبودی سے ان کو کیا سروکار۔ رہی حکومت مغلیہ اس میں ہاتھ پیر ہلانے تک کی سکت باقی نہ تھی۔ اور وہ صرف برائے نام جاری تھی۔ پھر کون تھا جو غریب اطاعت شعار ہندوستانی صناعوں کو من چلے انگریزی تاجروں کی دست برد سے بچاتا خود وارن ہسٹنگز جو کمپنی کی طرف سے ہندوستان میں گورنر رہ چکا ہے اور جو سلطنت ہند کے بانیوں میں نمبر اول شمار ہوتا ہے کہتا ہے کہ انگریز ہندوستان میں آکر بالکل نیا انسان بن جاتا ہے جن جرائم کی وہ اپنے ملک میں کبھی جرات کر ہی نہیں سکتا ہندوستان میں ان کے ارتکاب کے واسطے انگریز کا نام جواز کا حکم رکھتا ہے اور اس کو سزا کا خیال تک نہیں ہو سکتا۔"

اسی طرح پر ایک دوسرے صاحب ٹامس سڈ ہنسم فرماتے ہیں کہ میں ہمیشہ سے دیکھتا ہوں کہ بمقابلہ اور قوموں کے انگریز ممالک غیر میں

سب سے زیادہ چیرہ دستی کرتے ہیں اور ہندوستان میں بھی یہی واقعہ پیش آ رہا ہے۔" حاصل کلام یہ ہے کہ اس زمانے میں انگریز اپنے کو محض تاجر خیال کرتے تھے اور آزاد ملک کا باشندہ ہونے کی وجہ سے نڈر اور من چلے تھے۔ صدیوں کی اطاعت و فرماں برداری کرتے کرتے ہندوستان کے لوگ پست ہمت اور ذلیل ہو چکے تھے ملک میں کوئی ایسی حکومت قائم نہ تھی جو حقوق و انصاف کی نگہداشت کر سکتی۔ پس انگریزوں کا جو کچھ بھی طرز عمل تھا وہ کچھ عجیب نہ تھا۔

بربادی صنعت و تجارت کا دوسرا طریقہ

تجارت ماموں[1] کے فلسفہ کی اشاعت

دوسرا طریقہ ہندوستان کی صنعت و حرفت کے برباد کرنے کا تجارت مامون کے فلسفہ کو پھیلا کر ہندوستانی مال کو انگلستان میں داخل ہونے سے روکنے کا ہے جس کی تفصیل یہ ہے۔ 1600ء کی ابتداء میں انگریز ہندوستان میں مثل دیگر اہل یورپ 'جرمنی' ہالینڈ' فرانس' ڈنمارک وغیرہ یہاں کی تجارت سے دولت کمانے کے لالچ میں آئے۔ کیوں کہ ایک صدی کی تجارت ہند سے پرتگیزوں نے اپنے ملک کو رشک جناں بنا لیا تھا۔ اس زمانہ میں ہندوستان اپنی بے شمار دولت ' اعلیٰ صنعت' ارزانی تجارت کی وجہ سے جنت نشان بنا ہوا تھا' یہاں کے بادشاہوں اور باشندوں نے اس ملک کو جنت نشان بنا دیا تھا۔ لوگوں کی زبان حال چلا چلا کر کہہ رہی تھی۔

اگر فردوس بر روئے زمین است ☆ ہمیں است وہمیں است وہمیں
است

(دیکھو تصریحات پروفیسر مکس ملر' تھامس منرو' ابن بطوطہ وغیرہ)

انگریزوں نے یہاں کی نفیس اور سستی چیزیں بالخصوص ریشمی' اونی' سوتی کپڑے انگلینڈ پہنچائے۔ وہاں کے باشندوں نے ایسی چیزیں کبھی دیکھی بھی نہ تھیں۔ وہ نہایت زیادہ پسند کی گئیں اور ہاتھوں ہاتھ بڑی بڑی قیمتوں پر فروخت ہونے لگیں۔ اس سے انگریزوں کو تجارت میں نہایت زیادہ نفع ہوا۔ اور دن دگنی رات چوگنی دولت بڑھنے لگی۔ صاحب معیشت الہند صفحہ (681) میں لکھتا ہے۔

---

[1] تجارت مامون یعنی دوسرے ملکوں کی ارزاں پیداوار کی در آمد بھاری ٹیکس وغیرہ کے ذریعہ روک کر اپنے یہاں کی صنعت و حرفت کو ترقی دینے کی کوشش کرنا اور اگر کوئی چیز اپنے یہاں ارزاں پیدا نہ ہو سکے تو حکومت کی امداد سے اس کو ترقی دینا اور اس کی بر آمد کا راستہ نکالنا تاکہ کچھ عرصہ میں اپنے ملک کی پیداوار اس قدر ارزاں ہو جائے اور دوسرے ملکوں سے مال منگانے کی ضرورت نہ رہے۔

"عہد قدیم سے لے کر قرون وسطیٰ تک جو اہل ہنود اور مسلمانوں کا دور ہے اس میں زمانہ کے لحاظ سے ہندوستان کی گوناگوں صنعتیں بہت اعلیٰ پیمانہ پر ترقی یافتہ نظر آتی ہیں۔ دور دراز تک ممالک جاتی ہیں۔ اور بے نظیر شمار ہوتی ہیں انہیں مصنوعات کی خاطر اہل یورپ بھی ہندوستانی تجارت کے شیدائی تھے اور اس راہ میں جان و مال لٹاتے تھے اس زمانہ میں ہندوستان کے سوتی' اونی' ریشمی' کپڑے اور قالین' موتی جواہر اور زیورات' مرصع اور طلائی' اور نقرئی سامان' فولاد کے آلات اور ہتھیار' غرضیکہ تمدن اور تمول کی اعلیٰ ضروریات دور دور کے ممالک یہاں سے منگاتے تھے۔ چونکہ ان کے مصنوعات کو یہاں کوئی پوچھتا بھی نہ تھا۔ اور ہر قسم کا سامان خام یہاں بافراط پیدا ہوتا تھا۔ بالعموم برآمد کی قیمت بشکل نقرہ طلا وصول ہوتی تھی۔ جہاز سازی اور جہاز رانی کے فن میں بھی ہندوستان نے اس درجہ ترقی کرلی تھی۔ کہ اس کے بادبانی جہازوں میں دور دور تک مال آتا جاتا تھا ممکن ہے کہ ہندوستان کی معاشی درماندگی میں یہ باتیں عجیب سنائی دیں۔ لیکن یہ سب امور کچھ تخیلات اور قیاسات نہیں بلکہ واقعات ہیں اور توقع سے بڑھ کر تاریخی شہادتیں موجود ہیں جن کی تفصیلات کے واسطے جداگانہ تصانیف درکار ہیں۔ اس لیے انگلینڈ کی مصنوعات ماند پڑ گئیں۔ اور انتہائی کس مپرسی میں مبتلا ہو گئیں۔ ہندوستان میں وہاں سے سونا اور چاندی بکثرت ان اشیاء کی قیمت میں کھنچ کر آنے لگا۔ وہاں کے صناعوں اور کاریگروں کا چاروں طرف سے شور و غوغا شروع ہوا کہ اگر اسی طرح ہندوستان کا مال ہمارے ملک میں آتا رہا تو ہمارے تمام کاریگر اور انکے بچے بھوکوں مرجائیں گے اور ملک کی دولت نکل کر باہر چلی جائے گی ملک برباد ہو جائے گا۔

صاحب معیشت الہند صفحہ (691) میں لکھتا ہے۔

"ہندوستانی مصنوعات خاص کر کپڑے کو جب انگلستان میں بہت مقبولیت حاصل ہوئی اور ان کا رواج بڑھا تو وہاں پر ہر طرف بیکاری پھیل گئی اور سخت برہمی پیدا ہوئی۔ حتیٰ کہ سودیشی کی تحریک جس کا اب مضحکہ اڑایا

جاتا ہے بڑے زور شور سے انگلستان میں نمودار ہوئی۔ سرکار نے بھی اس کی پوری تائید کی نتیجہ یہ کہ تھوڑے ہی عرصہ میں حالت کچھ سے کچھ ہو گئی۔ انگلستان بڑی بڑی صنعتوں کا مرکز بن گیا۔ اور ہندوستان میں زراعت کے سوا کچھ باقی نہ رہا ذیل میں ہم عصر بیانات اور تحریرات کے چند مستند اقتباسات درج ہیں جن سے اس زمانے کے کاروباری حالات اور انقلاب کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے سترہویں صدی کے آخری زمانہ میں صنعت و حرفت کی مختلف جماعتوں کی طرف سے پارلیمنٹ میں بے شمار محضر اور درخواستیں پیش ہوئیں ان میں سے چند بطور مشتے نمونہ از خروارے ملاحظہ ہوں۔

(1) درخواست گزار' پھولدار' دھاریدار اور ریشمی کپڑا تیار کرتے ہیں اور اون اور ریشم ملا کر بھی کپڑے بنتے ہیں اور یہی ذریعہ معاش ہے لیکن جب سے ہندوستان کا ریشمی اور سوتی کپڑا آیا ہے اور اس کا رواج بڑھا یہاں کا کاروبار بالکل مارا گیا۔ اگر ہندوستانی کپڑا نہ روکا گیا تو یہ صنعت یہاں بالکل تباہ ہو جائے گی۔

(2) اس نواح میں ریشمی اور اونی ریشم ملا ہوا کپڑا بنا جاتا ہے' اور لوگوں کا یہی عام پیشہ ہے کچھ دنوں قبل تک خوب فراغت سے بسر ہو رہی تھی۔ لیکن چند روز سے کاروبار بہت گھٹ گیا اور لوگ بیکاری سے پریشان ہیں۔ استدعا یہ ہے کہ ہندوستانی کپڑے کی تجارت روک کر ملکی صنعت کو پناہ دیجائے۔

(3) پارچہ بافی اور اس سے متعلق دوسری صنعتیں ہم لوگوں کا خاص پیشہ تھا اور انہیں پر معاش کا مدار تھا۔ لیکن اب وہ سب صنعتیں غائب ہو رہی ہیں اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہندوستان سے ریشمی اور سوتی کپڑا آ رہا ہے نتیجہ یہ کہ لوگ پہلے دوسروں کی مدد کرتے تھے۔ آج وہ بیکار اور محتاج ہیں لہٰذا عرضی گزاروں کی استدعا ہے کہ ہندوستانی کپڑا روکا جائے۔

(4) عرضی گزار ایک بڑی جماعت ہیں اور قدیم سے ان کی قانونی طور پر خاص حقوق حاصل ہیں۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے حال میں ہندوستان سے بہت سی باناتی ٹوپیاں (ہیٹ) بنوا کر منگائی ہیں اگر ان کی درآمد نہ روکی گئی تو یہ صنعت یہاں تباہ ہو جائے گی۔ وجہ یہ ہے کہ ہندوستان میں ہر قسم کی ارزانی ہے اور مال بہت سستا تیار ہوتا ہے۔

(5) ہندوستانی لوگ ہماری ریشمی کپڑے کی صنعت پہلے ہی ہضم کر چکے ہیں پنکھوں کی صنعت بھی انہوں نے قبضہ میں کر لی ہے اور ہمارے چوبینہ کے کام کو بھی دبا لیا ہے اسی طرح یکے بعد دیگرے وہ یہاں کی تمام صنعتوں کو برباد کر دیں گے۔ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی دن میں ہندوستان پیرس کا جانشین بن کر ہم پر فیشن عائد کرے گا۔ ہم کو تو فرانس ہی کے وضعدار کپڑوں کا آنا سخت ناگوار تھا اب ہندوستان سے خوب وضعدار لباس تیار ہو کر بکثرت آ رہا ہے اور ہمارے درزیوں کا روزگار تباہ ہو رہا ہے۔

غرضیکہ اس زمانہ کی بے شمار شکایتی درخواستیں اور محضر سرکاری محافظ خانوں اور کتب خانوں میں اب بھی موجود ہیں۔ لوگوں نے سودیشی کی تائید میں نظمیں لکھیں۔ رسالے شائع کئے۔ چونکہ مستورات فطرتاً فیشن کی بہت زیادہ دلدادہ ہوتی ہیں وہی ہندوستانی کپڑوں کی سب سے زیادہ شائق تھیں۔ ایک دلچسپ رسالہ بھی ان کو غیرت اور جوش دلانے کے واسطے شائع کیا گیا۔ اس میں تحریر ہے کہ یہ امر بخوبی ثابت ہو چکا ہے کہ بہت سے غریب صناع اور دست کار بے روزگار ہیں۔ معاش کو محتاج ہیں اور بھوکوں مر رہے ہیں۔ ان کی ایک کثیر جماعت سخت افلاس اور مصیبت میں گرفتار ہے۔ خیراتی امداد دو چند بلکہ سہ چند ہو گئی ہے۔

اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ ہندوستانی مصنوعات لی درآمد اور مقبولیت سے انگلستان کی صنعتوں کو بہت زک پہنچی تھی۔ اور روک تھام نہ ہوتی تو وہاں کے صناع اور دست کار تباہ ہو جاتے۔ حامیان سودیشی کی طرف سے جو معروضات پارلیمنٹ میں پیش ہوئے ان میں سے ایک میں لکھتے ہیں۔

"ذرا انگریزی قوم کی حالت پر تو نظر ڈالئے اور خاص کر ان لوگوں کی

> حالت قابل ملاحظہ ہے جن کی صنعتیں ہندوستان کے مقابل ہیں۔ اتنی انگریزی صنعتیں جو سراسر تباہ ہو گئیں۔ اس نقصان پر غور فرمایئے غریب لوگ جو ان مقامات میں روزگار اور روزی کے واسطے فریاد کر رہے ہیں اس پر توجہ فرمایئے۔ بالاخر یہی تحقیق ہو گا کہ ہندوستانی تجارت ان تمام مصائب کی اصلی باعث ہے۔“

انگریزی صنعتوں کی تباہی کے علاوہ ایک بڑا اعتراض اور بڑا غم یہ بھی تھا کہ ہندوستانی مال کے معاوضہ میں زیادہ تر انگلستان سے چاندی اور سونا ہندوستان بھیجا جاتا تھا اس بارہ میں بھی سخت بحث چلتی رہی جس کا مختصر ذکر جا بجا اوپر بھی آ چکا ہے۔ چنانچہ ایک معزز مخالف لکھتے ہیں۔

کہ تجارت تاحد امکان بد ترین قسم کی تجارت ہے چاندی سونا جو ہم کو کسی طرح علیحدہ نہ کرنا چاہیے ہمارے ہاتھ سے نکل رہا ہے اور اس کے معاوضہ میں ہمارے یہاں مصنوعات اور کھیل کھلونے آ رہے ہیں جن کی ہم کو کچھ بھی ضرورت نہیں ہے۔“

جب اس درجے نوبت پہنچ گئی تو لا محالہ پارلیمنٹ میں بھی یہ بحث چھڑی۔ وہاں بھی تقریروں کا وہی رنگ نظر آتا ہے۔ کرنل برچ اپنی ایک تقریر میں فرماتے ہیں کہ:

> ”ہندوستان کی جس چیز نے ہم کو سب سے زیادہ تباہ کیا وہ کالیکو یعنی سوتی کپڑا ہے کہ اس نے ہماری اونی کپڑے کو بالکل نکما کر دیا۔ افسوس ہے ہندو تو دولت لوٹ رہے ہیں اور عیسائی تباہ ہو رہے ہیں۔“

ایک اور صاحب فرماتے ہیں:۔

> ”انگلستان کے پارچہ بافوں کو ہندوستانی پارچہ بافوں سے مقابلہ کرنا محال ہے اس لیے کہ اول تو ہندوستان میں مال بہت ارزاں ہے۔ دوسرے وہاں کے پارچہ باف ایک آنہ روز پر گزر کر سکتے ہیں۔ اگر یہی لیل و نہار ہیں تو یہ خیال کرتے ہوئے دل دھڑکتا ہے کہ آخر اس تجارت کا کیا انجام ہو گا یقیناً ہندوستان کے لوگ مالا مال ہو جائیں گے اور ہم افلاس میں گرفتار ہوں گے:

ایک اور صاحب اصرار کرتے ہیں کہ:

> ”ہندوستانی تجارت کی روک تھام ضروری ہے کیونکہ نہ صرف پارچہ بافی

> بلکہ انگلستان کی بہت سی صنعتیں ہندوستانی مصنوعات کی درآمد سے معرض خطرہ میں پڑ گئی ہیں۔ ہندوستانی مصنوعات نہ صرف انگلستان میں انگریزی مصنوعات کی جگہ استعمال ہوتی ہیں بلکہ دوسرے ممالک میں بھی جہاں جہاں ہماری مصنوعات جاتی تھیں وہ ان کی جانشین بن گئی ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اگر کچھ بندوبست نہ کیا گیا تو ہماری صنعتوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔ انگریزی مصنوعات کو نہ کوئی گھر ہاتھ لگائے گا نہ باہر۔"

علیٰ ہذا مسٹر بالکسمس نے بھی اپنی تقریر میں اس پہلو پر زور دیا اور فرمایا کہ:

> "ہندوستان سے جو کپڑا آتا ہے وہ نہ صرف ہمارے یہاں اونی کپڑے کے بجائے استعمال ہوتا ہے بلکہ وہ دیگر ممالک میں پہنچ کر وہاں بھی ہمارے اونی کپڑے کی مزاحمت کرتا ہے اور ان ممالک کے کپڑے کو بھی ہمارے یہاں آنے سے روکتا ہے جو ہم پہلے اپنی مصنوعات کے معاوضہ میں منگایا کرتے تھے۔ غرضیکہ ہندوستانی کپڑے نے ہمارے اونی کپڑے کا کام تمام کر دیا۔ اور اپنے مقابل دیگر ممالک کے کپڑے کی درآمد بھی انگلستان میں روک دی۔"

مسٹر شیلڈون نے پارلیمنٹ میں اپنا یہ بیان دیا کہ:

> "پہلے انگلستان میں جو کپڑا ریشمی فرانس اور اٹلی سے درآمد ہوتا تھا وہ بالکل بند ہو گیا اس لیے کہ بنگال کا ریشمی کپڑا اس سے نصف قیمت پر آتا ہے اور اس سے بہتر ہوتا ہے۔"

حاصل کلام یہ کہ ہندوستانی مصنوعات اور خاص کر پارچہ جات کی خوبی اور ارزانی نے اکثر ممالک یورپ اور خاص کر انگلستان کے بازار پر پورا قبضہ کر لیا اور مقابلہ کی تاب نہ لاکر مقامی صنعتیں دم توڑنے لگیں تو جان بچانے کی خاطر سودیشی کی تحریک پھیلائی گئی۔ اور ہندوستانی مصنوعات کی درآمد روکنی پڑی چنانچہ عام حالات اور خیالات کو پیش نظر رکھ کر مجلس تجارت و آبادیات کے کمشنروں نے پارلیمنٹ سے یہ سفارش کی کہ ہندوستانی تجارت سے جو بے چینی پھیل رہی ہے اس کو رفع کرنے کے لیے مناسب ہے کہ ہندوستانی کپڑے اور مصنوعات کی درآمد اور ان کا استعمال اپنی سلطنت اور آبادیات میں روکا جائے چنانچہ اسی اصول پر قانون بنا تجویز ہوا۔

جوش کی کیفیت یہ تھی کہ قانون پیش ہونے میں کچھ تعویق نظر آئی تو پارچہ بافوں نے ایک روز ایسٹ انڈیا کمپنی کے دفاتر پر ہلا بول دیا اور قریب تھا کہ غصہ میں اس کا سارا خزانہ لوٹ لیں

اس شبہ پر کہ شاید یہ قانون نامنظور ہو جائے پارچہ بافوں کی بیویوں نے پارلیمنٹ کی عمارت پر حملہ کیا تاکہ اگر کچھ لوگ قانون کی مخالفت کریں تو ان کی وہ اچھی طرح مرمت کریں غرضیکہ 1700ء میں قانون پاس ہو ہی گیا جس کی رو سے ہندوستانی کپڑے کی درآمد اور اس کا استعمال ممنوع قرار پایا اور پارچہ بافوں کی محنت ٹھکانے لگی۔ اس کے بعد ہندوستانی کی دیگر مصنوعات پر بھی محصول کروڑ گیری اس درجہ بڑھا دیا گیا کہ ان کی درآمد بہت دشوار ہو گئی۔"

ظاہر ہے کہ ایسے قوانین سے ایسٹ انڈیا کمپنی کو سخت خطرہ اپنی اس تجارت اور نفع اندوزی میں پیش آیا جس کی وجہ سے دولت کے دریا اس کے ممبروں کے گھروں میں بہتے تھے۔ اس لیے اس نے ایڑی سے چوٹی تک کا زور لگایا کہ کوئی ایسا قانون نہ بننے پائے۔ اس کے ممبروں اور طرفداروں نے آزاد تجارت کے متعلق نہایت زور دار تقریریں کیں اور فلسفی طریقہ پر آزاد تجارت کے وہ اصول اور فوائد دکھلائے جن پر انسانی زندگی کی ترقی کا مدار ہے جو بین الاقوامی انصاف اور عدالت کے لیے مرکز بننے کے مستحق ہو سکتے تھے مگر ایک بھی نہ چلی مخالف فریق نے بالمقابل مامون تجارت کی شدید ضرورت پر دھواں دھار تقریریں کیں۔ تصانیف اور مضامین کے دروازے کھل گئے۔ مامون تجارت کی بھلائی میں بیانات اور پمفلٹ شائع کئے گئے اور پریس میں زور دار پروپیگنڈہ کے ذریعہ سے عوام کو ہم خیال بنایا۔ ہوٹلوں' تفریح گاہوں' جلسوں وغیرہ میں یہی چرچا پھیلایا گیا کوئی آزاد تجارت پر تقریر کرتا تھا تو کوئی مامون تجارت پر زوردار لیکچر دیتا تھا۔ مگر آزاد تجارت کے حامی اگر دو چار ہوتے تھے تو مامون تجارت کے سینکڑوں شیدائی اس کے مقابلہ میں آجاتے تھے۔ کوئی انگلستان صناعوں کی بربادی کی تصویر کھینچتا تھا کوئی ہندوستانی کاریگروں کی لوٹ کا داستان گو بن جاتا تھا کوئی انگریزی خزانوں کے باہر نکل جانے کا رونا روتا تھا۔ خلاصہ یہ کہ مامون تجارت کا تفوق اور آزاد تجارت کا ملک کے لیے سم قاتل اور زہر ہلاہل ہونا بہت بڑے پیمانہ پر پھیلایا گیا اور چونکہ قوت اور اقتدار مامون تجارت والوں کے ہاتھ میں تھا اس لیے آزاد تجارت کے قائلین کو شکست کھانی پڑی۔

صاحب معاشیات ہند لکھتا ہے۔

> "ایسٹ انڈیا کمپنی اور اس کے طرف داروں نے بہت کچھ آزاد تجارت کے فوائد سمجھائے لیکن ان کی کچھ شنوائی نہ ہوئی۔ البتہ آزاد تجارت اور نامین تجارت کے آئندہ علمی مباحث کے واسطے اچھا خاکہ تیار ہو گیا۔ یہ بھی اچھا لطیفہ رہا کہ اول تو خود کمپنی نے بامید اعانت سرکار کو اپنے معاملات میں ہاتھ بٹانے کی دعوت دی لیکن بعد کو وہ خود ہی سرکاری مداخلت سے تنگ آنے لگے۔ سرکار کو اول مروتاً اور پھر ضرورتاً کاروباری معاملات میں دخل دینا پڑا ان ہی حالات کی بدولت تجارت کے اصول بنے اور تجارت کا مسلک رائج ہوا۔ صنعت اور تجارت کے علمی مباحث کی بنیاد پڑی۔

الحاصل مدعیان خدمت انسانی اور دعویداران تمدن و تہذیب نے مامون تجارت کی آڑ میں ایسے ایسے جابرانہ اورر ظالمانہ قوانین ہندوستانی تجارت اور مصنوعات کو روکنے کے لیے بنائے کہ دنیاء تجارت نے نہ کبھی دیکھے نہ سنے تھے۔ ہندوستانی مصنوعات پر حکومت کی طرف سے نہایت ہی بوجھل محصول لگائے گئے۔ حالانکہ ہندوستان برطانوی مقبوضات اور نو آبادیات برطانیہ میں سے قرار پا چکا تھا۔ ایسے ٹیکسوں کی بناء پر ضروری اور لازم تھا کہ ہندوستانی مال انگلستان سے یک قلم بند ہو جاتا اور ہندوستانی کاریگروں کی زندگی موت کے گھاٹ اتر جاتی چنانچہ مسٹر مانٹ گومری مارٹن مؤلف تاریخ نو آبادی ہائے برطانیہ لکھتا ہے۔

> "ہم نے ربع صدی کے دوران میں ہندوستانی علاقوں کے علاقوں کو اپنی مصنوعات کے خریدنے پر مجبور کیا اس طریقہ پر کہ ہمارے اونی مال پر ہندوستان میں کوئی محصول نہیں لیا جاتا تھا۔ سوتی مال پر ساڑھے تین فیصد محصول تھا۔ اور اسی نسبت سے دیگر اشیاء پر محصول لگایا گیا تھا۔ درانحالیکہ اسی زمانہ میں ہندوستان کے بنے ہوئے مال پر ہم انگلستان میں ایسے سخت محصول لگاتے رہے کہ ہندوستانی مال کی درآمد بند ہو جائے۔ بالفاظ دیگر اس محصول کی مختلف شرح 10 - 20 - 50 - 100 - 500 اور 1000 فیصد تک ان اشیاء پر لگائی گئی تھیں جو ہمارے ہندوستانی

> مقبوضات کی بنی ہوئی ہوں اس لیے ہندوستان کے ساتھ آزاد تجارت کی جو چیخ پکار ہو رہی تھیں وہ دراصل انگلستان کے مال کی آزاد تجارت تھی۔ نہ کہ ہندوستان کے اس مال کی جو انگلستان بھیجا جائے۔ سورت۔ ڈھاکہ۔ مرشد آباد و دیگر مقامات کی جہاں دیسی صنعتیں عروج پر تھیں بربادی کی داستان کا بیان کرنا حد درجہ دل خراش ہے۔ میری رائے میں یہ بربادی ایمانداری کے ساتھ تجارت کو ترقی دینے کی وجہ پر مبنی نہ تھی بلکہ میرا خیال یہ ہے کہ وہ ایک زبردست طاقت تھی جس کے ذریعہ سے کمزور کو دبایا جا رہا تھا۔(72)"

ہنری سنٹ جارج ٹکر (جنہوں نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ ہندوستان میں بسر کیا تھا اور جو واپسی کے بعد انگلستان میں کمپنی کے ڈائرکٹروں میں داخل کر لیے گئے تھے 1823ء میں مختصراً یوں بیان فرماتے ہیں۔

> "ہم نے ہندوستان کے ساتھ کیسے تعلقات قائم کر رکھے ہیں اس کے ریشمی کپڑے اور نیز وہ کپڑے جو سوت اور ریشم سے مل کر بنے جاتے ہیں کچھ روز سے ہمارے بازاروں سے خارج کر دیئے گئے ہیں۔ اور حال میں کچھ تو 67 فیصد محصول درآمد کی بدولت اور کچھ کلوں کی ایجاد کی بدولت سوتی کپڑے جو کہ ہندوستان میں بکثرت تیار ہوتے تھے۔ نہ صرف اس ملک میں آنے بند ہو گئے بلکہ ہم الٹے انگلستان سے سوتی کپڑے اپنے ایشیائی مقبوضات میں بھیجنے لگے ہیں۔ اور اس طرح پر ہندوستان تجارتی ملک سے تنزل کرکے اب محض زراعتی ملک رہ گیا۔(73)"

نقشہ ذیل ملاحظہ ہو جو کو ہندوستانی مال پر محصولات کی بھاری مقدار اور اس کی بندش پر روشنی ڈالتا ہے۔

شرح محصول فیصد

ہندوستانی مصنوعات	1812ء	1824ء	1832ء
ریشمی کپڑے	قطعی ممانعت	قطعی ممانعت	20 فیصد
زربفت	"	"	**30 فیصد**

شالی چادر	71 فی صدی	ساڑھے 67 فیصد	30 فیصد
چھینٹ	سوا 71 فیصد	ساڑھے 67 -	10 فیصد
قالین	سوا 68 -	50 -	2 فیصد
بنت کا آرائشی سامان	71 -	50 =	30 فیصد
سوتی کپڑا	سوا 27 -	50 -	28 فیصد

(74)

1832ء میں جو محصولوں کی تخفیف نظر آ رہی ہے وہ کسی انسانی ہمدردی یا انصاف و عدل گستری کی بناء پر نہیں ہے بلکہ اس بناء پر ہے کہ پہلے سالوں کے ظالمانہ اور وحشیانہ ٹیکسوں اور قطعی ممانعت وغیر کارروائیوں سے ہندوستانی مال انگلستان سے بالکل خارج ہو چکا تھا اور اس کا وہاں آنا بھی بند ہو چکا تھا نیز اس کے کاریگر اور ان کی صنعتیں تقریباً دم توڑ رہی تھیں۔ اس لیے اس وقت اتنے بڑے محصولوں کی ضرورت ہی نہیں رہتی تھی۔ ادھر انگلستان کی صنعت اور تجارت اتنی قوت پکڑ چکی تھی کہ وہ ہندوستانی صنعت کا مقابلہ بخوبی کر سکتی تھی۔ اس وقت میں بڑی بڑی کلیں اور دخانی کارخانے بھی قائم ہو چکے تھے اس لیے اب وہ خطرہ اپنے ملک کی بیکاری وغیرہ کا اٹھ گیا تھا۔ کیونکہ ان کلوں کا مال اب بہ نسبت سابق ارزاں ہونے لگا تھا۔ تاہم یہ محصول بھی ان محصولوں سے جو کہ انگلستانی مال پر ہندوستان میں لگایا گیا تھا اور جابرانہ طریقہ پر اخیر تک باقی رکھا گیا۔ نہایت ہی زیادہ ہے۔ انگریزی مال پر محصول ساڑھے تین فیصد اور ساڑھے دو فیصد تک ہی رکھا گیا تھا اور جب کبھی اس سے زائد کی تجویز ہوئی تو انگلستان میں ہائی ویلا مچ گئی۔ کاغذات انڈیا آفس میں ہے۔

> "1785ء میں تار شکم کارخانہ ولایت میں کھولا گیا ڈھاکہ کی ململ کی نقل پر پانچ لاکھ تھان موٹے کھردرے دو سال بعد تیار کئے گئے۔ ولایت میں شور مچایا گیا کہ ڈھاکہ کے کاریگروں سے ولایتی کاریگروں کی حفاظت چاہیے۔ چنانچہ گورنمنٹ انگلستان نے ہندوستان سے آنے والے سوتی مال پر پچھتر فیصد محصول لگا دیا نتیجہ یہ ہوا کہ 1787ء میں ڈھاکہ سے انگلستان میں تیس لاکھ روپے کی ململ گئی تھی۔ محصول لگا دینے کے بعد

> 1807ء میں ساڑھے آٹھ لاکھ روپیہ کی گئی اور 1813ء میں ساڑھے تین لاکھ روپیہ کی اور 1871ء میں اس کا جانا بالکل بند ہو گیا۔ (75)"

سرجان اسٹوارٹ مل اپنی کتاب سلطنت برطانیہ کی تاریخ میں لکھتا ہے۔

> "1813ء تک ہندوستان کا سوتی اور ریشمی مال انگلینڈ میں وہاں کے مال کی بہ نسبت 50 ـ 60 فیصد کم قیمت پر بکتا تھا اس لیے انگلینڈ کے مال کی حفاظت کے لیے ولایت میں آنے والے مال پر قیمت کے حساب سے 70 ـ 80 فیصد محصول لگایا گیا اور اس کا آنا بالکل بند کر دیا گیا۔ ایسا نہ کیا جاتا تو پیزلی اور مانچسٹر کے لیے شروع کئے گئے کپڑے کے کارخانے ہندوستانی مال کے مقابلہ بھاپ کے زور سے بھی نہیں چلائے جا سکتے تھے۔"

مگر افسوس کہ اس پر ہی اکتفا نہیں کیا گیا کہ بھاری بھاری محصولات لگائے جائیں گئے بلکہ قانونی طریقہ پر ہندوستانی مال کی قطعی ممانعت بھی قانوناً پاس کی گئی اور اس کا لانا اور اس کا فروخت کرنا اس کا خریدنا بھی جرم قرار دیا گیا اور خلاف کرنے والوں پر مالی اور بدنی سزائیں جاری کی گئیں۔ چنانچہ یوزیل آرٹ مینوفیکچر آف گریٹ برٹن (کتاب) میں ہے۔

> "صوبہ ملابار کی چھینٹ کو ولایت میں روکنے کے لیے انگریز جولاہوں کی استدعاء پر پارلیمنٹ نے اس چھینٹ پر ڈیڑھ آنہ فی گز ٹیکس لگایا۔ دو سال بعد وہ ٹیکس تین آنہ فی گز کر دیا گیا اور 1820ء میں قانون بنا دیا کہ جو لوگ ولایت میں ہندوستانی چھینٹ فروخت کریں گے ان پر دو سو روپیہ جرمانہ اور جو خریدیں گے ان پر پچاس روپیہ جرمانہ ہو گا۔ ہندوستان کے ریشمی کپڑے اور چھینٹوں کو روکنے کے لیے 1800ء میں قانون پاس کیا گیا کہ بنگال چین' فارس' یا ایسٹ انڈیا میں بنا ہوا ریشم اور وہاں پر رنگی ہوئی اور چھپی ہوئی چھینٹ وغیرہ 1801ء کے بعد ولایت میں نہ منگائی جائے او نہ پہنی جائے۔ اس تاریخ کے بعد جو مال منگایا جائے وہ گوداموں میں بند کر دیا جائے۔ اور پھر غیر ممالک میں بھیج دیا جائے گا۔"

1821ء میں محصولات کو بڑھاتے بڑھاتے مندرجہ ذیل مقدار پر کر دیا گیا۔ کپاس کا کپڑا فیصد 81 روپیہ کپاس فی من 15 روپیہ چھینٹ 81 روپیہ تہذیب فیصد 32 روپیہ چٹائی فیصد 84

بکرے کے اون کی اشیاء 41 روپے دس پیسے

صاحب علم المیشت 31 ۔ 1830ء کی منتخبہ کمیٹی کی رپورٹ کے متعلق لکھتا ہے۔

"ان تحقیقات سے پتہ چلتا ہے کہ کمپنی کی تدابیر کارگر ہو چلی تھیں۔ پارچہ بافی کی صنعت کو گھن لگنا شروع ہو گیا تھا۔ ہندوستان کے سوتی کپڑے کی درآمد انگلستان میں بہت گھٹ گئی۔ ریشمی کپڑا ہندوستان میں بننا کم ہو گیا۔ حتیٰ کہ الٹی انگلستان سے اس کی درآمدی جاری ہو گئی۔ چنانچہ مذکورہ بالا تحقیقات سے واقعات ذیل کا پتہ چلتا ہے۔

کلکتہ میں انگریزی مصنوعات کی درآمد پر ساڑھے دو فیصد محصول لیا جاتا تھا بمقابلہ اس کے ہندوستانی مصنوعات کی درآمد پر لندن محصول بشرح ذیل وصول کیا جاتا تھا۔

شرح محصول فیصد

ہندوستانی مصنوعات	1812ء	1824ء	1832ء
ریشمی کپڑے	قطعی ممانعت	قطعی ممانعت	20 فیصد
زر بفت	-	=	30 فیصدی
شالی چادر	71 فی صدی	ساڑھے 67 فیصد	30 فیصد
چھینٹ	سوا 71 فیصدی	ساڑھے 67	10 فیصد
قالین	سوا 68 =	50 =	20 فیصدی
جنت کا آرائشی سامان	71 =	50 =	30 فیصد
سوتی کپڑا	سوا 27 =	50 =	20 فیصد

مگر ریشم خام کی حالت بالکل برعکس تھی 1812ء میں اس کی درآمد پر حصول تین فیصد قیمت 3 روپیہ فی پونڈ کی مجموعی شرح سے وصول کیا جاتا تھا 1821ء میں وہ صرف 3 روپیہ فی پونڈ ہو گیا اور انگریزی مصنوعات کو مزید ترقی دینے کی خاطر 1832ء میں محصول درآمد برائے نام ایک آنہ فی پونڈ رہ گیا۔(76)"

مصنف کتاب حکومت خود اختیاری صفحہ 68 پر لکھتا ہے:

"ان واقعات سے عیاں ہے کہ انگلستان میں پہلے نہ صنعت تھی اور نہ

مشینیں تھیں اور نہ کاریگر ہوشیار تھے۔ جب ہندوستان سے مال غنیمت افراط سے گیا تب مشینیں تیار کی گئیں۔ اور کارخانے کھڑے کئے گئے مگر لطف یہ ہے کہ بے شمار سرمایہ اور عظیم الشان کارخانوں کے باوجود بھی ہندوستان کا مال انگلستان جا کر سستا بکتا رہا اور انگلستان کے تیار کردہ مال کو شکست دیتا رہا حتی کہ گورنمنٹ برطانیہ مجبور ہوئی کہ ہندوستان کے مال کو روکنے کے لیے انگلستان میں سخت سے سخت محصول لگائے جیسا کہ حسب ذیل تحریر سے ظاہر ہو گا۔

ایچ - ایچ - ولسن لکھتا ہے کہ " ایک شہادت کے دوران میں 1813ء میں یہ بیان کیا گیا تھا کہ ۔"ہندوستان کے بنے ہوئے سوتی اور ریشمی کپڑے اس وقت تک برطانیہ کے بازاروں میں ولایتی کپڑے سے ارزاں بکتے تھے ہندوستانی مال کی قیمت ولایتی مال سے پچاس سے لے کر ساٹھ فیصد تک کم ہوتی تھی مگر اس پر بھی ہندوستانی کپڑے کی تجارت میں فائدہ رہتا تھا۔ چنانچہ ضرورت ہوئی کہ انگریزی صنعت کو برباد ہونے سے بچایا جائے اور ہندوستانی کپڑے کی قیمت پر جبکہ وہ انگلستان میں داخل ہو ستر اور اسی فیصد محصول لگا دیا جائے یا اس کی درآمد قطعی بند کر دی جائے۔ یہ ہمت شکن محصول نہ لگتے اور سخت قانون نہ بنتے تو پیزلی اور مانچسٹر کے پتلی گھر شروع ہی میں بند ہو جاتے اور پھر دخانی انجنوں کی قوت سے بھی نہ چل سکتے۔ مگر ہندوستانی صنعت کو بھینٹ چڑھا کر انہیں زندہ رکھا گیا اگر ہندوستان آزاد ہوتا تو اس کا جواب دیتا اور برطانوی مال پر ایسے محصول لگاتا کہ پھر وہ مال نہ آ سکتا اور اس طرح اس کی صنعت تباہی سے بچ جاتی۔ لیکن اس کو اپنے تحفظ کی اجازت نہ دی گئی۔ وہ اغیار کے سامنے بے بس تھا۔ بغیر کسی محصول کے برطانوی مال اس کی بندرگاہوں پر زبردستی اتار دیا گیا۔ آخر کار جس حریف سے برابر کا مقابلہ کرنے کی مجال نہ تھی اس کو برطانوی کارخانہ دار نے ایک منصف حکومت کے ہاتھ سے حلال کرا دیا۔(77)"

صاحب معیشت الہند ص 706 میں لکھتا ہے

”اس سے قبل جابجا ذکر آچکا ہے کہ ہندوستان کا سوتی کپڑا قدیم زمانہ سے بہت مشہور اور بہت مقبول تھا اور دور دراز ممالک تک اس کی برآمد جاری تھی۔ قدیم تواریخ سے پتہ چلتا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام سے دو تین ہزار سال قبل بھی یہی کیفیت تھی کہ ہندوستان کا کپڑا بابل اور مصر اور بعد کو یونان و روم تک جاتا تھا۔ چنانچہ سرکار ہند اپنے گزیٹیر جلد سوم میں رقمطراز ہے کہ ڈھاکہ کی ململ یونان میں مشہور تھی اور آج سے دو ہزار سال قبل بھی سوتی پارچہ بافی کی صنعت ہندوستان میں خوب درجہ کمال کو پہنچی ہوئی تھی۔ قرون وسطیٰ میں اس صنعت کو اور بھی ترقی ہوئی اور اس کی تجارت انگلستان بلکہ تمام یورپ پر جس طرح چھا گئی اس کی مختصر کیفیت اوپر بیان ہو چکی ہے۔ جب انگلستان کا اونی اور ریشمی کپڑا ابھی ہندوستانی سوتی کپڑے کے سامنے گرد ہو گیا اور انگلستان کے پارچہ باف ہندوستانی پارچہ بافوں کے مقابلہ کی تاب نہ لاسکے اور عاجز ہو گئے تو سترہویں صدی کے ختم پر قانون کے زور سے ہندوستانی سوتی کپڑا انگلستان میں روکا گیا۔ حتیٰ کہ اس کی خرید و فروخت اور اس کا استعمال جرم قرار دیا گیا۔ یہ کیفیت اوپر درج ہو چکی ہے۔

چنانچہ پروفیسر لیکی اپنی مشہور تاریخ انگلستان میں لکھتے ہیں

> کہ سترہویں صدی کے آخر میں ہندوستان کے سستے اور خوش وضع سوتی کپڑے جو کالیکو کہلاتے تھے خاص کر ململیں اور چھینٹیں بمقدار کثیر انگلستان میں درآمد ہوتی تھیں اور ان کو ایسی مقبولیت حاصل ہوئی کہ اونی اور ریشمی پارچہ بافی کی صنعتیں بیکار ہو گئیں۔ بنا برآں پارلیمنٹ نے 1700ء اور 1721ء میں ایسے قانون نافذ کر دیئے جن کی رو سے ہندوستان کے رنگین اور پھولدار اور سوتی کپڑے یا اسی قسم کے دوسرے کپڑے جن میں ان کا جزو شامل ہو انگلستان میں ان کا استعمال خواہ لباس خواہ آرائشی سامان میں قطعاً ممنوع قرار دیا گیا۔ علیٰ ہذا مستند تواریخ سے واضح ہوتا ہے کہ اسی زمانے میں سوتی کپڑے کی صنعت شروع کی گئی۔ چنانچہ سرکار ہند نے بھی اپنے گزیٹیر جلد سوم میں تسلیم کیا ہے کہ سوتی پارچہ بافی کی صنعت انگلستان میں صرف سترہویں صدی سے شروع ہوئی۔ اس کے بعد اٹھارویں صدی میں کلیں ایجاد ہوئیں۔ دخانی انجن تیار ہوئے۔ کارخانے قائم ہوئے۔ صنعتی ترقی کا دور شروع ہوا

> اور ساتھ ہی ساتھ ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان میں ایسا بندوبست کر دیا کہ یہاں سے صرف سامان خام انگلستان کو برآمد ہو جو وہاں کی صنعتوں میں کام آئے اور وہاں کے مصنوعات یہاں درآمد ہو کر خوب کثرت سے فروخت ہوں۔ چنانچہ صنعت پارچہ بافی کا بھی یہی حشر ہوا کہ ہندوستان میں اس کا خاتمہ ہو گیا صرف روئی برآمد ہونے لگی۔ حتیٰ کہ مدت سے تمام ملک ولایتی کپڑے میں لپٹا نظر آتا ہے۔"

یہی نہیں ہوا کہ ہندوستان کی مصنوعات انگلستان بکثرت جاتی تھیں اور ان کو بھاری ٹیکسوں اور قانونی ممانعتوں کے ذریعہ سے روکا گیا۔ بلکہ دنیا کے دوسرے ملکوں کے بازاروں میں بھی یہ مصنوعات بڑی بڑی مقدار میں چھاپہ مارتی تھیں وہاں بھی انگریزوں کی دیکھا دیکھی اسی طرز عمل کو اختیار کیا گیا اور مامون تجارت کے حیلہ سے رکاوٹیں پیدا کرکے ہندوستانی مصنوعات کا داخلہ آہستہ آہستہ بند کر دیا گیا باوجودیکہ 1769ء سے ہندوستانی دستکاروں پر تشددات جاری کر دیئے گئے تھے۔ اور جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں ان کو دستکاری چھوڑ دینے اور صرف خام مال تیار کرنے پر مجبور کیا جانے لگا تھا۔ مگر تاہم 1830ء تک ہندوستانی مصنوعات دوسرے ممالک میں بھی بڑی بڑی مقدار میں تجارت کے لیے جاری رہتی تھیں جن کو اسی طرح کم کیا گیا۔

انگلستان میں 1803ء میں 4817 ہزار گٹھے کپڑوں کے گئے مگر...... کم ہوتے ہوتے 1829ء میں کل 433 گٹھے گئے۔

امریکہ میں 1801ء میں 13633 ہزار گٹھے گئے اور پھر کم ہوتے ہوتے 1829ء میں 258 گئے۔

ڈنمارک میں 1800ء میں 1457 گٹھے گئے مگر کم ہوتے ہوتے 1820ء میں 150 ہو گئے۔
پرتگال میں 1799ء میں 9714 ہزار گٹھے گئے مگر 1825ء میں 1000 رہ گئے عیرو فارس 1810ء میں 6000 ہزار گٹھے گئے مگر 1825ء میں 2000 گئے۔(78)

ان دوسرے ممالک میں ہندوستانی مصنوعات کی درآمد کی کمی بڑھانے کے اسباب میں جس طرح مامون تجارت کا ڈھونگ تھا اسی طرح ہندوستان میں مصنوعات کی کمی کی اور انگلستان کی مصنوعات کا کثرت سے داخلہ بھی تھا۔ ہندوستان کے مصنوعات کی کمی کی دل ہلا دینے والی داستان ہم پہلے بیان کر آئے ہیں۔ جس سے دستکاروں کو کاروبار سے معطل بلکہ

مفلوج بنا دیا اور ان کو مجبور کر دیا تھا کہ وہ دستکاری بالکل چھوڑ بیٹھیں یا ملک عدم سدھاریں۔

صاحب علم المعیشت لکھتا ہے ص 593

> "دوسرے ملک بھی ہندوستانی مصنوعات خصوصاً کپڑا بکثرت خریدتے تھے لیکن انگلستان کی طرح انہوں نے بھی اپنی اپنی صنعت و حرفت کو ترقی دینے کی خاطر بھاری محصول قائم کر کے درآمد روک دی یا اگر کچھ عرصہ کہیں درآمد جاری بھی رہی تو انگریزی تجارت نے اپنی مصنوعات کو وہاں بھرنا شروع کر دیا۔"

ہندوستان کی دستکاری اور تجارت کے برباد کرنے کا تیسرا طریقہ فری ٹریڈ (آزاد تجارت)

ہندوستان میں انگلستان کی مصنوعات کو جو کہ مشینوں اور کلوں کے ذریعہ سے تیار کی گئی تھیں۔ نہایت کثرت سے ٹھونسا گیا اور ان کی درآمد پر کوئی ٹیکس نہیں لگایا گیا اور اگر لگایا بھی گیا تو اس قدر کم لگایا گیا کہ اس سے دستکاروں کے ہاتھ سے بنائی ہوئی مصنوعات ارزاں نہیں ہو سکتی تھیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لاکھوں دستکار بھوک اور مسلسل فاقہ کشی کی وجہ سے ملک عدم کو چل بسے اور لاکھوں بلکہ کروڑوں دستکار صنائی چھوڑ کر زراعت یا دوسرے پیشوں پر مجبور ہو گئے اور بالجبریہ صنعتی اور زراعتی ملک محض زراعتی بنا دیا گیا۔

اصل واقعہ یہ ہے کہ جبکہ ہندوستانی مصنوعات ہندوستان سے بکثرت انگلستان میں جانے لگیں تو وہ اپنی نفاست اور خوش نمائی اور مضبوطی اور ارزانی (سستے پن) کی وجہ سے عام پبلک میں اس قدر مقبول ہوئیں کہ لوگوں نے عموماً وہاں کی بھدی اور مہنگی مصنوعات کو خریدنا چھوڑ دیا اور ہندوستانی مصنوعات نے انگلستان کی تمام منڈیوں پر قبضہ کر لیا۔ خصوصاً سوتی اور ریشمی کپڑوں نے تو اس قدر قبولیت حاصل کی کہ وہاں کے اونی کپڑوں کو (جو کہ وہاں بکثرت بنائے اور استعمال کئے جاتے تھے) کوئی پوچھتا بھی نہ تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں کے دستکار بھوکے مرنے لگے۔ دیسی دستکاری دم توڑنے لگی۔ انہوں نے انگلستان میں چاروں طرف شور غوغا مچایا حکومت کے مراکز پر اور کمپنی پر اور کمپنی کے

مخزنوں اور دفتروں پر بڑے بڑے ہجوم کئے گئے- پروٹسٹ کرنے والوں نے دھاوے کئے- مظاہرے عمل میں لائے گئے' سترہویں صدی کے آخری زمانہ میں صنعت و حرفت کی مختلف جماعتوں کی طرف سے پارلیمنٹ میں بے شمار محضر اور درخواستیں پیش ہوئیں سودیشی تحریک بڑے زور سے چلائی گئی چونکہ قومی حکومت تھی آزاد ملک تھا- بہت قوی اثر ہوا اور چاروں طرف یہی چرچے ہونے لگے کہ اپنے ملک اور اپنی قوم کی دستکاری اور تجارت کی حفاظت اور ان کی معاشی ترقی کی کوشش اور تدبیر از بس ضروری ہے- اگر ہندوستان کی مصنوعات کو بند نہ کیا گیا تو ہماری قوم بھوکی مرجائے گی اور ملک برباد ہو جائے گا اور چونکہ ہندوستانی مصنوعات کے بدلہ میں انگلستان سے صرف سونا اور چاندی جاتا ہے اس لیے دستکاری کی بربادی کے ساتھ ساتھ ملک کی دولت اور سرمایہ بھی نکل کر ملک کو انتہائی غربت اور افلاس میں مبتلا کر دے گا- اس لئے مامون تجارت کا فلسفہ گھڑا گیا (یعنی دوسرے ملکوں کی ارزاں پیداوار کی درآمد ٹیکس وغیرہ کے ذریعہ سے روک کر اپنے یہاں کی صنعت و حرفت کو ترقی دینے کی کوشش کرنا اور اگر کوئی چیز اپنے یہاں ارزاں پیدا نہ ہو سکے تو حکومت کی امداد سے اس کو ترقی دینا اور اس کی برآمد کا راستہ نکالنا تاکہ کچھ عرصہ میں اپنے ملک کی پیداوار بھی اسی قدر ارزاں ہو جائے اور خارجی پیداوار کے درآمد کی ضرورت نہ رہے) یہی امر عین انصاف اور انسانیت کی خدمت ہے اور یہی ہر ملک اور قوم کا فریضہ ہے اس پر بڑے بڑے لکچر دیئے گئے- مضامین لکھے گئے- پمفلٹ شائع کیے گئے- اخباروں میں آرٹیکل لکھے گئے- اگرچہ بعضے منصف مزاج اس کے مخالف بھی تھے اور تمام قوموں اور ملکوں کے ساتھ مساویانہ معاملہ کرنا اور بین الاقوام تجارتی آزادی کا جاری ہونا عین انصاف قرار دیتے تھے- فری ٹریڈ ان کا حصول تھا مگر وہ بہت ہی تھوڑے تھے مگر مامون تجارت کے پروپیگنڈا کرنے والے بہت زیادہ تھے بالا خر حکومت کے تمام ایوانوں میں یہی اثر غالب آیا اور قانوناً ایسی تمام کوششیں جاری ہوئیں- جن سے ہندوستان میں مصنوعات کم پڑ جائیں- دستکار اپنی دستکاری چھوڑ دیں ہندوستان کا بنا ہوا مال انگلستان آنا بند ہو جائے- انگلستان والے ہندوستان کے بنے ہوئے مال کو خریدنا اور استعمال کرنا چھوڑ دیں وغیرہ وغیرہ-

چنانچہ یہ سب امور عمل میں لائے گئے- جیسا کہ ہم نے اس کی معتبر متعدد شہادتیں پیش کر دی ہیں- جب یہ امور قوت کے ساتھ انگلستان والوں نے اختیار کرکے اپنی

مصنوعات بڑھالیں تو رفتہ رفتہ دوسرے ممالک نے بھی یہی طریقہ اختیار کیا اور تمام ترقی یافتہ ممالک میں مامون تجارت کا عمل جاری ہو گیا اور سبھوں نے نہ صرف ہندوستان ہی کی بلکہ تمام خارجہ ممالک کی مصنوعات کو اپنے اپنے یہاں قانونی رکاوٹیں پیدا کر کے روک دیا۔ انگریز تاجروں کی تجارت پر بہت بڑا اثر پڑا ادھر چونکہ ہندوستان کی لوٹ سے سرمایہ یعنی سونا اور چاندی، اشرفیاں اور روپے لاتعداد مقدار میں انگلستان پہنچ چکا تھا اس لیے بہت سرعت کے ساتھ دخانی اور مشینی کارخانے جابجا انگلستان میں بنائے گئے۔ مصنوعات نہایت افراط کے ساتھ تیار ہونے لگیں کارخانوں اور مخزنوں میں مصنوعات کے ایسے انبار لگ گئے جن کی کھپت انگلستان میں ممکن نہ تھی۔ اس لیے ضروری سمجھا گیا کہ مصنوعات کے لیے منڈیاں حاصل کی جائیں۔ یہ امر مامون تجارت کے فلسفہ کی موجودگی میں نہیں ہو سکتا تھا اس لیے اب وہ فلسفہ بدلا گیا اور جگہ جگہ فری ٹریڈ (آزاد تجارت) کا گیت گایا جانے لگا۔ آرٹیکل آزاد تجارت کے بکثرت لکھے گئے بڑی بڑی اور ضخیم کتابیں اور چھوٹے چھوٹے پمفلٹ اس کی خوبیوں اور محاسن کے تمام دنیا میں شائع ہونے لگے۔

جگہ جگہ فری ٹریڈ (آزاد تجارت) ہی کا لکچر دیا جانے لگا اور یہ کہا گیا کہ ہر ملک اور ہر قوم پر لازم ہے کہ اپنی اور غیر ممالک کی پیداوار میں کوئی فرق اور امتیاز نہ کرے۔ اگر کوئی چیز دوسرے ملک سے ارزاں دستیاب ہو سکے تو بلا تکلف اس کو منگائے ٹیکس قائم کر کے اس کی درآمد کو نہ روکے اور اگر کوئی چیز اپنے یہاں ارزاں پیدا نہ ہو سکے تو سرکاری امداد سے اس کو ترقی دینے اور اس کی برآمد کا راستہ نکالنے کی کوشش نہ کرے۔

حاصل یہ کہ کسی خاص اہتمام سے خارجی پیداوار کی درآمد بند نہ کرے اور نہ ملکی پیداوار کی برآمد بڑھائے۔ مگر ترقی یافتہ اور آزاد ممالک انگلستان کے فریب میں نہیں آئے اور مامون تجارت ہی کے فلسفہ کو حرزجان بنائے رہے۔ مگر انگریز ماتحت ممالک خصوصاً ہندوستان بے دست و پا تھے۔ ان کو ہاتھ پیر ہلانا اپنے آقاؤں کے خلاف ممکن ہی نہ تھا۔ ان پر خوب مشق کی گئی۔ ہر ہر منڈی میں انگریزی مال ٹھونسا گیا اور مصنوعات انگلشیہ کے انبار لگا دیئے گئے۔ ریلوے کے جاری کرنے اور ہر ہر منڈی تک پہنچانے کی انتہائی کوششیں کی گئیں اور ایسے ٹیکسز جن سے ہندوستان کی صنعت اور تجارت کا تحفظ اور تامین ہو سکے، یک قلم روک دیئے گئے۔

صاحب علم المعیشت صفحہ 584 میں لکھتا ہے۔

> "1813ء میں پارلیمنٹ نے پھر ہندوستان کے حالات کے متعلق تحقیقات جاری کیں اور جو انگریز ہندوستان رہ چکے تھے ان سے سوالات کر کے مفید معلومات حاصل کیں۔ یہ وہ نازک وقت تھا جبکہ نپولین نے انگلستان کی مصنوعات کی درآمد تمام یورپ کے ممالک میں بند کر رکھی تھیں۔ اور سامان فروخت نہ ہو سکنے کی حالت میں انگلستان کے صناع اور کارخانہ داروں کے برباد ہو جانے کا خطرہ لاحق تھا۔ انگریزی مصنوعات کی فروخت کی کوئی نہ کوئی سبیل نکالنی اشد ضروری تھی چنانچہ یہ خدمت ہندوستان کے سپرد ہوئی کہ وہ انگریزی سامان بکثرت خریدے۔ چونکہ یورپ کے ممالک میں جیسا کہ ہم ذکر کر چکے ہیں انگریزی مصنوعات کی درآمد بند تھی۔ انگریزی کارخانہ دار مال نہ بکنے سے بدحواس ہو رہے تھے۔ بالآخر ان کی نظر بھی ہندوستان ہی پر پڑی اور انہوں نے بہت شور واویلا مچا کر کمپنی کا ہندوستان سے تجارت کرنے کا جو اجارہ تھا اس کو تڑوا دیا اور اب ہندوستان سے تجارت کرنے کی اجازت عام ہو گئی۔"

صفحہ (575) میں لکھتا ہے۔

> "نمائشیں قائم کر کے اور ہندوستانی میلوں ٹھیلوں میں جا جا کر بڑے بڑے انگریز ولائتی چیزیں دکھاتے پھرتے تھے کہ لوگ ان کی خریداری پر مائل ہوں۔"

مسٹر ولسن ہندوستان کی تاریخ میں انگلستان اور ہندوستان کے تجارتی تعلقات پر لکھتا ہے۔

> "موجودہ طریق تجارت اس بے اتفاقی کی افسوسناک مثال ہے جو ہندوستان کے ساتھ وہ ملک برت رہا ہے جس کی اطاعت ہندوستان نے قبول کر لی ہے۔ 1813ء کی تحقیقات میں یہ بیان کیا گیا تھا کہ ہندوستان کے بنے ہوئے سوتی اور ریشمی کپڑے انگریزی کپڑوں سے پچاس ساٹھ کمتر نرخ پر ولایت کے بازاروں میں نفع کے ساتھ فروخت ہو سکتے تھے۔ چنانچہ مجبور ہو کر ہندوستانی کپڑوں کی درآمد پر ستر و اسی فیصد محصول قائم کر دیا۔ نیز بعض کی قطعاً ممانعت کر دی۔ اگر یہ طریق اختیار نہ کیا جاتا تو انگلستان میں کپڑے کے کارخانے بند ہو جاتے بلکہ کلوں کے زور سے

> ان کا بعد کو چلنا دشوار ہو جاتا۔ لیکن ہندوستان کو دبا دبا کر ولایت کے کارخانوں کو ترقی دی گئی کاش اگر ہندوستان کا بس چلتا تو وہ بھی بدلہ لیتا۔ انگریزی مصنوعات کی درآمد پر بھاری بھاری محصول لگا کر ان کو ملک میں آنے سے روکتا اور اپنی صنعت و حرفت کے میدان کو بچاتا۔ لیکن اس کو اپنی حفاظت کرنے کا اختیار نہ تھا وہ غیروں کی اجازت کا محتاج تھا۔ انگریزی مال تو کوئی محصول درآمد لیے بغیر ہندوستان میں ٹھونسا گیا اور ہندوستانی مال کی درآمد ولایت میں روک دی گئی۔ اور پھر بھی چونکہ ہندوستان سے مقابلہ دشوار نظر آتا تھا رقابت کے جوش میں حکومت کے اختیارات سے اپنے مفید مطلب اور ہندوستان کے خلاف کام لیا جاتا رہا۔ (79)

مانٹ گوری مارٹن جس نے ہندوستان کے متعلق 1838ء میں رپورٹ شائع کی تھی لکھتا ہے۔

> ''اس کتاب کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اضلاع زیر بحث میں کس قدر لوگ پارچہ بافی پر اپنی گزران کرتے تھے اور اس میں کیسے ماہر اور کامل تھے۔ لیکن تجارت آزاد کے بہانہ سے انگلستان ہندوستانیوں کو لنکا شائر یارک شائر اور گلاسکو کی کلوں کے بنے ہوئے کپڑے خریدنے پر مجبور کر رہا ہے اور بنگال و بہار کے دستی بنے ہوئے کپڑے کیسے مضبوط اور کیسے خوشنما بھاری بھاری محصول درآمد قائم کرکے اپنے یہاں آنے سے روکتا ہے۔ یہاں ایک نکتہ یہ بھی بتانے کے قابل ہے کہ اول اول جبکہ انگلستان کی صنعت و حرفت بمقابلہ ہندوستان کے پس ماندہ حالت میں تھی تو ہندوستانی مصنوعات کو بھاری محصول درآمد کے ذریعہ سے صرف انگلستان میں جانے سے روکا جاتا۔ یہی انگریزی تاجر ہندوستانی مصنوعات دیگر ممالک میں لے جا کر فروخت کرتے تھے اور تجارت ...سے نفع اٹھاتے تھے مگر اپنے ملک میں صنعت و حرفت کی ترقی کی تجارت کے نفع پر ترجیح دیتے اور ہندوستانی ارزاں مال کی بجائے ملک کا گراں مال خریدنا بہتر سمجھتے تھے جب اول اول اس تامین کی آڑ میں بعدہ کلوں کی

> ایجادات سائنس کی تحقیقات اور تعلیم عامہ کی بدولت اپنے یہاں کی صنعت خوب ترقی کر چکی تو دیگر ممالک میں بھی انگریزی مصنوعات پھیلانی شروع کیں۔ علاوہ ازیں یورپ کے دیگر ممالک اور امریکہ نے بھی اپنی اپنی صنعت و حرفت پھیلانے کی خاطر انگلستان کی دیکھا دیکھی ہندوستانی مصنوعات کے ساتھ ویسا برتاؤ شروع کیا۔ یعنی بھاری محصول قائم کرکے ان کی درآمد روک دی۔ انگلستان کی طرح انہوں نے اپنی کلوں کی ایجادات اور سائنس کی تحقیقات میں پوری کوشش کی۔ عوام میں تعلیم پھیلائی اور بہت جلد ان کی معاشی حالت بھی روبہ ترقی ہوتی گئی لیکن ہندوستان نہ صرف ایجادات اور سائنس کی تحقیقات اور تعلیم عامہ کی برکت سے محروم رہا بلکہ اس کے ان پڑھ مگر اپنے فن کے بڑے بڑے کامل صناع کو اپنے کاروبار میں تباہ کن مزاحمتیں پیش آئیں نہ صرف دیگر ممالک نے ہندوستانی مصنوعات کی درآمد روک دی بلکہ اس کے برعکس بلا تحاشا اپنی مصنوعات لا لا کر ہندوستان میں انبار لگانے شروع کیے۔ اور اس طرح پر کچھ عرصہ میں ہندوستانی مصنوعات نہ صرف دیگر ممالک سے خارج ہو گئیں بلکہ خود اپنے ملک میں بھی ان کو پناہ نہ مل سکی اور عارضی بندشوں میں ناموافق حالات میں گھر کر بے کس اور کار رفتہ ہو گئیں۔ صرف زراعت اور پیداوار خام کی باہم رسانی اس کے ذمہ ڈال دی گئی۔ صنعت و حرفت کی خاص برکات میں اس کا کوئی حصہ نہیں رہا۔(80)

خلاصہ یہ کہ اس آزاد تجارت کے ڈھونگ اور حکومت کے زور سے ہندوستان کے ہر ہر شہر اور قصبہ اور گاؤں میں انگریزی مصنوعات کے انبار لگا دیئے گئے اور بیرون ہند کے اموال میں ڈیوٹی بندروں کے کسٹموں پر کم سے کم کر دی گئی۔ اور اگر کہیں محصول درآمد کچھ زائد حکومت نے مقامی ضرورتوں کی بناء پر بڑھایا تو شور مچا کر مقامی حکام کو اس قدر ڈرایا گیا کہ وہ مجبور ہو کر ڈیوٹی کے کم کرنے پر مضطرب ہو گئے جس کی تفصیل ہم عنقریب پیش کریں گے۔ دوسرا یہ ڈھونگ عمل میں لایا گیا کہ ہندوستان کی مصنوعات پر بھی اتنا محصول ضرور لگانا چاہیے جتنا کہ انگلستان کی مصنوعات پر لگایا جاتا ہے تاکہ ہندوستان کی

مصنوعات انگلستان کی مصنوعات سے سستی نہ ہوں۔ ورنہ تجارت آزاد نہ رہے گی بلکہ تجارت مامون ہو جائے گی۔ صاحب علم المعیشت ص 595 میں لکھتا ہے۔

> "باوجود ہزار پس ماندگی کے جب سوتی کپڑا بننے والے کارخانے کلکتہ بمبئی جیسے مقامات میں ابھرنے لگے اور بتدریج کپڑے کی ملیں جاری ہو چلیں۔ تو انگلستان کے کارخانہ داروں کو فکر دامن گیر ہوئی کہ کہیں یہ پرانا رقیب پھر سر نہ اٹھائے اور بنا بنایا کام بگاڑ دے ساڑھے تین فیصد محصول درآمد جو انگریزی کپڑے پر ہندوستان میں ادا کیا جاتا ہے اور جس کی مجموعی تعداد اب سرکار ہند کی کل آمدنی کا (15) فیصد حصہ ہے اس سے بچنا تو آسان نہ تھا پس انگریزی کارخانہ داروں نے شور مچانا شروع کر دیا کہ یہ محصول درآمد یعنی ساڑھے تین فیصد محصول مال نہیں بلکہ محصول تامین ہے۔ یعنی اس سے ہندوستانی کارخانہ داروں کو امان ملتی ہے اور اس میں نہ صرف انگریزی کارخانوں کا نقصان ہے بلکہ ایسا محصول انگلستان کے قومی طریق تجارت آزاد کے منافی ہے۔ پس اگر محصول در آمد مالی نقصان کے خوف سے ترک نہیں کیا جا سکتا تو ہندوستانی کارخانوں پر بھی بقدر ساڑھے تین فیصد محصول پیداوار قائم کر دینا چاہیے تاکہ ان کو انگریزی کارخانوں پر موجودہ فوقیت حاصل نہ رہے۔ سب جانتے ہیں کہ انگلستان میں لنکا شائر اور مانچسٹر کے کارخانہ داروں کا حکومت میں رسوخ بہت قوی ہے۔ ان کے اثر میں اس قدر ووٹ ہیں کہ زبردست سے زبردست وزارت بھی ان سے بے اعتنائی کرنے کی جرات کم کر سکتی ہے۔"

اس خود غرضی اور ناانصافی کی اگرچہ بعض انصاف پسند انگریزوں نے مخالفت بھی کی مگر کچھ فائدہ نہ ہوا اور اگرچہ کچھ عرصہ تک محصول درآمد ساڑھے تین فیصد انگلستانی مال سے اٹھا بھی دیا گیا مگر مقامی مصارف کی وجہ سے ۔ آخر 1896ء میں لارڈ ایلجن کے زمانہ میں ایک ایکٹ پاس ہوا۔ جس کی دفعہ 6 کی رو سے ایسے کل سوتی کپڑے پر جو ہندوستانی کارخانوں میں تیار ہو ساڑھے تین فیصد محصول پیداوار اسی طرح قائم کر دیا گیا جس طرح سے انگلستان کے کارخانہ دار ہندوستان میں ساڑھے تین فیصد دیتے تھے۔ یہ ایکٹ اخیر تک

جاری رہا۔ یہ **محصول** ملکی صنعتوں پر انتہائی بے انصافی پر مبنی تھا۔ مگر قوت کے سامنے کمزور کی کیا چل سکتی ہے۔ ہندوستانیوں کا شور مچانا بالکل بے کار گیا۔ **محصول** درآمد بعد میں بیرونی ممالک سے آنے والے اموال پر ضروریات جنگ وغیرہ کی وجہ سے اگرچہ بڑھایا گیا اور 5 فیصد سے ساڑھے سات **فیصد** تک کر دیا گیا۔ مگر سوتی مصنوعات پر کارخانہ داران لنکا شائر و مانچسٹر وغیرہ کے خوف سے زمانہ جنگ میں بھی زیادہ نہیں کیا گیا بلکہ ساڑھے تین فیصد ہی رکھا گیا۔ جس کا اقرار خود سر ولیم میر ممبر مال 1916ء میں اپنی تقریر میں کرتے ہیں۔(181)

خلاصہ یہ کہ تامین تجارت کی غرض سے انگلستان نے پہلے ہندوستانی مصنوعات پر 80 فیصد اور اس سے بھی زیادہ **محصول** لگا کر پھر قطعی ممانعت کر کے مہذب ڈاکہ ڈالا تھا اور پھر جب ملوں اور کارخانوں کی پیداوار بہت زیادہ ہو گئی۔ اور دوسرے ممالک میں ان کی کھپت نہیں ہو سکی تو آزاد تجارت کے ڈھونگ سے ہندوستان میں اپنی مصنوعات ٹھونسنے کی غرض سے **محصول** درآمد کم کر کے ہندوستان کو مجبور کر دیا جس سے وہ خام مال تیار کرنے پر بے دست و پا ہو گیا۔ اور دستکاری سے ہاتھ دھو بیٹھا۔

مسٹر مانٹ گومری مارٹن تاریخ نو آبادیات برطانیہ میں لکھتا ہے۔

> "ہم نے ربع صدی کے دوران میں ہندوستانی علاقوں کو اپنی مصنوعات کے خریدنے پر مجبور کیا۔ اس طریقہ پر کہ ہمارے اونی مال پر ہندوستان میں کوئی **محصول** نہیں لیا جاتا تھا۔ سوتی مال پر ڈھائی **فیصد محصول** تھا اور اسی نسبت سے دیگر اشیاء پر **محصول** لگایا گیا تھا درآں حالیکہ اسی زمانہ میں ہندوستان کے بنے ہوئے مال پر ہم انگلستان میں ایسے سخت **محصول** لگاتے رہے کہ ہندوستانی مال کی درآمد بند ہو جائے۔ بالفاظ دیگر اس **محصول** کی مختلف شروح 10 - 20 - 30 - 50 - 100 - 500 اور 1000 **فیصد** تک ان اشیاء پر لگائی گئی تھیں جو ہمارے ہندوستانی مقبوضات کی بنی ہوئی ہوں۔ اس لیے ہندوستان کے ساتھ آزاد تجارت تھی نہ کہ ہندوستان کے اس مال کی جو انگلستان بھیجا جائے۔ سورت، ڈھاکہ، مرشد آباد، و دیگر مقامات کی (جہاں دیسی صنعتیں عروج پر تھیں) بربادی کی داستان بیان کرنا حد درجہ دلخراش ہے۔ میری رائے میں یہ بربادی ایمانداری کے ساتھ تجارت کو ترقی دینے کی وجہ پر مبنی نہ تھی

> بلکہ میرا خیال یہ ہے کہ وہ ایک زبردست طاقت تھی جس کے ذریعہ سے کمزور کو دبایا جا رہا تھا-(82)"

1925ء کی تفصیل لکھتا ہوا صاحب معیشت الہند ص 725 پر- (برآمد اور درآمد مال کی تفصیل کے بعد لکھتا ہے-

مندرجہ بالا اعدادو شمار سے واضح ہو گا کہ ہندوستان کا جس قدر مال و سامان برآمد ہوا اس میں تقریبا اسی فیصد سامان خام تھا جس میں تقریبا تیس فیصد سامان خوراک شامل تھا یہ بیشتر زرعی پیداوار پر مشتمل تھا- مثلا روئی 17 فیصد جوٹ ساڑھے بارہ فیصد' چاول 11 فیصد' روغن دار تخم 10 فیصد چاء 6 فیصد' گندم ساڑھے 6 فیصد' خام چمڑا کچھ کم 5 فیصد رہے ہندوستان کے مصنوعات سو ان کی برآمد کا اوسط 20 فیصد سے بھی کم نظر آتا ہے اوران میں صرف دو قابل لحاظ ہیں اول جوٹ کا ٹاٹ اور بورے جن کا اوسط 5 فیصد ہے-"

پھر لکھتا ہے-

> "حاصل کلام یہ کہ ہندوستان میں اسی فیصد مصنوعات درآمد ہوئے اور یہاں سے اسی فیصد سامان خام برآمد ہوا جس سے صاف ظاہر ہے کہ ہندوستان سراسر زراعتی ملک بن گیا ہے اوراب بھی یہاں سرکار کی تمام تر کوشش یہی نظر آتی ہے کہ زراعت کو ترقی دی جائے- صنعت و حرفت یوں ہی پس ماندہ رہے- دوسرے اس کی طرف سرکار کا التفات بھی مقابلتا بہت کم ملتا ہے- البتہ لوگ اپنی ہمت سے تھوڑا بہت کام چلا رہے ہیں-"

غرض کہ ہندوستان جو کہ بقول ڈاکٹر فرانسس بکانن و دیگر مورخین ایک صنعتی اور تجارتی ملک تھا جس میں کروڑوں انسان ان دونوں پیشوں سے زندگی بسر کرتے اور بیرونی ممالک سے کروڑوں اشرفیاں حاصل کرتے تھے- انگریزوں کی ڈپلومیسی اور خود غرضی سے محض زراعتی ملک بنا دیا گیا-

مسٹر ہنری سینٹ جارج ٹکر (ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائرکٹر) 1821ء میں لکھتے ہیں-

> "ہندوستان پہلے صنعت و حرفت کا ملک تھا اب زراعت پیشہ بنا دیا گیا ہے-"

یہی جارج ٹکر صاحب دوسری جگہ تحریر فرماتے ہیں-

> "ہم نے ہندوستان کے ساتھ کیسے تعلقات قائم کر رکھے ہیں اس کے ریشمی کپڑے اور نیز وہ کپڑے جو سوت اور ریشم سے مل کر بنے جاتے ہیں کچھ روز سے ہمارے بازاروں سے خارج کر دیئے گئے ہیں اور حال میں کچھ تو (67) فیصد محصول درآمد کی بدولت اور کچھ کلوں کی بدولت سوتی کپڑے جو کہ ہندوستان میں بکثرت تیار ہوتے تھے نہ صرف اس ملک میں آنے بند ہو گئے۔ بلکہ ہم الٹے انگلستان سے سوتی کپڑے اپنے ایشیائی مقبوضات میں بھیجنے لگے ہیں اور اس طرح ہندوستان تجارتی ملک سے تنزل کرکے اب محض زراعتی ملک رہ گیا۔"(83)

مسٹر انڈریو سیم 1841ء میں سیمور کمیٹی کے سامنے شہادت دیتے ہوئے کہتا ہے۔

> "چونکہ ہندوستانیوں پر اور آمدنیوں کے دروازے بند کر دیئے گئے اس واسطے وہ زراعت کی طرف متوجہ ہو گئے۔"(84)

ہم پہلے سرجان شور کا قول ذکر چکے ہیں وہ 1833ء میں کہتا ہے۔

> "برطانیہ نے جو طرز حکومت قائم کیا ہے اس کے تحت ملک اور باشندگان ملک رفتہ رفتہ محتاج ہوتے چلے جاتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان پرانے تاجروں پر جلد تباہی آگئی۔

وہ ہندوستان جس کی تجارت کے متعلق کپتان الگزنڈر ہملٹن اپنے سفرنامہ میں لکھتا ہے۔

> "اس میں شک نہیں کہ اورنگ زیب کے زمانہ میں ہندوستان کی تجارت کا مقابلہ یورپ کے بڑے بڑے ممالک بھی نہیں کر سکتے تھے۔ اسی تجارت و مال کی درآمد و برآمد کا یہ نتیجہ تھا کہ صرف شہر سورت میں چنگی کی آمدنی تیرہ لاکھ روپیہ سالانہ ہوتی تھی۔ اور احمد آباد میں ایک کروڑ تیس لاکھ روپیہ سالانہ چنگی کی آمدنی تھی۔(85)"

> " بنگال میں صرف دریائے ہگلی سے 50 یا 60 جہاز مال سے بھرے ہوئے سالانہ تجارت کے لیے بیرون ہند بھیجے جاتے تھے(86)"۔

> "تمام ساحل ہند پر ہندوستانیوں کے بڑے بڑے جہاز تجارتی مال سے لدے ہوئے چلتے پھرتے نظر آرہے ہیں۔(87)"

> "احمد آباد دولت ثروت اور عظمت میں یورپ کے بڑے بڑے شہروں

سے کچھ ہی کم ہو گا۔ صرف شہر سورت کی آمدنی ایک لاکھ باسٹھ ہزار پانچ سو پونڈ ہے اور احمد آباد کی آمدنی اس سے دس گنی ہے۔ (88)”

دستکاری اور تجارت کی بربادی کے نتائج

ہندوستانی دستکاری اور تجارت کے برباد ہونے کی وجہ سے دست کار اور تاجر لوگوں کے اندر انتہائی افلاس جاگزیں ہو گیا۔ کروڑوں آدمی بھوک سے مر گئے۔ یہی وجہ ہے کہ 1800ء سے 1900ء تک ایک صدی کے اندر ہندوستان میں 31 قحط واقع ہوئے اور چار کروڑ سے زیادہ نفوس موت کی نذر ہو گئے (جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں) لاکھوں نفوس اخلاقی جرائم ڈاکہ اور چوری وغیرہ میں مبتلا ہو گئے اور کروڑوں نفوس زراعت پر گزران کرنے لگے۔ دستکاری روز بروز کم ہوتی گئی اور زراعت پیشہ بڑھنے لگے۔ ڈاکٹر فرانسس بکانن کے زمانہ تحقیقات میں دستکاری کرنے والوں کی تعداد تقریباً پچاس فیصد تھی صناعت پیشہ کاشتکاروں سے کم نہ تھے۔ مگر 1928ء میں گھٹتے گھٹتے (10 ‘ 7) فیصد رہ گئے بالعکس کاشتکاری کرنے والوں کی تعداد روز بروز بڑھتی گئی 1918ء میں ان کی تعداد (61) فیصد بڑھ گئی حالانکہ ڈاکٹر فرانسس بکانن کے زمانہ میں 1921ء میں (72) فیصد تک پہنچ گئی۔ نقشہ ذیل ملاحظہ ہو۔

1901ء میں صنعت پر گزارہ کرنے والوں کی تعداد کا اوسط (4 ‘ 6) ہے یعنی ہندوستان کی کل آبادی میں 15 ‘ 5 کروڑ

1911ء میں	(3.5) یعنی	11.1 کروڑ
1921ء میں	(3.31)	10.3 〃
1931ء میں	(3.39)	(9.7) 〃

(89)

جس کی بناء پر قابل زراعت زمینیں کمیاب ہو گئیں کیونکہ زراعت کی طرف چاروں طرف سے لوگوں نے ہجوم کر دیا۔ مویشیوں کے لیے چارہ دستیاب ہونا بند ہو گیا جنگل کاٹ ڈالے گئے ایندھن کی قلت اور سخت گرانی ہو گئی۔ زمینیں کمزور ہو گئیں۔ کیونکہ زمین قوت اگانے کی متواتر زراعت کی وجہ سے کھو بیٹھی۔ جس طرح مزدور متواتر محنت کی وجہ

سے کمزور ہو جاتا ہے۔ اس طرح زمین بھی متواتر کاشت کی وجہ سے کمزور ہو جاتی ہے۔ پہلے زمانہ میں ہر گاؤں میں کچھ حصہ کاشت سے علیحدہ رکھا جاتا تھا جس میں مویشی چرا کرتے تھے اور زمین میں طاقت کاشت پیدا ہو جاتی تھی دوسرے سال میں گاؤں کی دوسری زمین خالی رکھی جاتی تھی۔ متواتر کاشت کا اثر یہ ہوا کہ پیداوار روز بروز گھٹنے لگی۔ آئین اکبری کو دیکھئے اس زمانہ میں جو پیداوار فی ایکٹر تھی آج اس کا آدھا تہائی بھی پیدا نہیں ہوتا۔ روز بروز گرانی غلہ کی بڑھتی جاتی کیونکہ پیداوار بہت کم ہے۔ بڑے بڑے شہر اجڑ گئے۔ دیہاتی آبادی بڑھ گئی کیونکہ زراعت کے لیے مزارع کے قریب رہنا ضروری ہے۔ دیہاتی زندگی کی وجہ سے جہالت بڑھ گئی کیونکہ دیہات میں تعلیمی انتظام نہیں ہو سکتا۔

مذکورہ بالا اعداد و شمار سے بخوبی ظاہر ہوتا ہے کہ انگریزوں نے ہندوستان کی دولت اور تمام ذرائع دولت، دستکاری، تجارت، زراعت سبھوں پر ایسا چھاپہ مارا کہ جس کی نظیر نہ سابقہ زمانوں میں کہیں ملتی ہے اور نہ موجودہ زمانہ میں کسی دوسری قوم اور ملک میں کہیں دکھائی دیتی ہے۔ بلکہ تعجب ہے کہ ان امور کے ہوتے ہوئے ہندوستان زندہ کیسے رہا۔

پچھلے زمانہ میں ظالم حکومتیں چھاپہ مارتیں اور لوٹتی تھیں مگر سرمایہ داروں پر ہی ان کا دست ظلم دراز ہوتا تھا۔ بخلاف انگریزوں کے کہ انہوں نے نہ کسی امیر کو چھوڑا نہ کسی غریب کو بلکہ ان ملعونہ پالیسیوں سے غریب طبقہ نہایت زیادہ برباد ہوا۔ گزشتہ شہادتیں ہندوستانیوں کے افلاس اور بھوک سے مرنے کی ان امور کے ملاحظہ سے آفتاب کی طرح روشن ہو جاتی ہیں اور یقین کیا جا سکتا ہے کہ وہ مبالغہ سے بالکل خالی ہیں اور بالکل واقعی ہیں۔ انگریزوں کا ان پر پردہ ڈالنا بالکل غلط ہے۔

(ولی اللہ المشتکی)

انگریز کے ہاتھوں ہندوستانیوں کی اخلاقی بربادی

اخلاقی بربادی کی چند وجوہات

اول یہ کہ ابتداء میں جن انگریزوں کی آمد شد اور جن کے ہاتھ میں اقتدار کی باگ کی ما لکیت تھی وہ اصل سے ایسے ہی ذلیل و خوار اخلاق والے تھے۔ اور اکثر ایسے لوگ بھی تھے جو کہ یہاں آکر ایسے ہی بد ترین اخلاق و اعمال قصدا اختیار کر لیتے تھے۔ کمپنی کے ذمہ دار لوگ ایسوں ہی کو اپنی اغراض کے لیے چنا کرتے تھے۔ چنانچہ مدراس کے بڑے پادری صاحب نے 1676ء میں کمپنی کے ڈائرکٹروں کو مندرجہ ذیل الفاظ لکھے تھے۔

> ”آپ کے ملازموں کی بداعمالیوں سے ہندوستانیوں کی نظروں میں آپ کے خدا کی جتنی بے عزتی ہوتی ہے اور آپ کا مذہب جتنا بدنام ہو رہا ہے اس کی کیفیت اگر آپ کو معلوم ہو جائے تو آپ کے آنسوؤں کی ندیاں بہہ جائیں جولوگ آتے ہیں ان میں بعض تو قاتل ہیں۔ بعض آدمیوں کو بھگا لے جانے کا کام کرتے ہیں اور بعض انگلستان میں بیویاں چھوڑ کر آتے ہیں اور یہاں پھر شادیاں کر لیتے ہیں۔(90)

1600ء میں جبکہ کمپنی نے ہندوستان میں تجارت کرنے کی اجازت حاصل کرنے کے لیے گورنمنٹ انگلستان کو درخواست دے رکھی تھی اور منظوری کا مسئلہ زیر غور تھا تب گورنمنٹ کی طرف سے کمپنی والوں کو لکھا گیا تھا کہ تم اپنی مہم میں سر ایڈورڈ مائیکل بورون کو نوکر رکھ لو تو اس کے جواب میں کمپنی کا عجیب و غریب حسب ذیل ریزولیوشن بھیجا گیا۔

> ”کسی ذمہ داری کے کام پر جنٹلمین کو نہ رکھا جائے اور گورنمنٹ سے درخواست کی جائے کہ ہمیں اپنے کاروبار کے لیے اپنے ہی قسم کے لوگوں کا انتخاب کرنے کی اجازت دی جائے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ شرفاء کو نوکر رکھنے سے (کمپنی کے) عوام الناس (حصہ دار) شبہ میں پڑ کر روپیہ واپس لینے لگیں۔(91)“

مذکورہ بالا شہادتوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ انگلستان کے چھٹے ہوئے بدمعاش بدکار

غنڈے اور لوفر جرائم پیشہ لوگ ہندوستان بھیجے جاتے تھے۔ ایسے لوگوں کے اقتدار اور ان کی کثرت سے جو کچھ نتائج قبیحہ پیدا ہوں گے وہ ظاہر و باہر ہیں۔ علاوہ ازیں جو انگریز انگلستان میں جرائم پیشہ نہیں بھی تھے۔ ان لوگوں کی صحبت اور مالدار بننے کی شدت حرص اور طمع اور سزا سے بے خوفی کی بناء پر یہاں بدترین جرائم پیشہ بن جاتے تھے۔ وارن ہسٹنگز (جو کہ ہندوستان کا مشہور گورنر اور ہندوستان میں برطانوی سلطنت کی بنیاد رکھنے والوں میں سے نمبر اول شمار کیا جاتا ہے) کہتا ہے۔

> "انگریز ہندوستان میں آ کر بالکل نیا انسان بن جاتا ہے۔ جن جرائم کی وہ اپنے ملک میں کبھی جرات کر ہی نہیں سکتا ہندوستان میں ان کے ارتکاب کے واسطے انگریز کا نام جواز کا حکم رکھتا ہے اور اس کو سزا کا خیال تک نہیں ہو سکتا۔(92)"
>
> یہ ہسٹنگز صاحب وہی ہیں جنہوں نے انتہائی وحشت اور بربریت سے روہیلہ قوم اور ان کی حکومت کو محض تھوڑے سے لالچ میں نواب اودھ سے ساز باز کر کے برباد کر ڈالا۔ جن کی ملعون بداعمالیاں کا پول اس مقدمہ کی مسل سے کھلتا ہے جو ان پر انگلستان میں قائم کیا گیا تھا مگر ایسے وحشی درندے بھی اس زمانہ کے انگریزوں کی بداعمالیوں کے شاکی ہیں۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ کیسے کیسے لوگ یہاں آئے اور انہوں نے کیسی کیسی زہریلی گیس ہندوستان میں پھیلائی تامس سڈ ہنسم کہتا ہے۔
>
> "میں ہمیشہ سے دیکھتا ہوں کہ بمقابلہ اور قوموں کے انگریز غیر ممالک میں سب سے زیادہ چیرہ دستی کرتے ہیں اور ہندوستان میں بھی یہی واقعہ پیش آ رہا ہے۔(93)"

ہسپانیوں وغیرہ کے شرمناک مظالم امریکہ وغیرہ میں تو مشہور ہیں ہی مگر اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر انگریزوں نے جو مظالم اور ملعون بداعمالیوں ہندوستان میں کی ہیں وہ ڈچوں، پرتگیزوں، ہسپانیوں وغیرہ کے مظالم سے بدرجہا زائد اور ننگ انسانیت تھے اور ان کا کریکٹر سب سے زیادہ گرا ہوا تھا۔ ایسے کیرکٹر والوں کی وجہ سے جو کچھ بربادی اخلاق و اعمال کی اور جس قدر ان کی وجہ سے ملک کی ابتری پیدا ہو وہ ظاہر باہر ہے۔

ان بداعمال اور بد اخلاق نجس کیرکٹر والے انگریزوں نے حسب طبع اپنے گرد اگرد

ایسے ہی جرائم پیشہ بد اطوار لوگوں کو جمع کر لیا اور ان کے ذریعہ سے لوٹ' مار غارت گری اور انسانیت سوز مظالم کا بازار گرم کر دیا۔

کند ہم جنس باہم جنس پرواز　　کبوتر با کبوتر باز با باز

مسٹری ہل کہتا ہے۔

> "جس زمانہ میں کمپنی کی ملازمت محض تجارتی تھی اور کمپنی کے ملازمان ملک کے حالات سے ناواقف تھے تو اکثر چھوٹے ملازموں سے جو بنئے کہلاتے تھے کام لیا کرتے تھے۔(94)"

مسٹر برک ان بنیوں کے متعلق مندرجہ ذیل کلمات لکھتا ہے۔

> بنیا یا دیوان انگریز کے گھر کا منتظم ہوتا ہے۔ وہ ان تمام چال بازیوں فریب اور عیاریوں سے واقف ہوتا ہے جو مظالم کی سزا سے بچنے کے لیے ایک غلام استعمال کرتا ہے۔ بنیا لوٹتا ہے۔ استحصال بالجبر کرتا ہے۔ غارت گری کرتا ہے اور پھر اس میں سے جس قدر مناسب سمجھتا ہے اپنے صاحب کو بھی دے دیتا ہے۔ ان بنیوں نے بڑے بڑے گھر الٹ دیئے ہیں ملک کو برباد کر دیا ہے اور سرکاری مالگزاری کو سخت نقصان پہنچایا ہے۔"

خود حکام وقت (انگریز) ان کے ذریعہ سے ذاتی نفع حاصل کرتے تھے۔ چنانچہ بہت سے علاقے بنیوں کے نام ٹھیکے پر دیئے جاتے تھے۔ لیکن اصلی ٹھیکہ دار کوئی بااختیار انگریز ہوتا تھا جو خود پردہ میں رہتا تھا۔ چنانچہ انہیں انگریز ٹھیکہ داروں کی بدولت پرانے پرانے شریف اور خاندانی ہندو اور مسلمان اپنی اپنی زمینداریوں سے جبرا اور ملک کے دستور کے خلاف بے دخل اور محروم کر دیئے گئے۔

اس وقت کے قانون کی رو سے ایک شخص کو ایک لاکھ سے زیادہ مال گزاری کا ٹھیکہ دینا جائز نہ تھا مگر بڑے بڑے صاحب لوگوں کے بنئے قانون سے آزاد تھے۔ خود وارن ہسٹنگز گورنر جنرل کا بنیا کنتو بابو تیرہ لاکھ کا ٹھیکہ دار تھا۔(95)

ایک دوسرا بنیا گنگا گوبند بھی وارن ہسٹنگز کا آلہ کار تھا اور اس کی نسبت دارالعوام میں جولائی 1785ء میں ایک حساب دکھایا گیا تھا جس کی رو سے گنگا گوبند سنگھ کی کمائی تین کروڑ بیس لاکھ روپے کے قریب پہنچتی تھی۔(96)

اسی گورنر کے دیوان رام چند کی نسبت بیان کیا گیا تھا کہ وہ ساٹھ روپے ماہوار کا

ملازم تھا مگر اس نے ساڑھے بارہ کروڑ کے قریب ترکہ چھوڑا- کمپنی کے ایجنٹ روپ کشن کے پاس اتنی دولت تھی کہ اس نے ماں کے مرنے پر نوے لاکھ روپیہ صرف کیا- یہی وہ بنئے تھے جن کو خاک سے اٹھا کر انگریزوں نے آسمان پر پہنچا دیا- پہلے ٹھیکوں کے ذریعہ بڑی جائدادوں پر قابض ہوئے اور پھر دوامی بندوبست کے بعد مالک بن گئے- آگے چل کر سود وغیرہ محدود کر دیا گیا- اور قرضوں میں آراضیاں اور جائدادیں نیلام ہونے کا قانون نافذ کیا گیا- ان قوانین سے قدیم شریفوں اور سیٹھوں کے گھرانے برباد ہو گئے اور بڑے بڑے علاقے ان نئے سرمایہ داروں کے ہاتھ میں پہنچ گئے پرانے زمینداروں پر ان بنیوں نے جو جو ظلم کئے اور جن جن فریبوں کے ساتھ انہیں لوٹا اس کا اندازہ صرف دیبی سنگھ کی مثال سے ہو سکتا ہے دیبی سنگھ بھی کلکتہ کی حکومت کے محبوب بنیوں میں سے تھا چنانچہ بنگال کے بڑے بڑے علاقے اسی کو ٹھیکہ پر دیئے گئے تھے- دیبی سنگھ آبرودار لوگوں کو ہتھکڑیاں پہنا کر حوالات میں رکھتا اور اضافہ کا اقرار کراتا تھا اس نے مال گزاری کے علاوہ نئے نئے محصول اور ابواب ایجاد کر لیے تھے- اور جب زمیندار پر بقایا ٹوٹتی تو اس کی زمینداری سستے داموں نیلام کرا کر خود مول لے لیتا اور یہ قیمت بھی اسی روپیہ سے ادا کرتا جو انہیں زمیندار سے پیشگی وصول کر چکا ہوتا- اس بنئے نے اکثر معافیاں چار چار آنہ بیگہ کے حساب سے مول لے لی تھیں- نتیجہ یہ ہوا کہ علاقے کے علاقے ویران ہو گئے اور بقول مسٹر برک زمیندار گھربار اور نوکر چاکر سب چھوڑ کر نکلے اور بھاگنے سے پہلے اپنی آنکھوں دیکھ لیا کہ اوقاف نیلام ہو رہے ہیں جو انہیں نے یا ان کے بزرگوں نے خدا کی راہ میں اس لیے دے رکھے تھے کہ ان کی آمدنی سے بیواؤں' یتیموں' لنگڑے' لولوں' اور اپاہجوں کی امداد کی جائے- وہ جائدادیں بھی جو انہوں نے کفن دفن اور مرنے کی رسموں کے لیے علیحدہ کر رکھی تھیں فروخت کر دی گئیں افسوس کہ جاں کنی کے وقت سکون اور اطمینان سے گزر جانے کا سہارا بھی اس ظالم ہاتھ نے قطع کر دیا- اف کیسا ظالم ہاتھ تھا جس کا ظلم چتا کی آگ سے زیادہ جلانے والا' قبر سے زیادہ حریص اور موت سے زیادہ بے رحم تھا-(97)"

سر ولیم وڈربرن لکھتا ہے-

> "بالعموم ہمارے اعلیٰ عہدہ داروں کو اپنے خلاف مزاج سچی باتیں ناگوار معلوم ہوتی ہیں اور اس وجہ سے وہ لوگوں کے معتمد علیہ اشخاص کو اپنے

> پاس پھٹکنے نہیں دیتے اور اپنی مراعات و کرم ان لوگوں کے لیے مخصوص رکھتے ہیں جو ذلیل ترین 'خوشامدی اور ہندوستانیوں کے مفاد کے لیے سخت خطرناک جماعت ہے۔ (98)"

پھر یہی نہیں ہوا کہ ایسے جرائم پیشہ بد اخلاق اور بداعمال لوگ ایک مرتبہ آکر ملک میں بس گئے بلکہ ایسے لوگوں کی آمد کا دوامی طور پر تانتا باندھ دیا گیا۔ ہر سال ایک جماعت اپنی حرص و آز پوری کر کے اور چند سال یہاں لوٹ مار غارت گری وحشیانہ درندگی عمل میں لاکر لوٹتی تھی اور دوسری جماعت ویسی ہی آدھمکتی تھی۔ اس قسم کے لوگوں کی شکایت میں کرناٹک کے بدقسمت نواب نے ڈائرکٹران کمپنی کو حسب ذیل مضمون کا خط لکھا تھا۔

> "آپ کے نوکروں کا اس ملک میں کوئی کاروبار تو ہے نہیں نہ آپ انہیں معقول تنخواہیں دیتے ہیں پھر بھی چند ہی سال میں وہ کئی کئی لاکھ اشرفیاں کما کر واپس جاتے ہیں۔ اتنی قلیل مدت میں بغیر کسی ظاہری ذرائع کے یہ بے حساب کمائی کہاں سے آتی ہے ہم اور آپ دونوں سمجھتے ہیں۔ (99)"

دوسری جگہ برک کہتا ہے۔

> "تاتاریوں کی یورش سے بے شک ہندوستانیوں کو نقصان پہنچتا تھا مگر ہماری حفاظت ہندوستان کو تباہ کئے ڈالتی ہے۔ نو عمر لونڈے ملک پر حکومت کر رہے ہیں۔ جہاں کے باشندوں سے نہ ان کا میل جول ہے اور نہ اس سے ہمدردی ہے۔ دولت کی ہوس اور تیز مزاجی جتنی کہ کسی جوان میں ہو سکتی ہے وہ ان لوگوں میں بھری ہوئی ہے۔ اور ملک میں ان کی آمد کا تانتا لگا ہوا ہے۔ ایک کھیپ لوٹتی ہے تو دوسری پہنچ جاتی ہے۔ ہندوستانی رعایا کے سامنے مستقبل کی صرف ایک مایوس کن صورت ہے اور وہ یہ ہے کہ ایک غیر محدود زمانہ تک ان موسمی شکاری پرندوں کے نئے غول اسی طرح آتے جاتے رہیں گے جن کی بھوک ہر مرتبہ اور تیز ہوتی رہے گی۔ درآں حالیکہ جس چیز کے وہ بھوکے ہیں وہ کمیاب ہوتی جائے گی۔ (100)"

ملاصہ یہ کہ ایسے بدکردار انگریزوں کے اقتدار ان کے گوشہ گوشہ ملک میں پھیل جانے اور آزادانہ طور پر ایسی بداعمالیاں کرنے سے ملک کی ثروت اور دولت تو برباد ہوئی ہی تھی۔ ان

لوگوں کے اخلاق اور اعمال بھی بہت زیادہ بگڑ گئے جو انگریزوں کے حاشیہ نشین اور کارکن تھے۔ وہ انگریزوں کی حمایت حاصل کرکے ہر قسم کے خطروں سے اپنے آپ کو محفوظ پاتے تھے اور من مانی کاروائیاں کرتے تھے۔ نیز عام ہندوستانیوں پر یہ اثر پڑا کہ جو عادتیں اور اخلاق پہلے سے بری سمجھی جاتی تھیں ان کی برائی ان کے دلوں میں سے جاتی رہی۔ کیوں نہ ہو الناس علی دین ملوکہم اس لیے عام طور پر جعلسازی، بد اخلاقی، ظلم و ستم پھیل گئے۔

فالی الله المشتکی

دوم :- یہ کہ انگریزوں کی بے آئینی (جن کے وہ ہی خود وضع کرنے والے تھے) لوٹ اور غارت گری، دولت اور ذرائع، دولت کی بربادگی کی بناء پر لاکھوں اور کروڑوں افراد اور خاندان فاقہ مست اور کنگال ہو گئے۔ اس لیے جان بچانے اور دنیاوی زندگی سنبھالنے کے لیے لوگ ہر قسم کے جرائم اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے اور ان اخلاق اور عادات میں مبتلا ہو گئے جو کہ شرافت انسانی کے لیے ننگ و عار ہیں اور جن کو وہ مذہبی یا اخلاقی حیثیت سے برا سمجھتے تھے ملعون غلامی اور ہلاک کر دینے والے فقر و فاقہ نے ان کو ایسی عادتوں کے اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔ سر جان شور جس کا تعلق بنگال سول سروس سے تھا قانون اور نظام انگریزی پر بحث کرتے ہوئے 1833ء میں کہتا ہے۔

> "لیکن ہندوستان کا عہد زریں گذر چکا ہے، جو دولت کبھی اس کے پاس تھی اس کا جزو اعظم (بڑا حصہ ملک کے باہر کھینچ کر بھیج دیا گیا ہے اور اس کے قدرتی عمل اس بد عملی کے ناپاک نظام نے معطل کر دیئے ہیں۔ جس نے لاکھوں نفوس کی منفعت کو چند افراد کے فائدے کی خاطر قربان کر دیا ہے۔
>
> برطانیہ نے جو طرز حکومت قائم کیا ہے اس کے تحت ملک اور باشندگان ملک رفتہ رفتہ محتاج ہوتے جاتے ہیں۔ اور یہی سبب ہے کہ ان پرانے تاجروں پر جلد تباہی آگئی۔ انگریزی حکومت کی پیس ڈالنے والی زیادہ ستانی نے ملک اور اہل ملک کو اتنا مفلس کر دیا ہے کہ اس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔ (101)"

مسٹر سیول میرٹ ممبر کونسل 1836ء میں لکھتا ہے:-

> "برطانیہ کا دور حکومت مہربان و مقبول بتایا جاتا ہے مگر اس عہد میں ملک جس حالت کو پہنچ گیا ہے اگر اس کا مقابلہ دیسی حکمرانوں کے عہد سے کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس وقت لوگ خوشحال تھے...... یہ ملک فلاکت کی انتہائی پستی تک پہنچ گیا ہے۔ (102)"

افلاس اور غربت کے انتہائی درجہ پر پہنچ جانے کے بعد طبعی طور پر انسان ایسے اخلاق اور اعمال کا مرتکب ہو جاتا ہے جو کہ نہ صرف شرافت اور اعلیٰ معیار کے مخالفت ہوں بلکہ وہ عموماً انسانیت سے گزر کر درندگی اور وحشت و بربریت کے بدترین مظاہروں پر بھی آمادہ ہو جاتا ہے۔

وہ چوری کرنے' اور اچکے پن کو عمل میں لانے ڈاکے ڈالنے' لوگوں کو قتل کرنے' ٹھگی اور دھوکہ بازی کو اختیار کرنے' بے حیائی اور فواحش کے کرنے اور کرانے اور اس قسم کے دیگر نجس اور مکروہ اعمال کا بیشتر ارتکاب کرنے لگتا ہے۔ انگریزوں نے عموماً ہندوستانیوں کے ساتھ کسی ہمدردی کا کبھی خیال نہیں کیا یہ پردیسی اور غیر قوم تھے روپیہ کمانے اور ہندوستان کو لوٹ کر اپنا خزانہ بھرنے کا نصب العین دن و رات ان کے سامنے رہتا تھا ان کو کوئی التفات ہندوستانیوں کی بہبودی کی طرف نہ تھا۔ ان کی بلا سے ہندوستانی جئیں یا مریں' ان کا کیرکٹر بنے یا بگڑے ان کو تو اپنا الو سیدھا کرنا تھا۔ سرجان سلیمان (اپنی شہادت میں) کہتا ہے۔

> ملک کے تمام ذمہ داری کے عہدوں سے ہندوستانیوں کے خارج ہونے کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ اعلیٰ انتظامی قابلیت کے نشوونما کرنے کے مواقع جاتے رہے اور جو کچھ بھی ان کی قابلیت تھی وہ وہ رفتہ رفتہ زائل ہوگئی۔ اس کے ساتھ ان کے مالی تنزل نے ان کے کیرکٹر کو اس درجہ تک گرا دیا جس پر مظلوم اور محکوم قومیں پہنچ جاتی ہیں۔ (103)"

> لارڈ منٹو وائسرائے ہند نے 1811ء میں ایک طویل یادداشت لکھ کر کورٹ آف ڈائرکٹران کو بھیجی جس میں یہ دکھلایا کہ "علم کا روز بروز زوال ہو رہا ہے۔ ہندو مسلمانوں کی مذہبی تعلیم نہ ہونے سے دروغ حلفی اور جعلسازی کے جرائم بڑھ رہے ہیں اور سفارش کی کہ متعدد کالج قائم کئے جائیں اور تعلیم پر زیادہ روپیہ خرچ کیا جائے۔ (104)"

سوم یہ کہ حکومت کے تمام ذمہ دار عہدوں سے ہندوستانیوں کو یک قلم خارج کر کے تمام بڑے عہدوں پر انگریزوں نے انگریزوں ہی کو مقرر کیا بلکہ حسب تصریح سر جان شور جس ادنیٰ سے ادنیٰ عہدے کو انگریز قبول کر سکتا تھا اس پر انگریز ہی کو مقرر کیا ہاں جو عہدے بہت چھوٹے تھے ان سے مسلمان ملازمین کو نکال کر ہندوؤں کو مقرر کیا کیونکہ وہ انگریزوں کی پوری چاپلوسی کرتے تھے۔ اور انگریزوں کی خواہشات کو پورا کرنے میں کسی بد اخلاقی اور بد عملی سے دریغ نہیں کرتے تھے خواہ وہ کیسی ہی اور کتنی ہی ہندوستانی قوم کے لیے مضر کیوں نہ ہوں۔

جن کے کچھ واقعات ہم نے پہلے ان بنیوں کے جو کہ صاحب لوگوں کے مقرب ہوتے ہیں وجہ اول میں بطور نمونہ ذکر کر دیئے ہیں۔ حالانکہ شہنشاہ دہلی سے جو فرامین انگریزوں نے حاصل کیے تھے اور جن کے ذریعہ سے دیوانی کے اختیارات ان کو ملے تھے ان میں شرط تھی کہ وہ ان شاہی نظامات کی جو کہ پہلے سے چلے آتے تھے پوری طرح حفاظت کریں گے۔ مگر انگریزوں نے ان نظامات کی بہت تھوڑے دنوں تک مراعات کی اور پھر رفتہ رفتہ ان کو توڑنا شروع کر دیا کیونکہ ان کے باقی رکھنے میں انگریزوں کی وہ لالچ اور طمع پوری نہیں ہوتی تھی جس کو وہ اپنا نصب العین بنائے ہوئے تھے اور جس کے لیے وہ تمام ہندوستان کو لوٹ کھسوٹ کر انگلستان کے خزانوں کو پر کر سکتے اور اپنے افراد کی معلون خواہشات کو پوری کر سکتے تھے۔

> ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر اپنی کتاب "ہمارے ہندوستانی مسلمان" میں ص 225 پر لکھتا ہے۔
>
> "بنگال کو انگریزوں نے حاصل کیا تو شہنشاہ دہلی کے دیوان ہونے کی حیثیت سے پھر یہ عہدہ کسی بہت بڑی رشوت سے نہیں بلکہ تلوار کے زور سے۔ قانوناً ہم صرف شہنشاہ دہلی کے دیوان تھے یعنی چیف ریونیو افیسر۔ مسٹر ایچی سن کی دستاویزات میں 12 اگست 1765ء کا فرمان ایسٹ انڈیا کمپنی کی سہ ماہی رپورٹ 1812ء رپورٹ نمبر 14 سے لے کر نمبر 20 تک)

اسی بنا پر مسلمانوں کا دعویٰ ہے کہ ہم کو اسی سلامی طریقہ پر کاربند رہنا چاہیے جس کے انتظام کا ہم نے اس وقت ذمہ لیا تھا۔ جہاں تک میرا

خیال ہے اس میں طرفین کا باہمی سمجھوتہ فی الواقع یہی تھا۔"

پھر صفحہ 228 پر اسی کتاب میں لکھتا ہے۔

> "سو سب سے بڑی ناانصافی وہ ہے جس کا مسلمان امراء انگریزی حکومت کو مجرم ٹھہراتے ہیں۔ انکا یہ دعوی ہے کہ ہم نے مسلمان شہنشاہ سے بنگال کی دیوانی اس شرط پر لی تھی کہ ہم اسلامی نظام کو برقرار رکھیں گے لیکن جوں ہی ہم نے اپنے آپ کو طاقت ور پایا اس وعدے کو فراموش کر دیا۔ ہمارا جواب یہ ہے کہ جب ہم نے بنگال میں مسلمانوں کے نظام دیوانی کا مطالعہ کیا تو اس قدر یک طرفہ، اس قدر ناکارہ اور اصول انسانیت کے خلاف پایا کہ اگر ہم اس کو برقرار رکھتے تو تہذیب کے لیے باعث ننگ ہوتے۔"

بہر حال انگریز بحیثیت ملازمت شہنشاہی فرمانوں اور معاہدوں اور شروط کے ذریعہ سے مالیات کے ناظم بنائے گئے تھے جن میں اسلامی نظام کو برقرار رکھنا مشروط تھا۔ مگر انہوں نے رفتہ رفتہ سب کو توڑ ڈالا اور تمام عہدوں سے ہندوستانیوں کو نکال کر انگریزوں اور خوشامدی ہندوؤں سے بھر دیا۔ اور نیا نظام ایسا بنایا کہ جس کا خرچ بہت زیادہ تھا۔ اور انگریزوں کے لیے ہندوستانی کے خون چوسنے کا بہت زیادہ سامان ہاتھ آتا تھا۔ مگر انگریزی عیاری یہ تھی کہ خلاف واقعیت پورے نظام کو یک طرفہ، اصول انسانیت کے خلاف ناکارہ تہذیب کے لیے باعث ننگ قرار دیا جا رہا ہے (جیسا کہ ڈاکٹر ہنٹر اور بہت سے دوسرے انگریز پروپیگنڈہ کرتے رہے ہیں۔) حالانکہ یہ بات انگریزی نظام میں پائی جاتی ہے۔ پرانے نظام کو ایسا کہنا برعکس نہند نام زنگی کافور کا مصداق ہے۔ پرانا نظام جب تک رہا ہندوستان باتفاق پھیلتا اور پھولتا اور ترقی پزیر رہا۔ اور جب سے یہ نیا نظام انگریزی قائم ہوا ہندوستان روز بروز بربادی کے بھینٹ چڑھتا رہا اور بالاخر ہلاکت کے انتہائی مرحلہ پر پہنچ گیا۔ جیسا کہ سرجان شور سیول میرٹ ڈبلوجی پیڈر، ڈوبرن وغیرہ کے اقوال بتلا رہے ہیں۔

مسٹر فلپ فرانسس جو کہ بنگال کونسل کا ممبر تھا لکھتا ہے۔

"ایک انگریز کو یہ معلوم ہو کر تکلیف ہونی چاہیے۔ کہ جب سے کمپنی کو دیوانی ملی ہے اہل ملک کی حالت پہلے سے بدتر ہو گئی ہے اور یہ کمپنی کی تجارت وغیرہ کا نتیجہ ہے۔ میرے خیال میں یہی اسباب ہیں جن کی وجہ سے یہ ملک ایک شخصی اور مطلق العنان حکومت

کے زیر سایہ تو سرسبز ہوتا رہا مگر جب انگریزوں کے تصرف میں آیا تو تباہی کے کنارے پہنچ گیا۔(105)" ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر لکھتا ہے

> انگریزوں نے چند ایک سال تو مسلمان عہدہ داروں کو بحال رکھا لیکن جب اصلاح کا وقت آیا تو اس قدر احتیاط سے قدم اٹھائے کہ اس پر بزدلی کا گمان ہونے لگتا ہے۔ بایں ہمہ سب سے کاری ضرب جو ہم نے پرانے طریق کار پر لگائی وہ اس قدر پر فریب تھی کہ اس کا اندازہ پیش از وقت نہ مسلمانوں کو ہو سکا نہ انگریزوں کو میرا مطلب ان تبدیلیوں سے ہے جو لارڈ کارنوالس نے جاری کیں اور جن سے 1763ء کا دوامی بندوبست سے ان مسلمان افسروں کا کاروبار زبردستی ہمارے ہاتھ میں آگیا جو حکومت اور ٹیکس جمع کرنے والوں کے درمیان واسطہ کا کام دیتے تھے اور جن کے سپاہیوں کو مالگزاری جمع کرنے کا جائز حق پہنچتا تھا۔(106)"

بہرحال انگریزوں نے عروج اور قوت پاتے ہی تمام ہندوستانیوں کو ذمہ دار عہدوں سے خارج کر دیا جیسا کہ صاحب حکومت خود اختیاری لکھتا ہے۔" ہندوستان میں انگریزی عملداری کی ایک خصوصیت یہ رہی ہے کہ ہندوستانی ابتداء سے بڑے عہدوں سے خارج کر دیئے گئے۔ قوانین بنانے میں ایک ملک کے درمیان انصاف کرنے میں ان کا کوئی اختیار باقی نہیں ہے۔ عملداری کی اس خصوصیت کے مضر اثرات کا اندازہ منجملہ دیگر انگریزوں کے سرطامس منرو کو بخوبی ہوا جس کا اظہار انہوں نے اپنی رپورٹ میں حسب ذیل الفاظ میں کیا ہے۔

> قوانین کے عملدرآمد میں ان کو بہت کم دخل ہے۔ بہ استثناء چند نہایت چھوٹے عہدوں کے کسی بڑے عہدہ تک خواہ وہ فوجی ہو یا سول، نہیں پہنچتے وہ ہر جگہ ایک ادنیٰ قوم کے فرد سمجھے جاتے ہیں۔ تمام فوجی اور دیوانی عہدے جو کچھ بھی اہمیت رکھ سکتے ہیں اب یورپینز کے قبضہ میں ہیں جن کا پس انداز روپیہ خود ان کے ملک کو چلا جاتا ہے۔"

اس طرح ذمہ دار عہدوں سے نکل جانے کی بناء پر ہندوستانیوں کے کیرکٹر اور اخلاق پر نہایت مضر اور ہلاکت آفریں اثر پڑا اور وہ بدترین اخلاق میں مبتلا ہو گئے۔ چنانچہ سر

تھامس منرو 1823ء میں لکھتا ہے:

> "اگر برطانیہ کسی بیرونی سلطنت کا مفتوحہ ملک ہو جاتا اور اس کے باشندے اپنے ملک کے انتظامات سے خارج کر دیئے جاتے تو ان کے تمام علوم اور تمام علم و ادب خواہ وہ مذہبی ہوں یا دنیوی انہیں ایک یا دو نسلوں کے بعد کمینہ' چالاک' (دغاباز) اور بے ایمان قوم ہو جانے سے نہ بچا سکتا تھا۔ (107)"

لارڈ میکالے کہتا ہے۔

> "زمانہ سابق میں جس طرح زور دار اور باأثر لوگوں کو افیون کے پوست پلا کر کاہل' پست ہمت اور بد عقل بنا دیا جاتا تھا۔ ہمارا نظام سلطنت اسی طرح اہل ہند کو بے کار کر دے گا۔ (108)"

مسٹر لڈلو اپنی کتاب برٹش انڈیا میں لکھتا ہے۔

> "انگریزوں کے ہاتھوں ہندوستان فتح ہونے کا نتیجہ یہ ہو گا کہ بجائے ابھرنے کے اس کے تمام باشندے ذلیل ترین ہو جائیں گے۔ (109)"

چنانچہ یہی نتیجہ ہوا کہ انگریزی حکومت کی صد سالہ حکومت نے ہندوستانیوں کو اخلاقی اور کیرکٹری حیثیت سے انتہائی پستی میں ڈال دیا۔ سر تھامس منرو کہتا ہے۔

> انگریزی صوبجات کے رہنے والے فی الواقع ہندوستان میں حد سے زیادہ ذلیل اور کمینے ہیں۔ (110)"

الحاصل سینکڑوں زمیندار' ہزاروں سپاہی اور بے شمار ملازم بے روزگار ہو گئے اور انہوں نے لوٹ مار کا پیشہ اختیار کر لیا۔ چنانچہ ناگپور سے لے کر خلیج بنگال تک تیئس ہزار پنڈاری لوٹ مار کرتے پھرتے تھے۔ جنہوں نے 1819ء کے موسم سرما میں صرف دس دن کے اندر (182) آدمی قتل کئے (500) زخمی کیے۔ تین ہزار کو طرح طرح کی ایذائیں دیں اور تقریباً ایک کروڑ کا مال لے گئے۔ (111)

چہارم:- ہائی کورٹ' سپریم کورٹ اور تمام ادنیٰ کورٹوں کے وہ قوانین اور کارنامے ہیں جن کا تعلق مالیات سے یا فوجداری یا انتظامی امور وغیرہ سے ہے۔ یہ سب قوانین عدل و انصاف اور ان کی عملی کاروائیاں زمانہ سابق میں نہایت سادہ اور بے خرچ تھے۔ ان میں فریقین کو نہ دور دراز کے اسفار کی زحمتیں پیش آتی تھیں نہ مہینوں اور سالوں کے انتظار

اور دوڑ دھوپ کی تکالیف ہوتی تھیں۔ نہ سرمایہ اور دولت کی بربادی کی مصیبتیں سامنے آتی تھیں۔ ان قوانین کی رو سے عموماً حقیقی اہل حق اپنے حق کو پہنچ جاتے تھے۔ عیاری، مکاری، فریب و دھوکہ بازی رشوت اور جعلسازی وغیرہ پاس بھی نہیں پھٹکتی تھی۔ ان کے اجراء کے دو طریقے تھے۔ ایک رعایا کی طرف سے دوسرا بادشاہوں کی طرف سے۔ ہر دو طریق میں رعایا پر ایک پیسہ کا بھی بار نہیں پڑتا تھا۔ اول الذکر کا یہ حال تھا کہ رعایا کی طرف سے گاؤں گاؤں میں پنچائتیں قائم تھیں جو کہ بمنزلہ حکومت خود اختیاری کے تھیں۔ گاؤں کے پنچ مدعی اور مدعا علیہ کے چال چلن، ان کی عادتوں اور اخلاق، مقامی رسوم اور حالات سے بخوبی واقف ہوتے تھے، گواہوں اور قسم کھانے والوں کو بخوبی پہچانتے تھے، فریقین کی زبانوں کو جانتے تھے اس لیے عموماً فیصلے صحیح اور حقانی یا قریب قریب صحیح کے ہوتے تھے۔ ہر گاؤں کے جھگڑوں کا فیصلہ وہیں یا وہیں کے قریبی مقام میں ہو جاتا تھا۔ یہ ممکن نہ تھا کہ کوئی بدچلن یا بدمعاش گاؤں میں رہ سکے کیوں کہ گاؤں کی پنچائیت کو اختیار تھا کہ وہ بدمعاش بدچلن اور چور کو سزا دے سکے۔

سرطامس منرو اسی پنچایتی نظام کے متعلق مندرجہ ذیل الفاظ لکھتا ہے۔

> "ہر موضع مع اپنے بارہ پوردوں کے مثل ایک چھوٹی سی ریاست کے ہے جس میں اس کے مقدم پیٹل یا راؤی بطور اس کے سردار کے ہیں۔ اور ہندوستان اسی قسم کی ریاستوں کا ایک بڑا مجموعہ ہے جنگ کے زمانہ میں باشندوں کی نظر اپنے گاؤں کے سردار کی طرف ہوتی ہے جب تک کہ ان کا موضع محفوظ اور سالم ہے گاؤں کے باشندے سلطنتوں کے ٹوٹنے اور تقسیم ہونے کے بارہ میں اپنے آپ کو تکلیف نہیں دیتے وہ اس امر کی پرواہ نہیں کرتے کہ ملک کس کے ہاتھ میں منتقل ہوتا ہے۔ ہر صورت میں اندرونی نظام غیر مبدل رہتا ہے۔ ان تمام حالات میں گاؤں کا سردار بدستور اپنے گاؤں کا کلکٹر مجسٹریٹ اور کاشتکاروں کا سردار رہتا ہے۔(112)"

ثانی الذکر (یعنی بادشاہوں کی طرف سے جو طریقہ انصاف کا جاری تھا) اس کی کیفیت یہ تھی کہ بادشاہوں کی طرف سے ایسی عدالتیں قائم کی گئی تھیں جو کہ برائے نام شاہی تھیں مگر ان پر بادشاہ کا اثر نہیں تھا۔ ان میں مسلمانوں کے معاملات قرآن شریف اور فقہ (اسلامک

لا) کی رو سے اور ہندوؤں کے معاملات دھرم شاستر کی رو سے طے ہوتے تھے اور انکی طاقت کی یہ کیفیت تھی کہ ذاتی امور میں بادشاہ بھی مفتیوں کے فتوؤں اور شرعی فیصلوں کے تابع ہوتے تھے۔ اس مضمون کو انگلستان کے مشہور مقرر اڈمنڈ برک نے پارلیمنٹ کی ایک تقریر میں خوب واضح کیا تھا۔ جس کے چند الفاظ حسب ذیل ہیں۔

> "جناب والا میں ایشیا کی حکومتوں کی نسبت جرات کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ان میں سے کسی کو خود سری کے اختیارات حاصل نہ تھے اور اگر کسی کو تھے تو وہ انہیں کسی دوسرے کو سپرد نہ سکتا تھا۔ میں پرزور الفاظ میں کہہ سکتا ہوں۔ مشرقی ممالک کی حکومتیں خود مختارانہ کا نام تک نہیں جانتیں ایشیاء کا بڑا حصہ مسلمان حکمرانوں کے تحت میں ہے اور اسلامی حکومت کے معنے ہی قانونی حکومت کے ہیں۔ عیسائی بادشاہوں کے مقابلہ میں مسلمانوں کے قانون میں بدرجہا زیادہ مضبوطیاں ہیں ان کا اپنے قانون کی نسبت یہ عقیدہ ہے کہ وہ خدا کی طرف سے ہے اس لیے رعایا سے لے کر بادشاہ تک سب کے سب یکسانیت کے ساتھ قانون اور مذہب دونوں کے پابند ہیں اگر کوئی شخص قرآن کی ایک آیت بھی اس مضمون کی دکھادے کہ اس کی رو سے کسی کو خود مختارانہ اختیارات حاصل ہیں تو میں تسلیم کروں گا کہ میں نے اس کا اور ایشیا کے حالات کا بیکار مطالعہ کیا ہے۔ قرآن شریف میں ایک لفظ بھی اس بارہ میں نہیں ہے برخلاف اس کے اس قانون کا ہر ہر حرف ظالموں کے خلاف گرج رہا ہے اس قانون کی شرح کرنے والے علماء یا قاضیوں کا طبقہ موجود ہے جو اس کا محافظ قرار دیا گیا ہے اور جو بادشاہ کی ناراضگی سے محفوظ ہے اور جسے بادشاہ ہاتھ نہیں لگا سکتا ان کے بادشاہوں تک کو حقیقی اعلیٰ طاقت حاصل نہیں ہے بلکہ وہاں کی حکومت ایک حد تک جمہوری ہے۔(113)"

برخلاف اس کے اب بجائے مواضعات کے صدر مقامات میں جو گاؤں سے تیس چالیس میل یا کم و بیش فاصلہ پر ہوتے ہیں جاکر انصاف ہوتا ہے اور پھر انصاف ہونے کا انحصار اس امر پر ہوتا ہے کہ مدعی اور مدعا علیہ کے پاس کافی روپیہ اور اثر ہو۔ اور جو شخص جائزد

ناجائز طریقوں سے روپیہ کما کر عدالتوں میں اور حکام کے یہاں حاضری دیتا رہتا ہے وہ تمام گاؤں پر غالب ہوتا ہے پھر متوسط لوگوں کی آمدنی چونکہ بہت زیادہ گھٹ گئی ہے۔ اور گھٹتی جا رہی ہے اس لیے وہ عدالتی کاروائیوں کے اخراجات نہیں اٹھا سکتے اب کلکٹر صاحب کے ہاتھ میں سب اختیارات ہیں۔ وہ گاؤں سے فاصلہ پر بہت دور رہتے ہیں۔ ہندوستانیوں بالخصوص غیر انگریزی تعلیم یافتہ اور دیہاتیوں اور قصباتیوں سے خلط ملط اپنی کسر شان اور خود داری کے خلاف اور اپنی ہتک سمجھتے ہیں۔ کسی کالے اور نیٹو سے بات کرنا انگریزی عزت اور شان و جلال کے بالکل منافی جانتے ہیں۔ اس لیے وہ ہندوستانیوں کے چال و چلن سے واقف نہیں ہیں۔ گاؤں کا بدترین شخص حکام رسی کر کے اپنا اثر اور رسوخ قائم کر لیتا ہے اور کلکٹر صاحب سے پروانہ تقرری وغیرہ حاصل کر کے لوگوں کے حقوق پر دست درازی کرتا ہے کاش یہ حالت حکام اور عدالتوں تک ہی محدود رہتی تب بھی ضرر اور نقصان برداشت کیا جا سکتا۔ مگر افسوس ہے کہ یہ عدالتیں تمام ملک کے لیے مرکز اور نمونہ بن گئیں ہیں مثلاً ہر روز ملک کے بہترین دل و دماغ رکھنے والے اشخاص کسی نہ کسی حیثیت سے انہیں عدالتوں کی طرف کھنچے چلے جاتے ہیں جو ممالک اس وقت بر سر عروج ہیں وہاں کے لوگوں کے دماغ، صنعت و حرفت تجارت اور زراعت اور دولت کے ذریعہ سے دولت پیدا کرنے کے طریقوں میں مصروف رہتے ہیں۔ برخلاف اس کے ہندوستان کے لوگ جب صبح اٹھتے ہیں تو ان میں سے کچھ لوگ تو حاکم اور عمال، بیرسٹر اور وکیل، مدعی مدعا علیہ عرضی نویس اور محرر، گواہ اور دلال کی شکل میں کچہریوں کا رخ کرتے ہیں اور جو لوگ پیچھے رہ جاتے ہیں وہ تمام دن مقدمات کے نتیجوں کے انتظار میں رہتے ہیں اور رات کو بیٹھکوں اور چوپالوں میں بیٹھ کر بقایا لگان اور اضافہ لگان، بٹوارہ اور داخل خارج کے چرچوں میں مصروف رہتے ہیں اور ان معاملات میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے سازشیں کرنے اور جھوٹی شہادتیں مرتب کرنے میں مصروف رہ کر بدترین بد اخلاقیوں کے مرتکب ہوتے ہیں۔

لارڈ میکالے لکھتا ہے:

> "بہت کم انگریز ایسے ہوں گے جو اس امر کو تسلیم نہ کریں گے کہ انگریزی قانون باوجود حال کی ترقیوں کے نہ تو سستا ہے اور نہ اس کی رو سے فیصلے جلد ہوتے ہیں پھر بھی ہمارے ملک یعنی انگلستان میں اس کا نشوونما ہو گیا بعض امور میں وہ ہمارے محسوسات کے مطابق ڈھال دیا گیا

اور بعض امور میں ہمارے محسوسات رفتہ رفتہ اس کے مطابق ڈھل گئے ہیں۔ ہمیں اس کے بدترین نقائص کو برداشت کرنے کی بھی عادت ہو گئی اور اس لیے اگرچہ ہم اس کی شکایت کئے جاتے ہیں۔ تاہم اس کی ہم پر ایسی ہیبت طاری نہیں ہوتی جیسی کہ ایک معمولی سی نئی تکلیف وہ چیز کی ہوتی ہے مگر ہندوستان میں بالکل مختلف حالت پیدا ہو گئی ہے۔ انگریزی قانون جو انگلستان سے لایا گیا ہے اس میں وہ تمام برائیاں ہی موجود نہیں ہیں جن سے ہم انگلستان میں تکلیف اٹھا رہے تھے بلکہ اس سے کہیں زیادہ ہیں اور وہ ایسی برائیاں ہیں جس کے مقابلے میں انگلستان کی بدترین برائیاں ہیچ ہیں۔ وہ قانون جو کہ انگلستان میں دیر طلب ہے۔ اس ملک میں اس سے کہیں زیادہ دیر طلب ہے جہاں کہ ہر جج کو اور ہر بیرسٹر کو ایک مترجم کی امداد درکار ہوتی ہے۔

اس ملک میں یہ قانون کہیں زیادہ گراں ہے۔ جس میں کہ مشیران قانونی ایک دور دراز ملک سے لائے جاتے ہیں ہندوستان میں ہر انگریز کا معاوضہ گورنر جنرل اور کمانڈر انچیف سے لے کر ایک سائیس یا گھڑی ساز تک کا انگلستان کی شرح سے کہیں زیادہ ادا کیا جاتا ہے ان وجہ سے کلکتہ میں وکلاء کی جو فیس ادا کی جاتی ہے وہ انگلستان کی فیس سے سہ چند ہوتی ہے ہندوستان کے لوگ انگریزوں کے مقابلہ میں اگرچہ بہت غریب ہیں تاہم جو تکلیف وہ تاخیر اور خرچ انگریزی قانون کی وجہ سے پیش آتا ہے وہ اس کو ان نقائص کے مقابلے میں جو اس قانون کے غیر ملکی ہونے کی وجہ سے موجود ہیں زیادہ اہم نہیں سمجھتے ان کی عزت ان کی فطرت ان کے مذہب‘ ان کی عورتوں کی عفت کے قوی محسوسات کو اس بدعت کا مقابلہ کرنا پڑا۔ مال کی کاروائیوں میں پہلا قدم جو اٹھایا گیا وہ یہ ہے کہ مال گزاری کے بقایا میں لوگ گرفتار کئے جانے لگے۔ دراں حالیکہ ایک معزز ہندوستانی کے لئے گرفتاری محض نظربندی نہ تھی بلکہ بدترین ذاتی بے عزتی تھی۔ ہر مقدمہ کی ہر منزل پر حلف لئے جانے لگے۔ دارانحالیکہ معزز ہندوستانیوں کے نزدیک یورپ کے فرقہ ”کویکر“

> سے (جو قسم کو معیوب سمجھتا ہے) یہ طریقہ زیادہ تکلیف دہ تھا۔ مشرقی ممالک میں معزز گھرانوں کے زنانخانہ میں غیر آدمی کا داخل ہونا یا عورتوں کے چہرہ کو دیکھ لینا ایسی ناقابل برداشت زیادتی سمجھی جاتی ہے۔ اور اس کو موت سے بھی زیادہ خوفناک خیال کیا جاتا ہے اور جس کا انتقام صرف خونریزی سے لیا جا سکتا ہے بنگال' بہار اور اڑیسہ کے نہایت معزز خاندانوں کو اس قسم کے بے عزتیوں کا سامنا ہوا۔ اگر ہمارے ملک میں دفعتا ایک ایسا قانون نافذ کر دیا جائے جو ہمارے لیے ایسا ہی نیا ہو جیسا کہ ہمارا قانون ہماری ایشیائی رعایا کے لیے ہے تو یہ خیال کرنے کی بات ہے کہ ہمارے ملک کی اس وقت کیا حالت ہو جائے گی۔
>
> اگر ہمارے ملک میں یہ قانون نافذ ہو کہ کسی کے قسم کھا لینے سے جس کا قرضہ ہم پر ہے اسے یہ حق ہو جائے گا کہ وہ معزز اور مقدس ترین اشخاص اور پردہ نشین خواتین کی ہتک کر سکے۔ ایک افسر کے بید لگائے جا سکیں۔ ایک پادری کو کٹہرے میں ٹھونسا جا سکے۔ شریف عورتوں کے ساتھ اس طریقہ سے سلوک کیا جا سکے جس کا نتیجہ واٹ ٹائر جیسا بلوہ ہو۔ تو اس وقت ملک کی جو حالت ہو جائے گی اس کا تصور کرنے سے دل کانپتا ہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد حکومت میں سپریم کورٹ (عدالت عالیہ) نے جب اپنے قانون کو اپنے تمام مقبوضات ہند میں وسعت دینے کی کوشش کی تو قریب قریب اسی قسم کی کیفیت یہاں پیدا ہو گئی۔ اس سے خوف و ہراس کا عہد شروع ہو گیا اور وہ خوف اس خیال سے کہ خدا جانے

اس کی تہ میں اور کیا کیا مصائب پوشیدہ ہیں بہت زیادہ ہو جاتا ہے۔ یعنی جو مصیبتیں لوگوں پر پڑ رہی تھیں وہ آئندہ پیش آنے والی مصیبتوں کے خوف کے مقابلے میں کم تھیں کوئی شخص یہ نہیں جانتا تھا کہ عجیب و غریب عدالت آگے چل کر اور کیا رنگ لائے گی۔ چونکہ

ہندوستان کے لوگ سمندر کے نام سے ڈرتے تھے اس لیے وہ خوف زدہ ہو کر کہتے تھے کہ یہ عدالت کالے پانی کے اس پار سے آئی ہے۔ اس عدالت کے ججوں میں سے ایک بھی ایسا نہ تھا کہ وہ ان کروڑوں انسانوں کے رسم و رواج سے جن پر وہ بے قید حکومت کرتے تھے واقفیت رکھتا ہو۔ مقدمات کی مثلیں اس خط میں لکھی جاتی تھیں جس سے ہندوستانی قطعاً ناواقف تھے اور فیصلے اس زبان میں صادر کئے جاتے تھے جس سے لوگ بالکل نا آشنا تھے۔ ان عدالتوں کے گرد ہندوستانی آبادی کے بدترین لوگ جمع ہو گئے۔ یہ لوگ چغلخور جھوٹے گواہ مقدمہ ساز دغاباز اور سب سے بڑھ کر قرقی کرنے والے لوگوں کا وہ گروہ تھا جس کے مقابلہ میں انگلستان کے بدترین پتے باز نہایت دیانت دار اور رقیق القلب معلوم ہوتے ہیں یہ انگریزی مشیران قانونی جس سرعت کے ساتھ تمام ملک میں پھیلے اس سرعت کے ساتھ حملہ آور بھی نہ پھیلے تھے۔ زمانہ سابق کے تمام ایشیائی اور یورپین ظالموں کی غیر انصافیاں سپریم کورٹ (عدالت عالیہ) کے انصاف کے مقابلہ میں برکت معلوم ہوتی ہیں۔(114)"

خلاصہ یہ ہے کہ ان عدالتوں اور ان کے قوانین سے ہندوستانیوں کے اخلاق اور اعمال پر نہایت ہی زہریلا اثر پڑا اور ان کے اخلاق انتہائی درجہ میں گرتے چلے گئے اور ہر طرف بد اخلاقیوں اور بداعمالیوں کا دور دورہ ہو گیا۔

انگریزوں کے ہاتھوں ہندوستان کی تعلیمی بربادی

انگریزوں کو یہ خطرہ لاحق ہوا کہ تعلیم یافتہ لوگوں کی کثرت اگر ہندوستان میں رہی تو وہ ہماری حکومت کو فنا کر دیں گے اس لیے انہوں نے تعلیم گاہوں کو ملیامیٹ اور تعلیم کو نیست و نابود کر دیا اور تعلیم کی تمام موقوفہ زمینوں کو 1838ء میں سرکاری قبضہ میں لے لیا۔ سرولیم ڈگبی پراسپرس برٹش انڈیا میں لکھتا ہے۔

> (ضمن سوال و جواب میجر جنرل سمتھ کے۔ سی۔ بی)
>
> "سوال نمبر 563 کیا آپ کسی طرح اس بات کی روک کر سکتے ہیں کہ دیسیوں کو ان کی طاقت کا علم نہ ہو۔
>
> جواب۔ میرے خیال میں انسانی تاریخ میں کوئی ایسی نظیر نہیں ملتی کہ معدودے چند اغیار چھ کروڑ آبادی کے ملک پر حکمرانی کر سکیں جسے آجکل رائے کی بادشاہت کہتے ہیں اس لیے جوں ہی وہ تعلیم یافتہ ہو جائیں گے تو تعلیم کی تاثیر سے ان کے قومی اور مذہبی تفرقے دور ہو جائیں گے جس کے ذریعہ سے اب تک ہم نے اس ملک کو اپنے قبضہ میں رکھا ہوا ہے۔ یعنی مسلمانوں کو ہندوؤں کے خلاف کرنا اور علی ہذا القیاس تعلیم کا اثر یہ ضرور ہو گا کہ ان کے دل بڑھ جائیں گے۔ اور انہیں اپنی طاقت سے آگاہی ہو جائے گی۔(115)"

اسی بناء پر انگریزوں نے تعلیم اور تعلیم گاہوں کو برباد کیا اور چونکہ ان کا نصب العین زیادہ سے زیادہ مالی منافع حاصل کرنا تھا اس لیے بھی انہوں نے ہندوستانیوں کو تعلیم دینا اپنے مقاصد کے خلاف سمجھا۔ بہر حال تھوڑے ہی عرصہ میں جبکہ تعلیم گاہیں مٹ گئیں اور ان کی جگہ دوسرے اسکول اور کالج وغیرہ قائم نہ کئے گئے اور پرانے تعلیم یافتہ لوگ آہستہ آہستہ وفات پا گئے تو چاروں طرف ہندوستان میں جہالت اور نادانی کا دور دورہ ہو گیا۔ چنانچہ 1823ء میں آنریبل الفنسٹن اور آنریبل ایف وارڈن نے ایک متفقہ یاد داشت گورنمنٹ میں پیش کی جس کا اقتباس حسب ذیل ہے۔

> "انصاف یہ ہے کہ ہم نے دیسیوں کی ذہانت کے چشمے خشک کردیئے۔ ہماری فتوحات کی نوعیت ایسی ہے کہ اس نے نہ صرف ان کی علمی ترقی کی ہمت افزائی کے تمام ذرائع کو ہٹالیا ہے بلکہ حالت یہ ہے کہ قوم کے اصلی علوم بھی گم ہو جانے اور پہلے لوگوں کی ذہانت کی پیداوار فراموش ہو جانے کا اندیشہ ہے اس الزام کو دور کرنے کے لیے کچھ کرنا چاہیے۔ (116)"

ہم اس سے پہلے لارڈ منٹو وائسرائے ہند کی 1811ء والی یادداشت کا اقتباس ذکر کرچکے ہیں جو کہ انہوں نے کورٹ آف ڈائرکٹران کو بھیجی تھی اور اس میں اقرار کیا تھا کہ علم کا روز بروز زوال ہو رہا ہے ہندو اور مسلمانوں میں مذہبی تعلیم نہ ہونے سے دروغ حلفی اور جعلسازی کے جرائم بڑھ رہے ہیں۔ اور سفارش کی تھی کہ متعدد کالج قائم کئے جائیں اور تعلیم پر زیادہ روپیہ خرچ کیا جائے۔

ہندوستان کو ہمیشہ غلام رکھنے کی ہوس اور اس کو ہمیشہ لوٹتے رہنے کی معلون خواہش کی وجہ سے انگریز ہمیشہ یہی پالیسی رکھتے رہے کہ ہندوستانیوں کی ذہانت بالکل برباد کر دی جائے ان میں علمی بے داری پیدا نہ ہونے دی جائے ان کے ہر قسم کے کمالات فنا کر دیئے جائیں اور ان کو غلامی کی بدترین خدمت گزاریوں کاشتکاریوں وغیرہ ہی میں ہمیشہ مبتلا رکھا جائے تاکہ ہماری برتری ہمیشہ قائم رہے اور ہم ہندوستان کے اعلیٰ حاکم بنے رہیں۔ یہی وجہ ہے کہ 1792ء میں جبکہ مسٹر ولبرفورس نے پارلیمنٹ میں اس مضمون کی تجویز پیش کی کہ ہندوستان میں پروٹسٹنٹ مذہب کے عقیدے کی عبادت اور تعلیم کے ذرائع مہیا کئے جائیں اور اس مقصد کے لیے وقتا فوقتا پادری بھیجے جائیں تو مالکان ایسٹ انڈیا کمپنی نے ان تجاویز کی شدت سے مخالفت کی اور کہا کہ

> "ایک مذہب کے قائم ہو جانے سے انسانوں کے مقاصد متحد ہو جاتے ہیں اور اگر یہ ہو گیا تو ہندوستان میں انگریزوں کی برتری کا خاتمہ ہو جائے گا۔ لوگوں کو اپنے مذہب میں لانے کا اصول اس اٹھارویں صدی میں خلاف مصلحت ہے۔ اگر چند لاکھ عیسائی بھی وہاں ہو گئے تو اس سے سخت مصیبت آجائے گی۔ امریکہ میں درسگاہیں اور کالج قائم ہونے کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ وہ ملک ہمارے ہاتھ سے نکل گیا۔ اسی طرح جب

> نوجوان پادری اندرون ہند میں پھیلیں گے تو کمپنی کے فوائد کا خاتمہ ہو جائے گا۔ جس ہندوستانی کو تعلیم حاصل کرنی ہو وہ انگلستان چلا آئے۔(117)”

تعلیم گاہوں اور علم کا فنا کر دینا اور فنا ہو جانا کوئی معمولی مسئلہ نہ تھا اس لیے مالکان ایسٹ انڈیا کمپنی اور عہدہ داران کمپنی کی ہر قسم کی مخالفت کے باوجود آوازیں اٹھتی رہیں اور چیخ و پکار ہوتی رہی۔ بہت سے منصف مزاج انگریز ہندوستانیوں کی موافقت بھی کرتے رہے جس کے نتیجہ میں 1834ء میں تعلیمی ضروریات انجام دینے اور اس کے پروگرام وغیرہ کے لیے ایک کمیٹی بنائی گئی جس کا اجلاس 7 مارچ 1835ء میں منعقد ہوا اور لارڈ میکالے اس کے صدر بنائے گئے کمیٹی اور اس کے صدر نے ہندوستانیوں کے لیے تعلیم گاہیں بنانے اور تعلیم کو زیادہ سے زیادہ کرنے کی ضرورت کو تسلیم کیا مگر ہر ہر قدم اور ہر ہر شعبہ میں ایسے امور کو لازم قرار دیا جس سے تعلیم عام ہو سکے نہ ہندوستانیوں کو اعلیٰ علوم میں کامیابی ہو سکے اور نہ ان کا کیرکٹر اعلیٰ درجات حاصل کر سکے نہ ایسی چیزیں اور سہولتیں اس میں رکھی گئیں کہ وہ ایک آزاد قوم کے ممبر شمار کئے جا سکیں۔

(1) تمام فنون و علوم کی تعلیم انگریزی زبان میں لازمی قرار دی گئی۔ ظاہر ہے کہ سات ہزار میل کی وہ زبان جس سے ہندوستانیوں کو کوئی مناسبت نہیں جبکہ فنون اور علوم کو حاوی ہو کر ہندوستانی بچوں کے لیے ذریعہ تعلیم بنائی جائے گی تو ان کے اذہان پر ان فنون میں مہارت پیدا کرنے کے لیے کس قدر ثقیل بوجھ پڑے گا۔ اگر یہ فنون ان کی مادری زبان میں پڑھائے جاتے اور انگریزی زبان بحیثیت زبان ثانوی درجہ تسلیم کی جاتی تو ان کو ان فنون میں کس قدر زیادہ جلد مہارت تامہ حاصل ہو جاتی۔

(2) پھر جو فنون داخل درس کئے گئے وہ ایسے اور اتنے ہرگز نہ تھے جن سے وہ ماہر ہو کر صنائع اور ترقیات معاشیہ و حربیہ وغیرکے ایسے درجوں پر پہنچ سکیں جن پر یورپین اقوام جرمنی، برطانیہ، روس، جاپان وغیرہ پہنچیں۔

(3) فضول اور زائد از حاجت کتابیں اور فنون ایسے بھر دیئے گئے جن میں دماغ کمزور اور بیکار ہو جاتا۔ اور کوئی معتدبہ کمال حاصل نہیں ہوتا تھا۔

(4) نصاب میں وہ کتابیں سائنس اور طبیعات کی داخل کی گئیں جن کی خیالی اور موہوم مگر مزین باتیں نو عمر بچوں کو مذہب اور عقائد دینیہ سے یک قلم منحرف کر کے لامذہب اور

بے دین بنادیں۔

سب سے بڑا مقصد ان ممبران کمیٹی کا یہ رہا کہ انگریز حکام کو اپنے اپنے دفاتر میں کلرک اور ترجمان مہیا ہو جائیں۔ اور انگریزی تہذیب اور انگریزوں کا کلچر ہندوستانیوں میں رائج ہو کر ان ہندوستانی اخلاق قدیمہ اور روحانیت و مذہبیت سے دور اور انگریزی اخلاق خبیثہ اور ان کی ڈپلومیسیوں سے نزدیک کر دے ان میں دنیا طلبی اور خود غرضی اور نفاق کی ایسی اسپرٹ آجائے جس کی علمبردار اور تمام یورپین اقوام سے بڑھ کر برطانیہ واقع ہوئی ہے۔ چنانچہ لارڈ میکالے اوراس کی کمیٹی اپنی تعلیمی اغراض و مقاصد اوران کی اسکیم کی رپورٹ میں مندرجہ ذیل کلمات تحریر کرتی ہے۔

> ”ہمیں ایک ایسی جماعت بنانی چاہیے جو ہم میں اور ہماری کروڑوں رعایا کے درمیان مترجم ہو اور یہ ایسی جماعت ہونی چاہیے۔ جو خون اور رنگ کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہو مگر مذاق اور رائے الفاظ اور سمجھ کے اعتبار سے انگریز ہو۔(118)“

اسی کے ساتھ ساتھ وہ رائے جو لارڈ میکالے کے قلب کے اندرونی پردوں کے اندر چھپی ہوئی تھی وہ وہ تھی جو کہ انہوں نے اپنے والد کو ایک چھٹی میں لکھ کر بھیجی تھی اس کے الفاظ حسب ذیل ہیں۔

> ”اس تعلیم کا اثر ہندوؤں پر بہت زیادہ ہے۔ کوئی ہندو جو انگریزی داں ہے کبھی اپنے مذہب پر صداقت کے ساتھ قائم نہیں رہتا۔ بعض لوگ مصلحت کے طور پر ہندو رہتے ہیں مگر بہت سے یا تو موحد ہو جاتے ہیں یا مذہب عیسوی اختیار کر لیتے ہیں میرا پختہ عقیدہ ہے کہ اگر تعلیم کے متعلق ہماری تجاویز پر عملدرآمد ہوا تو تیس سال بعد بنگال میں ایک بت پرست بھی باقی نہ رہے گا۔(119)“

چنانچہ ان مقاصد کا ظہور بہت تھوڑے عرصہ میں ہو گیا اور ان کالجوں اور اسکولوں اور یونیورسٹیوں سے جو لڑکے فارغ ہو کر نکلنے لگے وہ اپنے اسلاف کے مذہب اور ان کے طریقوں سے بیزار اور متنفر ہوتے تھے۔ اور چونکہ موجودہ مذہب عیسوی میں ایسی معقولیت اور جاذبیت نہ تھی کہ وہ اپنی طرف ان کو کھینچ سکے نیز خود انگریز بھی عموماً اس مذہب پر قائم نہیں ہیں انکی عیسائیت صرف قومیت کے درجہ تک ہے۔ عمل اور عقیدہ میں کوئی تاثر

نہیں ہے۔ اس لے وہ الحاد اور لادینیت کی دلدل میں پھنس کر اخلاق حسنہ اور خدا ترسی سے بالکل دور ہو جاتے رہے۔
حوالہ کے لیے ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر کہتا ہے۔

> ”ہمارے انگلو انڈین اسکولوں سے کوئی نوجوان خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان ایسا نہیں نکلتا جو اپنے آباؤ اجداد کے مذہب سے انکار کرنا نہ جانتا ہو ایشیا کے پھلنے پھولنے والے مذاہب جب مغربی سائنس بستہ حقائق کے مقابلہ میں آتے ہیں تو سوکھ کر لکڑی ہو جاتے ہیں۔(120)“

الغرض باوجود اس شوراشوری اور اتنی تعلیمی جدوجہد کے مظاہروں اور کمیشنوں اور کمیٹیوں اور اسکیموں کے اعلانات اور کالجوں اور یونیورسٹیوں اور اسکولوں کی بند بانگی کے جب 35 برس کے بعد پہلی مردم شماری ہوئی تو تمام ہندوستان میں خواندہ (یعنی پڑھے لکھے لوگوں کا خواہ اردو ہو یا انگریزی یا فارسی یا ناگری وغیرہ) انسانوں کا فیصد اوسط (3.2) پایا گیا۔ وہ انگریزی نظام جو کہ نہایت بلند بانگ دعاوی کے ساتھ 1763ء یا اس کے قریبی زمانہ سے شروع کیا گیا تھا اور اس کے محاسن اور خوبیوں اور انسانی خدمات کے ہمیشہ راگ گائے جاتے رہے۔ سو برس سے زائد مدت میں ہندوستان میں خواندہ لوگوں کی تعداد (3,2) فیصد پیدا کر سکا اس سے انگریزوں کی سچائی اور انسان دوستی کی حقیقت معلوم ہوتی ہے۔ حالانکہ بقول مسٹر لڈلو اور ڈاکٹر لیٹنر و دیگر ماہرین تعلیم (حسب تصریحات ان بیبی انڈیا) انگریزی حکومت سے پہلے عام طور پر بکثرت خواندہ تھے۔ پس کم از کم 51 فیصد خواندوں کا اوسط ہونا چاہیے۔ پھر 1871ء میں اس اوسط کا پایا جانا کیا صریح طور پر دلالت تہیں کرتا کہ انگریزوں نے ہندوستان میں اپنی مشومہ اغراض کے لیے علم اور اس کی درس گاہوں کو دشمنی کی نظر سے دیکھ کر برباد ہی کرنے کا سلسلہ ہمیشہ رکھا ہے اور جو کمیشن و کالج وغیرہ کی حکایات سامنے رکھی جاتی تھیں وہ محض دکھاوے اور طفل تسلی کے لیے تھیں۔ 1871ء سے 1921ء تک پچاس برس کے عرصہ میں خواندہ لوگوں کی تعداد کا اوسط جو کچھ بڑھا وہ صرف 4 فیصد ہے۔ کیونکہ 1921ء میں خواندہ لوگوں کی تعداد (7.3) فیصد ہے سوویٹ روس نے صرف چوبیس برس کے اندر یعنی 1918ء سے لے کر 1941ء تک 8 فیصد تعلیم یافتوں سے اسی فیصد یا اس سے زائد اپنے ملک روس میں تعلیم یافتہ بنا دیئے۔ جاپان نے ایک صدی سے کم میں اپنے ملک میں (90) فیصد سے زیادہ تعلیم یافتہ بنا دیئے اور ایسی حیرت انگیز ترقی

کی کہ یورپ کی حکومتیں اس سے لرزہ براندام ہو گئیں مگر انگریزی حکومت تقریباً پونے دو سو برس میں (یعنی 1765ء سے لے کر 1931ء تک دس فیصد تعلیم یافتہ نہ بنا سکی۔

> "حسب بیان مسز جان گنتھر 1943ء میں جبکہ امریکہ اور انگلستان میں ایک فیصد بھی خواندہ اور جاہل نہ تھا۔ تو ہندوستان میں نوے فیصد جاہل محض اور خواندہ پائے جاتے ہیں۔ (121)"

> "حالانکہ سوویٹ روس نے ایسے تعلیم یافتہ بنائے جنہوں نے جرمنی جیسی ترقی یافتہ اور سائنسدان قوم کو شکست دے کر نہ صرف اپنے ملک سے نکال باہر کر دیا بلکہ ان کے پایہ تخت میں گھس گئے برخلاف اس کے انگریزوں نے جو تعلیم یافتہ ہندوستان میں بنائے وہ معمولی معمولی صنائع پر قادر نہیں ہیں سوائے اس کے کہ دفاتر میں کلرکی کی خدمتیں انجام دیں اور کسی قسم کی قابلیت ان میں نہیں پائی جاتی اور کیوں نہ ہو سائمن رپورٹ کے مواقف جبکہ انگلستان میں صرفہ تعلیم فی کس سالانہ 2 پونڈ 15 شلنگ یعنی 41 اور امریکہ میں 56 فی کس سالانہ تھا تو ہندوستان میں صرفہ تعلیم فی کس سالانہ 9 پنس یعنی 9 پیسے تھا۔ اور 1943ء میں حسب بیان مسز جان گنتھر جبکہ امریکہ فی کس سالانہ تعلیم پر چار سو ڈالر خرچ کر رہا تھا اور انگلستان فی کس دو سو ڈالر خرچ کر رہا تھا تو ہندوستان میں برطانیہ فی کس سالانہ تین ڈالر خرچ کرتا تھا۔" (122)

جب اس قدر خود غرضی اور کوتاہ اندیشی اور ہندوستان دشمنی سے کام لیا جائے تو بجز اس کے کیا نتیجہ ہو گا۔ انھیں ملعون اغراض کی بناء پر ہمیشہ انگریزوں نے ہندوستان میں تعلیم کی مد میں ایسی ایسی مشکلات اور پیچیدگیاں پیدا کیں جن کی بنا پر یہ ملک انتہائی جہالت میں پھنس کر رہ گیا۔ 26-1925ء میں ہندوستان کی آمدنی میں سے جبکہ ڈیفنس پر (39ء5) فیصد اور انتظام ملکی پر (39ء2) فیصد خرچ کیا جا رہا تھا تو مد تعلیم پر (6-7) صرف کیا جاتا تھا مدت دراز سے ہندوستان میں جبریہ تعلیم کا مسئلہ چل رہا ہے مگر سب سے بڑی رکاوٹ اس کے راستہ میں یہی رہی کہ اس کام کے لیے کافی روپیہ نہیں ملا۔ جب بھی تعلیمات پر سوال اٹھایا گیا تو یہی جواب ہوتا تھا کہ بجٹ میں روپیہ نہیں ہے حالانکہ ساٹھ کروڑ روپیہ سالانہ کے قریب فوج پر اور اسی طرح بڑی بڑی رقوم پولیس وغیرہ پر صرف کی جاتی رہیں جن کی

غرض صرف اس قدر تھی کہ برطانوی حکومت کی سطوت اور جبروت قائم رہے اور اس سے رعایا کا ایک ایک فرد حکام کے چنگل میں پھنسا رہے۔

سرجان سائمن اپنی رپورٹ میں لکھتا ہے۔

> "ہندوستان کے مشکلات کی جڑ بالیقین فوج ہے۔ مرکزی حکومت ہند کے موجودہ اخراجات کا ساڑھے باسٹھ فیصد ڈیفنس پر صرف ہو جاتا ہے جو دنیا بھر سے زائد صرفہ ہے۔ تمام مملکت برطانیہ کی نسبت دو سے تین گنا تک ہندوستان ڈیفنس پر زائد صرف کرتا ہے۔ یہ بھی قابل لحاظ ہے کہ 1913ء اور 1928ء میں برطانیہ عظمیٰ کے مصارف جنگ 49 فیصد بڑھے۔ نو آبادیات کے 33 فیصد۔ مگر ہندوستان کے اعداد اس مدت میں دوگنے ہو گئے۔ واقعہ یہ ہے کہ انگریزی افواج کے اخراجات ہندوستان میں ہیبت ناک ہیں۔ ایک انگریز سپاہی کا صرفہ ہندوستانی سپاہی سے چوگنا پانچ گنا زیادہ ہوتا ہے۔ توپ خانہ اور ہوائی فوج میں ہندوستانی کو کمیشن ملنا ممنوع ہے۔(123)"

برخلاف اس کے انگلستان میں جنگ عظیم کے دوران میں اس امر کی ضرورت محسوس ہوئی کہ ثانوی تعلیم کو جبریہ کر دیا جائے۔ وہ وقت ایسا سخت تھا کہ سلطنت کو فوجی اخراجات کے لیے لاکھوں روپیہ روزانہ کی ضرورت ہوتی تھی۔ مگر عین جنگ کے زمانہ میں 1918ء میں ایک قانون پاس کیا گیا جس کی رو سے انگلستان کے ہر بچہ کے لیے ہائی اسکول تک کی تعلیم جبریہ اور مفت کر دی گئی اور جس طرح بن پڑا اس کے لیے روپیہ فراہم کیا گیا(124)

انہیں وجوہ سے سرڈی ہملٹن نے کہا تھا کہ۔

> "اگر کبھی انگریزوں کو ہندوستان اس طرح چھوڑنا پڑا جس طرح رومن نے انگلستان چھوڑا تھا تو وہ ایک ایسا ملک چھوڑ جائیں گے جس میں نہ تعلیم ہو گی نہ حفظان صحت کا سامان ہو گا اور نہ ہی دولت ہو گی۔"

انگریزوں کے ہاتھوں ہندوستان میں فرقہ واریت کا فروغ

تمام سمجھ دار لوگوں بے سمجھ لوگوں کا بھی تسلیم کیا ہوا اصول ہے کہ اتفاق و اتحاد' رواداری اور میل ملاپ ہی انسانی فلاح و بہبود اور دینوی اور دینی ترقی اور راحت و آرام کا ذریعہ ہے انسان کی صاحب عقل و شرافت ہے وہ اگر احساس کرے تو ایسے تعجب کی بات نہیں مگر یہ چیز تو جنگلی حیوانوں اور درندوں تک میں پائی جاتی ہے وہ اتحاد و اتفاق سے بسر کرتے ہیں اور اس کے پابند رہتے ہیں۔ اسی طرح سب مانتے ہیں کہ جھگڑا' لڑائی' تنفر اور عداوت' بدامنی اور فساد ہر طرح سے بربادی کے قوی اسباب ہیں۔ جن کی اجازت کسی طرح نہیں دی جا سکتی مگر برا ہو خود غرضی اور نفسانی خباثتوں کا کہ وہ انسانوں اور اقوام کو ایسی ایسی ملعون پالیسیوں پر مجبور کرتی ہیں جن کی وجہ سے قوموں کی قومیں بربادی کی بھینٹ چڑھ جاتی ہیں۔ یورپین اقوام اور بالخصوص برطانوی قوم نے یہی پالیسی تمام ایشیائی اور افریقی اقوام کے ساتھ (اپنے اقتدار اور لوٹ کھسوٹ کے لیے) ضروری سمجھی جس ملعون طریقہ سے بھی ممکن ہو ہندوستان کو حاصل کرنا۔ پھر پورے ملک کو زیر و برباد اور اپنے پنجہ آہنی کے اندر دبا کر چوستے رہنا انگلینڈ کی حکمت عملی رہی ہے جب مقاصد ایسے ہلاکت انگیز ہوں تو ملکوں کی بربادی میں کیا شک و شبہ ہو سکتا ہے مگر درندوں کو اس کی کیا پرواہ' ان کو خون چوسنے سے مطلب تھا شکار مرے یا جئے برطانیہ کی دو سو سالہ شرمناک پالیسی نے ہندوستان کو سخت فلاکت اور بربادی کے گڑھے میں ڈال دیا اور ایسے گندے اخلاق اور اعمال میں مبتلا کر دیا کہ صدیوں کے بعد اس کو سنبھلنے کی نوبت آ سکے گی۔ ہم مختصر طور سے اس شرر انگیز پالیسی کا فوٹو کھینچتے ہیں جس سے ہمدردی' انسانیت اور خدمت خلق کے برطانوی دعووں کا پول کھل جائے گا اور حقیقت حال بے نقاب ہو جائے گی۔

فرقہ واریت اور منافرت کی چنگاریاں سلگانا اور ان کو ہوا دینا

سرجان میلکم کہتا ہے

> "اس قدر وسیع ملک میں ہماری غیر معمولی قسم کی حکومت کی حفاظت اس امر پر منحصر ہے کہ ہماری عملداری میں جو بڑی جماعتیں ہیں ان کی عام تقسیم ہو اور پھر ہر ایک جماعت کے ٹکڑے مختلف ذاتوں اور فرقوں اور قوموں میں ہوں جب تک یہ لوگ اس طریقہ سے جدا رہیں گے اس وقت تک غالباً کوئی بغاوت اٹھ کر ہماری قوم کے استحکام کو متزلزل نہ کرے گی۔ "

اسی مقصد کے لیے ایسی تاریخیں لکھی گئی جن میں ہندوؤں پر مسلمان بادشاہوں کے فرضی اور غیر واقعی مظالم بھیانک صورتوں میں دکھلائے گئے۔ جن میں سے مشہور تاریخ سر ہنری ایلیٹ کی ہے جنہیں یہ بات سخت ناگوار تھی کہ لکھے پڑھے ہندو مسلمانوں کی گزشتہ عہد حکومت کی تعریف کیوں کیا کرتے ہیں اور عہد جدید کی عیب جوئی کرتے ہیں۔ چونکہ اس زمانہ میں جس قدر کتابیں اور تاریخیں خود ہندو مصنفین کی لکھی ہوئی تھیں ان سب سے مسلمانوں کی عظمت و وقعت کا اظہار ہوتا تھا اور اس کو بعض انگریز برداشت نہ کر سکتے تھے اس لیے سب سے اول سر ہنری ایلیٹ نے جو کہ ہندوستان میں بڑے بڑے عہدوں پر رہے تھے اور آخر میں گورنمنٹ ہند کے صیغہ خارجہ کے سکریٹری ہو گئے تھے ہندوستان کی ایک تاریخ لکھ کر اس کی پہلی جلد 1849ء میں شائع کی۔ یہی وہ سب سے پہلی تاریخ ہے جس نے زمانہ قدیم اور بالخصوص مسلمانوں کے عہد کے خلاف خوب زہر اگلا ہے تاریخی میدان میں یہی وہ پہلی کتاب آئی جس کے ترجمے دیسی زبان میں کرا کے ان کے ذریعے اسکولوں میں پڑھنے والے بچوں کے دلوں میں مسلمانوں کی طرف سے غبار اور دشمنی کا بیج بویا گیا۔ اگر کسی شخص کو اس تاریخ کے لکھے جانے کا مقصد معلوم کرنا ہو تو اس کے لیے صرف اس کا دیباچہ پڑھ لینا بالکل کافی ہو گا۔ جس میں مورخ نے اپنے منشاء کو واضح اور صاف لفظوں میں لکھ دیا ہے مثلاً صاحب موصوف تحریر فرماتے ہیں۔

> "بڑا افسوس ہندو مصنفین پر آتا ہے جن سے ہمیں توقع ہو سکتی تھی کہ اس قوم کے محسوسات توقعات اور معتقدات ہمیں معلوم ہوتے مگر وہ تو احکام اور ہدایات کے مطابق لکھتے ہیں۔ ماہ محرم کو محرم شریف اور قرآن کو کلام پاک کہتے ہیں۔ اپنی تحریرات کو بسم اللہ سے شروع کرتے ہیں۔ "

ایلیٹ صاحب کو ہندو مصنفین کی اس بات پر سخت غصہ تھا کہ وہ مسلمانوں کے

براسم اور مذہب کی اس قدر عظمت کیوں کرتے ہیں ایک معمر ہندو مصنف نے کہیں کہہ دیا تھا کہ وہ اپنی ارتھی کے قریب اور اپنی قبر کے کنارے کھڑا ہے تو ایلیٹ صاحب ناراض ہو کر فرماتے ہیں کہ اسے علم ہو گا کہ میری لاش جلا کر اس کی راکھ گنگا میں بہادی جائے گی پھر اس نے قبر کے کنارے کھڑا ہونا کیوں لکھا۔ حالانکہ مصنف مذکور نے جو کچھ لکھا تھا وہ محض اس لیے لکھا تھا کہ ایک بات کو مختلف پیرایوں میں ادا کرنا لٹریچر کی ایک خوبی سمجھا جاتا ہے۔ سب سے زیادہ ایلیٹ صاحب کو اس بات پر غصہ تھا کہ:

> ”اب جب کہ ہندو اپنے ظالم (یعنی مسلمان) آقاؤں کے چنگل سے نکل کر آزاد ہو گئے اور بغیر روک ٹوک کے اپنے دل کی باتیں ظاہر کر سکتے ہیں تب بھی ان غلامانہ ذہنیت کے لوگوں میں سے ایک بھی اپنے ملک کے محسوسات کے مطابق نہیں لکھتا۔ یا طویل زمانہ کی مظلومیت کے خیالات اور جذبات کا اظہار نہیں کرتا۔“

مگر حقیقت یہ ہے کہ ہندوؤں کو اگر مسلمانوں کے زمانہ میں تکلیف پہنچی ہوتی تو وہ آزادی کے زمانہ میں ضرور اس کا اظہار کرتے۔ البتہ ایلیٹ صاحب کو اس سے سخت تکلیف پہنچی تھی کہ ہندو مسلمانوں کے عہد حکومت کی کیوں تعریفیں کرتے تھے اور انگریزوں کے عہد کی کیوں عیب جوئی کرتے تھے۔ اسی لیے انہوں نے کوشش کی کہ تاریخوں کے پرانے انباروں میں سے ایسے واقعات نکالیں جن سے یہ نتیجہ نکالا جا سکے کہ مسلمانوں کا عہد ظالمانہ اور انگریزوں کا عہد خدا کی رحمت تھا۔ چنانچہ اس مقصد کو انہوں نے حسب ذیل الفاظ میں واضح کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

> ”اگرچہ پرانی تاریخوں کی قدر و قیمت کم ہے تاہم بغور مطالعہ کرنے سے ان میں بہت سا مواد مل سکتا ہے ان کے ذریعہ سے جہالت کا دھندلا پن دور کیا جا سکتا ہے جس نے ہندوستان کی معلومات کو تاریک کر رکھا ہے اور یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کے عہد کی تاریخ ابھی لکھنے کو باقی ہے۔ ان سے رعایا کو بے شمار فوائد کا احساس کرایا جائے گا جو ہماری نرم اور منصفانہ حکومت سے حاصل ہوئے ہیں۔“

ایلیٹ صاحب کو ہندوؤں کے وہ تعریفی کلمات جو کہ اسلامی عہد حکومت کے متعلق کہتے یا لکھتے تھے نہایت ناگوار ہوتے تھے حالانکہ وہ واقعیت پر مبنی تھے اور اسی طرح جو

کلمات انگریزی حکومت کے متعلق تنقید و احتجاج کے کہتے تھے وہ بھی حقیقت رکھنے والے تھے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ہندو مصنفین انہیں وجوہ سے جو کہ واقعی اور صحیح تھیں اور جن کا مشاہدہ اور معاملہ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر اور اپنے باپ دادوں سے سن کر یقینی طور پر مانتے تھے مسلمانوں کے عہد حکومت کی تعریفیں کرتے تھے۔ اور انگریزوں کے عہد کی عیب جوئی کرتے تھے۔ ایلیٹ صاحب آنکھوں میں دھول جھونک کر اور واقعات کو چھپا کر اور مسخ کر کے بلکہ فرضی اشیاء درمیان میں لا کر چاہتے تھے کہ مسلمانوں کے عہد حکومت کو ظالمانہ اور انگریزوں کے عہد حکومت کو نرم اور منصفانہ ثابت کریں۔ حالانکہ انگریزوں نے بڑے بڑے انتظامی اور فوجی عہدوں پر آخر تک کسی ہندوستانی کو فائز نہیں ہونے دیا۔ اور وہ انسانیت سوز اور برباد کن کاروائیاں کرتے رہے کہ جن کی مثال متمدن دنیا میں نہیں ملتی ایک عجیب بات یہ ہے کہ ایلیٹ صاحب کو پرانے زمانے کے ہندو مسلمان مورخوں پر ہی غصہ نہیں بلکہ جدید تعلیم یافتہ ہندوستانیوں پر بھی غصہ ہے جن کے لیے تحقیر کے طور پر وہ بابو کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں۔

> ”اب ہم ان شاندار بابوؤں کی کچھ نہ سنیں گے جنہیں ہماری گورنمنٹ کے عہد میں حد درجہ آزادی اور بہت سے سیاسی حقوق حاصل ہیں جو کبھی کسی مفتوح قوم کو نہیں دیئے گئے جو ملکی ہمدردی کا دم بھرتے اور اپنی موجودہ ذلت کا رونا روتے ہیں۔ اگر وہ تاریخ میں غوطہ لگائیں گے تو انہیں معلوم ہو جائے گا کہ جس زمانے کے واپس آنے کی تمنا کرتے ہیں اس میں اگر وہ محض زبان سے ان لغویات کو ظاہر کرتے تو انہیں سیسہ پلا دیا جاتا یا دیوار میں چن دیا جاتا۔ اب ہم بلا لگان آراضی کے متعلق شور و غوغا سننے پر مجبور نہ ہوں گے۔ درانحالیکہ تاریخ کے ہر صفحہ سے ظاہر ہے کہ پہلے زمانہ میں کوئی ملکیت ایسی نہ تھی جو قانوناً ضبط نہ ہو سکتی اور نہ ہوتی ہو۔“

مورخ کی بڑی تعریف یہ سمجھی جاتی ہے کہ نفسانیت‘ ذاتیات اور خود غرضانہ جذبات سے بالاتر ہو کر لکھے۔ برخلاف اس کے جو کتاب محض دو قوموں میں منافرت پھیلانے کی غرض سے لکھی جائے اور لکھتے وقت صاف الفاظ میں کہا جائے کہ قدیم تاریخوں میں کچھ

نہیں ملتا بلکہ واقعات سے اپنے حسب منشاء نتائج نکالے جاتے ہیں۔ جو مورخ اپنوں اور غیروں سب پر اس بات سے ناراض ہو کہ فلاں زمانے یا فلاں قوم کی کیوں تعریف کی جاتی ہے' ہندوؤں پر اس لیے ناراض ہو کہ مسلمانوں کی سلطنت جانے پر مسلمان بادشاہوں کی برائی نہیں کرتے اور ہمارے زمانہ کی خوبیوں کی تعریف کرنے کی جگہ اس کی عیب جوئی کرتے ہیں اور اپنے مقصد کو صریح الفاظ میں لکھ دے کہ اس کی غرض بابوؤں کی تردید اور انگریزوں کی سلطنت کے فوائد ذہن نشین کرانا ہے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسے شخص کی تصنیف کا شمار تو تواریخ میں کس طرح کیا جا سکتا ہے۔ مگر ہندوستانیوں کی قسمت اسی روز پھوٹ گئی جبکہ اس قسم کی کتابوں کی بناء پر دیسی زبانوں میں تاریخیں لکھی گئیں۔ اسکولوں میں جاری کی گئیں اور رفتہ رفتہ وہی جھوٹ اور افتراء پردازیاں موجودہ تاریخ کا جز بنا دی گئیں چنانچہ یہی وہ تعلیم ہے جس کا پھل چکھنے سے ہندوستان میں مذہبی افتراق پیدا ہوا اس کی تصدیق سر جان مینارڈ ممبر ایگزیکٹو کونسل پنجاب کے سینئر ممبر کے حسب ذیل قول سے ہوتی ہے جس کو اس نے لندن کے ایک جریدہ موسومہ معاملات خارجیہ میں شائع کیا تھا۔

> "ہندوستان میں خانہ جنگی کی طرف رجحان موجود ہے۔ جس کا ایک نمونہ ہندو مسلم عناد ہے اور یہ ایک حقیقت ہے کہ اگر یہ رجحان نہ ہوتا تو ہماری حکومت قائم نہ ہو سکتی نہ برقرار رہ سکتی۔ یہ بھی صحیح ہے کہ ہندو مسلمانوں میں عام مخالفت برطانیہ کے عہد میں شروع ہوئی۔ اگرچہ اس سے پہلے بھی ظالم بادشاہ گزرے ہیں جن میں سے کسی نے غیر مسلموں پر جزیہ لگایا اور کسی نے ذبیحہ گاؤ پر مجنونانہ جوش میں آکر سزائیں دیں لیکن یہ واقعات گاہے گاہے پیش آتے تھے۔ شجر علم کا پھل چکھنے سے پہلے عوام میں مذہبی افتراق کا احساس نہ تھا خواہ ہندو یا مسلمان دونوں ایک ہی معبد میں مصروف بہ پرستش ہوتے تھے۔(126)"

اب سوال یہ ہے کہ وہ کون سا پھل تھا جس کے چکھنے سے مذہبی افتراق پیدا ہوا اس کا جواب صاف یہ ہے کہ نہ علوم قدیمہ میں کوئی ایسی بات تھی جس سے مختلف قوموں میں افتراق ہوتا نہ علوم جدیدہ میں کوئی ایسا مضمون تھا جس سے ہندو مسلم فسادات ہوتے اور نہ عام تاریخوں میں ایسی سمیت (زہر) تھی بلکہ سمیت جو کچھ تھی وہ اس قسم کی

تاریخوں میں تھی جس کی ابتداء ایلیٹ صاحب نے کی تھی- ان کے بعد مسٹر کیمس ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم نے اسی نوعیت کی ایک تاریخ لکھی جس کی شکایت سرسید احمد خان نے کی ہے- اسی قسم کی کتابیں اسکولوں کے درس میں داخل کی گئیں- ان کے ترجمے اردو میں کرا کے تمام ملک میں پھیلائے گئے جنھوں نے ملک کے امن کو باہمی خلفشار اور کشاکش میں بدل دیا اسی قسم کی فضا میں ملک میں فرقہ وارانہ اور نام نہاد سیاسی جماعتیں پیدا ہوئیں جو ملک کی سیاسی ترقی میں مزاحم ہو کر غیر ملکی حکومت کی بالواسطہ امداد کرتی رہتی تھیں-(127)

ان تاریخی کتابوں اور اس قسم کے پروفیسروں اور مدرسوں نے گزشتہ بادشاہوں اور راجاؤں کی متعصب 'کٹر مذہبی' مذہبی دیوانے وغیرہ الفاظ سے ملقب کر کے تحریروں اور تقریروں میں زہر پھیلا کر ملک کی فضا کو نہایت زیادہ گندا کیا- نو عمر' جوشیلے' ناتجربہ کار ناواقف طلبہ کے سادہ اور صاف قلوب ان زہریلے مواد سے ایسے زہر زدہ ہو گئے کہ ان کی اصلاح باوجود کھلی بربادی اور نہایت مضرت رساں نتائج دیکھنے اور اقرار کرنے کے نہیں ہوتی اور نہ دلوں کی صفائی ہوتی ہے- اسی کی شکایت ڈبلیو ایم ٹارانس اپنی کتاب "ایشیا میں شہنشاہیت" میں کرتا ہے- مندرجہ ذیل الفاظ ملاحظہ ہوں-

> "سیواجی کو متعصب اور سلطان ٹیپو کو کٹر مذہبی کہا جاتا ہے- لیکن جس وقت ہم نے جنوبی ہند کی ریاستوں میں دخیل ہونا شروع کیا اس وقت ان کے یہاں اس قسم کے مذہبی تنفر کا کہیں نام تک نہ تھا جس طرح انگلستان اور یورپ کے تقریباً سب حصوں میں مخلوق تباہ کرنا روا رکھا جاتا تھا- جب آئرلینڈ میں کوئی رومن کیتھولک نہ اپنے بزرگوں کی جاگیر کا حق دار سمجھا جاتا تھا نہ فوج کا افسر ہو سکتا تھا- جب سویڈن میں سوائے لوتھر کے معتقدین کے اور کسی عقیدہ کا کوئی ملازم نہیں ہو سکتا تھا- ٹھیک اس وقت ہندوستان کے اندر ہر شہر اور شاہی دربار میں ہندو مسلمان عزت اور سرمایہ کمانے میں اور ایک دوسرے سے بازی لے جانے میں آزاد تھے-"

گزشتہ شہادتیں جو کہ نہایت صحیح ہیں بتلاتی ہیں کہ بابر' ہمایوں' اکبر' جہانگیر' شاہجہان' اورنگ زیب اور دیگر سلاطین مغلیہ اور اسی طرح سیواجی اور سلطان ٹیپو اور دوسرے

نواب اور راجہ فرقہ وارانہ تعصبات نہ اپنے دلوں میں رکھتے تھے نہ اپنے احکام شاہی اور اپنے درباروں میں استعمال کرتے تھے۔ ہاں حکومت اور ملک کے لیے بے شک لڑتے جھگڑتے رہتے تھے۔ مگر ہندو راجاؤں کے ساتھ مسلمان اور مسلمان بادشاہوں اور نوابوں کے ساتھ ہندو فوجی افسری اور ملکی نظام میں شریک رہتے تھے اور ہر ایک کو دوسرے پر اعتماد ہوتا تھا۔ جہانگیر اپنے تمام توپ خانہ کو راجہ بکرماجیت کی کمان میں رکھتا ہے۔ مرہٹے اپنی تمام توپ خانہ کی قوت کو ابراہیم کردی کے زیر کمان رکھتے تھے۔ "توپ خانہ ایسی اہم چیز ہے کہ اس پر لڑائی کا تمام تر دارومدار ہوتا ہے چنانچہ آج تک انگریزوں نے اپنے توپ خانہ کو ہندوستانیوں کی ہوا بھی نہیں لگنے دی۔ بہر حال اس لڑائی میں احمد شاہ ابدالی کے مقابلہ میں جبکہ مرہٹے ہار گئے اس وقت احمد شاہ ابدالی نے مسلمان توپچیوں کو ان کی مردانگی اور نمک حلالی پر بڑی داد دی اور ان سے خواہش کی کہ وہ احمد شاہ کی فوج میں آ جائیں اس پر مسلمانوں نے جواب دیا کہ ان کے آقا ہاریں یا جیتیں وہ ان کا ساتھ چھوڑ کر دوسری جگہ نہیں جا سکتے۔(128)"

اورنگ زیب مرحوم جس کو انگریزوں نے بعد میں متعصب مشہور کیا اور پھر سرکار جادو نے بھی انگریزوں کی ہمنوائی کی ہم اس کے متعلق مسٹر آرنلڈ کی تاریخی شہادت اور دوسرے مورخین کی شہادتیں (پہلے باب میں) پیش کر چکے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نہایت فراخ حوصلہ اور دریا دل غیر متعصب بادشاہ تھا۔ ہفت ہزاری منصب پر اکبر کے یہاں صرف ایک ہندو فائز ہوتا ہے مگر عالمگیر کے یہاں اس منصب پر ایک فہرست میں دو اور دوسری میں تین ہندو امراء نظر آتے ہیں اس کے سپہ سالاروں میں جے سنگھ' جسونت سنگھ ساہو پسر مہاراجہ سیتا راجندجی داماد سیواجی مالوی بھونسلہ وغیرہ پائے جاتے ہیں۔ سیوا جی کے مقابلہ کے لیے جے سنگھ سپہ سالاری کرتا ہوا پہنچتا ہے اور اس کو قید کرتا ہے۔ سیوا جی معافی طلب کرتا ہے تو عالم گیر اس کو معاف کر دیتا ہے۔ انگریزی قانون اور عملدرآمد میں تو صرف سازش (کانس پریسی) پر رسڈیشن ایکٹ کے تحت موت یا کالے پانی کی سزا دینی ضروری ہو جاتی ہے۔ بغاوت کے تحقیق پر تو ٹھکانہ ہی نہیں۔ مگر سیواجی کھلی بغاوت کرتا ہے اور بادشاہی قلمرو کو لوٹتا اور فوجوں سے مقابلہ کرتا ہوا ہزاروں کا خون بہاتا ہوا پکڑا جاتا ہے مگر معافی مانگنے پر دوبارہ چھوڑ دیا جاتا ہے اور خلعت پاتا ہے۔ تیسری مرتبہ پھر بغاوت کرتا ہے اور گرفتار ہو کر بادشاہ کے سامنے پیش ہوتا ہے۔ اورنگ زیب اس کو قتل نہیں

کرتا بلکہ قلعہ میں قید کر دیتا ہے جہاں سے کچھ عرصہ کے بعد وہ فرار ہو جاتا ہے۔ اسی طرح تمام نوابوں اور بادشاہوں کا حال تاریخ میں موجود ہے۔ سلطان ٹیپو کا دیوان معتمد سردار پورنیار برہمن تھا۔ سراج الدولہ (نواب بنگال) کا صدر دیوان (وزیر اعظم) موہن لال پٹنہ کا گورنر رام نرائن تھا۔ آصف الدولہ (نواب اودھ) کا وزیر اعظم بھاؤ لال تھا۔ روہیلہ نواب حافظ رحمت خاں کا وزیر اعظم راجہ مان رائے تھا۔ اور اس وفات کے بعد اس کا بیٹا راؤ پہاڑ سنگھ ہوا۔ نواب کو اس قدر اعتماد تھا کہ نوابوں اور گورنر جنرل کے پاس ایلچی بنا کر ان کو بھیجا جاتا تھا۔ چنانچہ تاریخ روہیلکھنڈ معروف بہ "حیات حافظ رحمت خاں" صفحہ 288 کی مندرجہ ذیل عبارت ملاحظہ ہو۔

(ہندوؤں کے ساتھ برتاؤ) طرز حکمرانی اور ذاتی حالات کے ضمن (پہلے باب) میں ہم نے عام رعایا کے ساتھ حافظ الملک کے حسن سلوک اور ان کی عطا کردہ مراعات کا تذکرہ کیا ہے وہ محض مسلمانوں کے لیے ہی مخصوص نہ تھیں بلکہ ہندو بھی ان سے مستفید ہوتے تھے۔ شریعت اسلامیہ کے سچے اور پکے پیرو ہونے کے باعث اور اسلام کے پاک اصولوں کو صحیح طور پر سمجھنے کی وجہ سے حافظ الملک اپنی اس رعایا کو جو امن پسند تھی اور مسلمانوں کی مذہبی آزادی میں خلل اندازی نہ کرتی تھی ہر طرح کا آرام پہنچانا اور اس کے لیے ترقی کی راہیں کھولنا اپنا فرض ایمانی سمجھتے تھے۔ مسلمانوں کی طرح ہندوؤں کو اپنے فرائض مذہبی کی ادائیگی میں پوری پوری آزادی حاصل تھی۔ آئے دن بڑے بڑے مندروں اور دوسری عبادت گاہوں کی تعمیر ہوتی تھی اور حکومت کسی قسم کی مزاحمت نہ کرتی تھی۔ مذہبی تہوار بدستور بڑی دھوم دھام اور شان و شوکت سے منائے جاتے تھے۔ اور مسلمانوں کی جانب سے کسی طرح کی روک ٹوک نہ ہوتی تھی۔ گائے باجا اور محرم ورام لیلا کے قضیوں کا وجود نہ تھا۔ اور روہیلوں کے ابتدائے زمانہ حکومت سے انتہا تک کسی ہندو مسلم فساد کا پتہ نہیں ملتا۔ پہلا ہندو مسلم فساد دارالحکومت بریلی 1837ء میں ہوا جبکہ روہیلوں کی حکومت کا خاتمہ ہو چکا تھا۔

مخالف و موافق مورخین کی تمام مستند تاریخوں کی ورق گردانی کر لی جائے لیکن کوئی ایک واقعہ نظر سے نہ گزرے گا جس سے یہ ظاہر ہو کہ ہندوؤں نے اس سرزمین میں اپنی غالب اکثریت کے باوجود من حیث القوم مسلمان حکمرانوں کے خلاف کوئی مذہبی بغاوت کی ہو۔ ہو سکتا ہے کہ طاقتور حکومت کا خوف اس امر میں مانع ہوا ہو لیکن ہنگامہ 1857ء

میں تو روہیلہ حکومت کو زوال ہوئے عرصہ گزر چکا تھا پھر جب حافظ الملک کے پوتے خان بہادر خاں نے از سر نو روہیلہ حکومت قائم کرنا چاہی تو ان کی تقریباً ساٹھ ہزار فوج میں بہ تعداد کثیر ہندو شامل تھے۔ اس واقعہ سے ظاہر ہے کہ ہندوؤں کے ساتھ روہیلوں نے اپنے عروج کے زمانہ میں کس قسم کا سلوک کیا ہو گا۔ جس کی خوشگوار یاد نے انہیں ایسا کرنے پر مجبور کیا۔

علماء صوفیہ اور مشائخ بطور خود مذہبی تبلیغ کرتے تھے لیکن تبلیغ حکومت کے فرائض میں شامل نہ تھی۔ نہ حکومت کی طرف سے اس کام کے لیے روپیہ دیا جاتا مسلمانوں کی اعلیٰ معاشرت کو پسند کر کے یا ان کے عمدہ مذہبی اصولوں کو بہتر سمجھ کر اگر کوئی ہندو اسلام قبول کرتا تو کوئی مضائقہ نہ تھا۔ خود ہندوؤں میں زمانہ حال کی طرح اس زمانہ میں تبلیغ مذہب کا طریقہ رائج نہ تھا ورنہ اس کی یقیناً ممانعت نہ ہوتی۔ اور جس طرح عہد قدیم میں اسلامی حکومت سے پہلے ہندو راجاؤں نے اپنی اپنی مملکتوں میں عرب کے مذہبی مبلغ تاجروں کو مسجدیں بنانے اور تبلیغ اسلام کی اجازت دینے میں پس و پیش نہ کیا اسی طرح مسلمان حکمراں ہندوؤں کو اپنا مذہب پھیلانے کی اجازت دے دینے میں مطلق تکلف نہ کرتے۔

اگر روہیلے زبردستی ہندوؤں کو مسلمان بناتے تو آج روہیل کھنڈ میں ہندوؤں کی نہیں مسلمانوں کی اکثریت ہوتی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ روہیل کھنڈ کے صدر مقام یعنی خاص ضلع بریلی اور دارالاقامت پیلی بھیت تک میں ہندوؤں کی آج تک زبردست اکثریت ہے اور تمام ضعیف العمر ہندو اپنے تجربہ سے اور اپنے اسلاف کے اقوال سے یہی بیان کرتے ہیں کہ مسلمان اپنے طرز عمل میں ہمیشہ غیر متعصب رہے ہیں اور انہوں نے کبھی ہندوؤں کو اپنا مذہب چھوڑنے پر مجبور نہیں کیا۔ مذہبی آزادی کے علاوہ ہندوؤں کو زراعت و تجارت میں بھی گرانقدر مراعات و حقوق حاصل تھے بلکہ مسلمان تو بالعموم فوجی ملازمت کو زیادہ پسند کرتے تھے۔ زراعت و تجارت تمام و کمال ہندوؤں ہی کے ہاتھ میں تھی۔ ہندوؤں کی بعض قومیں مثلاً کھتری، ٹھاکر اور راجپوت فوج میں نوکری کرتے تھے، ویش خزانچی کے عہدوں کے لیے موزوں سمجھے جاتے تھے اور کالیتھ اہل قلم ہونے کے باعث حکومت کے تمام دفاتر میں ملازم تھے۔ سفارت کے اہم اور نازک فرائض بھی بالعموم ہندو معتمدین کے سپرد کئے جاتے تھے۔ چنانچہ حافظ الملک نے منشی ٹیک چند اور منشی چتر بھوج کو بارہا بڑی بڑی

اہم سفارتوں پر بادشاہ دہلی، مرہٹوں، جاٹوں، شجاع الدولہ اور انگریزوں کے پاس روانہ کیا۔ دیوان کا عہدہ جو مدارالمہام یا وزیر اعظم کے برابر سمجھا جاتا تھا خصوصیت کے ساتھ ہمیشہ ہندوؤں کے ہاتھ میں رہا پہلے راجہ مان رائے حافظ الملک کے دیوان رہے اور ان کے بعد راؤ پہاڑ سنگھ اس عہدہ جلیلہ پر فائز رہے جن کی جاگیر میں کم و بیش (460) گاؤں تھے ان لوگوں کے حافظ الملک سے نہ صرف برادرانہ اور عزیز دارانہ تعلقات تھے بلکہ یہ لوگ ان کے جملہ مالی اور ملکی معاملات میں سیاہ و سپید کے مالک اور غیر معمولی اختیارات کے حامل تھے حافظ الملک کی مجلس مشاورت جس میں اہم معاملات طے پاتے تھے اس میں ہندو اعیان دولت میں شریک ہوتے تھے جن کی موجودگی کے بغیر کوئی مجلس انعقاد پذیر نہ ہوتی تھی اور ان کی رائے کو بڑی وقعت دی جاتی تھی۔

حافظ الملک کی نظر میں اللہ کی تمام مخلوق یکساں طور پر عزیز تھی۔ جب وہ بذل و احسان کرتے تو یہ نہیں دیکھتے تھے کہ کون ہندو اور کون مسلمان ہے۔ شہر پناہ پیلی بھیت کی تعمیر کا واقعہ (پہلے باب میں) لکھا جا چکا ہے، میواتیوں اور مارواڑیوں کے واسطے جن میں مسلمانوں سے زیادہ ہندو تھے محض وجہ معاش مہیا کرنے کے لیے انہوں نے کس طرح ایثار و قربانی سے کام لیا۔ اسی طرح 1765ء میں آتشزدگی اور زلزلہ سے شہر بریلی پر تباہی آئی تو انہوں نے جو سلوک مسلمانوں کے ساتھ کیا وہی ہندوؤں کے ساتھ کیا۔ ایک اور واقعہ ہے کہ حافظ الملک جب صاحبزادہ ارادت خاں کی شادی کرکے شاہ جہانپور سے لوٹ رہے تھے تو پہلی منزل پر کسی رسالدار کا ایک ملازم کارپردازان رسد کے پاس آیا اور اس نے بیس سیر آٹا اور بیس سیر گھی طلب کیا۔ کارپردازوں نے اس سے دریافت کیا کہ تم تنہا ہو یا تمہارے ہمراہ اور لوگ بھی ہیں۔ تم کس امیر کے ملازم ہو اور کیا کام کرتے ہو۔ اس ہندو نے اپنے رسالدار کا نام بتایا اور کہا کہ میرے ساتھ دس اور آدمی ہیں اور یہ گھی رسالدار صاحب کے گھوڑوں کے واسطے لئے جاتا ہوں۔ میں خود رسالدار کے کہاروں میں ملازم ہوں۔ اتفاقاً جس رسالدار کا نام لیا گیا اس کے ملازم اسی وقت تمام اشیاء مطلوبہ لے جا چکے تھے۔ لہٰذا کارپردازوں کے دل میں شک پیدا ہوا اور انہوں نے تحقیق حال کے لیے ایک شخص کو اس رسالدار کے پاس بھیجا۔ تحقیق کے بعد اس ہندو ملازم کا جھوٹ اور فریب کھل گیا۔ چنانچہ اس کو فوراً پکڑ کر حافظ الملک کے حضور میں لے گئے اور تمام واقعہ عرض کیا۔ حافظ الملک نے حکم دیا کہ اس شخص کو پچیس سیر آٹا اور پچیس سیر گھی دیا جائے اور

فرمایا کہ اس قسم کی تحقیقات سے جو غریب لوگوں کے واسطے موجب خجالت ہوتی ہیں آئندہ پرہیز کیا جائے۔ حافظ الملک کی اسی رحم دلی' بیدار مغزی' روشن خیالی' بے تعصبی اور انصاف پسندی کا نتیجہ تھا کہ ان کی ہندو رعایا نے بھی اپنے قابل احترام آقا کے لیے وفاداری کی مثال قائم کر دی۔ جس وقت تمام مسلمان عزیز و اقارب اور سرداروں نے حافظ الملک کی جان بچانے کے لیے روپیہ فراہم کرنے سے انکار کر دیا اس وقت دیوان پہاڑ سنگھ کا چالیس لاکھ روپیہ کا پیش کش کرنا اور جب سخت بے سروسامانی میں حافظ الملک نے دہلی عزیز کی خاطر جنگ آزادی کے لیے علم جہاد کیا اس وقت جوق در جوق راجپوتوں کا آکر شریک حال ہونا ایسے واقعات نہیں ہیں جن کو دنیا جلد فراموش کر سکے گی۔ یہ ایسے واقعات ہیں جن کو تاریخ عالم میں ہمیشہ آب زر سے لکھا جائے گا۔

نیز رنجیت سنگھ کے وزیر اور معتمد خاص پیرزادہ عزیز الدین تھے۔ اور اس کے توپخانہ کے افسر اعلیٰ الٰہی بخش تھے۔ اسی نام سے توپ خانہ موسوم تھا۔ یہی نہیں کہ ان دنیادار بادشاہوں اور نوابوں اور راجاؤں کے یہاں آپس میں ایک دوسرے پر اس قدر اعتماد تھا بلکہ مذہبی لوگوں میں بھی یہی اعتماد اور وثوق تھا۔ سکھوں سے لڑائی میں حضرت سید احمد شہید بریلوی رحمتہ اللہ علیہ نے اپنے توپ خانہ کا چارج راجہ رام راجپوت ہندو کو دے رکھا تھا جس نے اتمان زئی کی جنگ میں سکھوں پر بہت سخت گولہ باری کر کے سکھوں کو شکست دی۔"(129)

غرض کہ زمانہ ماضی ہر دو فرقوں ہندوؤں اور مسلمانوں میں بہت زیادہ اعتماد اور وثوق اور میل جول اور رواداری کا تھا۔ ہندوستان میں مختلف مذہبوں اور عقیدوں کے لوگ ملی جلی آبادیوں میں مثل عزیزوں اور رشتہ داروں کے امن کے ساتھ یکجا رہتے تھے۔ انقلاب 1857ء تک مذہبی اور ملی اختلاف کا عوام میں وجود نہ تھا۔ جب فوجوں میں بغاوت اور انقلابی تحریک شروع ہوئی تو ہر مقام کے سپاہی اپنی اپنی چھاؤنیوں میں آگ لگا کر اور برباد کر کے دہلی کے معزول اور معطل بادشاہ بہادر شاہ مرحوم کی طرف دوڑ پڑے۔ سپاہی بہار تک سے آئے۔ ان میں ہر ملت اور مذہب کے ہندوستانی تھے ہندو سپاہی بھی بہادر شاہ کی جے پکارتے تھے۔ اگر موجودہ زمانہ کے تعصبات اس وقت ہوتے تو مسلمان سپاہی مسلمان بادشاہ یا نواب کے پاس ہی جاتے اور ہندو سپاہی کسی راجہ کے پاس جاتے مگر سب کے سب بلا تفریق مذہب و ملت معزول اور بے جان مسلمان بادشاہ کے گرد جمع ہو گئے۔

(1) مہاراجہ بھٹو عرف نانا صاحب مرہٹہ کانپوری نے کانپور پر قبضہ کیا تو بہادر شاہ کا سبز جھنڈا لہرا کر ان کے نام پر ایک ایک سو توپوں کی سلامی دی۔

(2) عظیم اللہ خان پیشکار نانا صاحب کی نسبت مشہور ہے کہ انقلاب 1857ء کی اسکیم انہیں کے دماغ کا نتیجہ تھیں۔ بڑا قابل اور انگریزی داں شخص تھا۔ نانا صاحب کی طرف سے ان کی مقدمہ کی پیروی کے لیے انگلستان گیا تھا اور وہاں سے روس بھی گیا تھا۔

(3) تانتیا ٹوپی کے مرہٹہ نے کالپی میں جنگ آزادی میں حصہ لیا اور کانپور میں نانا صاحب کی سپہ سالاری کی خدمات انجام دیں۔

(4) رانی جھانسی نے کمپنی کی فوج پر قبضہ کر کے شاہ دہلی کا پرچم لگایا اور خود گھوڑے پر چڑھ کر انگریزوں کے خلاف بہادری سے جنگ کی۔

(5) راجہ کنور سنگھ رئیس جگدیش پور صوبہ بہار اسی سال کی عمر میں انگریز سے لڑے اور انگریزی فوج کو مسلسل شکستیں دیں جس سے لارڈ کیننگ وائسرائے گھبرا گئے جب بنارس میں لارڈ مارک کی فوج سے مقابلہ ہوا تو راجہ صاحب بجلی کی طرح ادھر سے ادھر کوندتے پھرتے تھے۔ بلیا کے قریب گنگا پار کرتے ہوئے ان کے داہنے ہاتھ میں گولی لگی تو بائیں ہاتھ سے تلوار سے کاٹ کر پٹی باندھ دی تاکہ زہر نہ پھیلے اور آٹھ ماہ کی جنگ کے بعد اس ضعیف العمر سپاہی نے اپنی راجدھانی پر قبضہ حاصل کر لیا مگر زخم کی تکلیف سے انتقال کر گیا۔

(6) خان بہادر نواب روہیل کھنڈ کے آخری وارث تھے انہوں نے اپنے اعلان میں اس بات پر زور دیا کہ انگریز ہمیشہ وعدہ خلافی اور جائدادوں کی ضبطی کرتے رہتے ہیں۔ اور ہندو مسلمانوں کو لڑاتے رہتے ہیں اب دونوں کو مل کر ان کے خلاف لڑنا چاہیے۔ وہ روہیل کھنڈ پر قابض ہو کر خوب لڑے۔ اسی طرح بیگم حضرت محل زوجہ واجد علی شاہ بخت خان سپہ سالار نواب نجیب خاں اور مولانا احمد اللہ شاہ وغیرہ نے جنگ آزادی میں بہت کچھ کارنمایاں کئے۔

ان واقعات سے بخوبی ظاہر ہوتا ہے کہ جو ظلم و ستم اور جبر و تعدی پچھلی سلطنتوں کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں وہ نہ صرف غلط ہیں بلکہ حالت اس کے برعکس ہے (جیسا کہ ہم پہلے دکھلا چکے ہیں) ورنہ بادشاہ سے رعایا کی اس قدر گرویدگی کی جبکہ اس کی سلطنت جاتی رہی تھی کوئی وجہ نہ تھی۔ اس طرح نیتاجی پنڈت سبھاش چندر بوس جیسے تعلیم یافتہ غیر

مسلم کا بہادر شاہ کی قبر پر جاکر آنسو بہانا اور اظہار عقیدت کرنا ان افسانوں کے غلط ہونے کی دلیل ہے۔ (130)

باوجودیکہ انگریزوں کا نفاق ڈالنے کا اصول پہلے سے چلا آتا تھا مگر 1857ء میں ہندو مسلمان عوام الناس جنگ آزادی میں یکساں شریک ہوئے۔ یہ بات انگریزوں کو بہت زیادہ کھلی اس لیے اس وقت سے وہ اور زیادہ اس فکر میں رہے کہ دونوں قوموں کے درمیان کوئی مستقل خلیج پیدا کردیں جس سے یہ لوگ آپس میں کبھی نہ مل سکیں اس لیے مذکورہ تاریخیں بطور پروپیگنڈہ ایلیٹ اور کیمسن صاحبوں کی لکھی گئیں اور ان میں ہندؤں پر مسلمان بادشاہوں کے مظالم دکھائے گئے پھر وہ اور ان کے ترجمے اسکولوں اور کالجوں اور یونیورسٹیوں کے کورس میں داخل کرکے نوجوان طلبہ کو پڑھائے گئے علاوہ ازیں۔

(1) جداگانہ انتخاب اور مسلم لیگ اور مہاسبھا کی بنیاد' نیز قربانی گاؤ اور مساجد کے سامنے باجے کی ممانعت وغیرہ بھی اسی کے ذرائع اور وسائل قویہ ہیں۔ نیز دفتروں میں ملازمتوں کا اتار چڑھاؤ ہمیشہ سے اس کی بنیاد قرار دیا گیا ہے۔ اس قسم کی تاریخیں انگریزی درسگاہوں میں پڑھانے اور دوسری تدبیروں کے عمل میں لانے سے ہندو مسلمانوں میں جدائی کی کوششیں قوی کردی گئیں۔

(2) لارڈ الفنسٹن گورنر بمبئی 14 مئی 1859ء میں ایک یادداشت میں لکھتا ہے۔ "نفاق ڈال کر حکومت کرنا رومیوں کا اصول تھا اور یہی اصول ہمارا بھی ہونا چاہیے۔ (131)"

(3) اس سے پہلے کارنے ٹیکس نے رسالہ ایشیاٹک جرنل میں 1821ء میں لکھا تھا۔

> "لڑاؤ اور حکومت کرو" رومن کا مقولہ ہماری ہندوستانی حکومت کا اصل اصول ہونا چاہیے عام اس سے کہ وہ سیاست یا تمدن یا فوج کشی کے متعلق ہو۔ (132")

(4) مسٹر ایڈورڈ ٹامسن اپنی کتاب ("انقلاب 1857ء کی تصویر کا دوسرا رخ") میں لکھتا ہے۔

> "برٹش سیاست کو مدنظر رکھتے ہوئے تو ہم نے مسٹر گلیڈ سٹون اور لارڈ سالسبری جیسے مشہور زمانہ مدبرین کے خیالات کو چھوڑ دیا ہے۔ کیونکہ وقت کی ضرورت ان کے برخلاف حکم دیتی تھی لیکن ہندوستان کے متعلق ہم ابھی تک اسی فرسودہ پالیسی پر عمل کر رہے ہیں۔ یہاں تک کہ ہندوستانیوں میں نااتفاقی اور باہمی اختلاف کو زندہ رکھنا قدیم سے ہمارے

سیاست دانوں کا نہایت مرغوب مشغلہ بنا ہوا ہے۔ لیکن ہندوستان اتفاق اور اتحاد کی ضرورت کا بیش از بیش احساس نہایت تیزی سے کر رہا ہے۔"(133)

(5) مندرجہ ذیل سوال و جواب میں میجر جنرل اسمتھ کے' سی بی کی عجیب و غریب شہادت ملاحظہ فرمایئے۔

سر ولیم ڈگبی از ترجمہ پراسپرس برٹش انڈیا ص 109

سوال نمبر 563 کیا آپ کسی طرح اس بات کی روک کر سکتے ہیں کہ دیسیوں کو اپنی طاقت کا علم نہ ہو۔

جواب - میرے خیال میں انسانی تاریخ میں کوئی ایسی نظیر نہیں ملتی کہ معدودے چند اغیار چند کروڑ آبادی کے ملک پر حکمرانی کر سکیں جسے آج کل رائے میں بادشاہت کہتے ہیں اس لیے جوں ہی وہ تعلیم یافتہ ہو جائیں گے تو تعلیم کی تاثیر سے ان کے قومی اور مذہبی تفرقے دور ہو جائیں گے جس کے ذریعہ سے ہم نے اب تک اس ملک کو اپنے قبضہ میں رکھا ہوا ہے یعنی مسلمانوں کو ہندوؤں کے خلاف کرنا علیٰ ہذا القیاس تعلیم کا اثر یہ ہو گا کہ ان کے دل بڑھ جائیں گے اور انہیں اپنی طاقت سے آگاہی ہو جائے گی۔

(6) مسٹر چرچل مورخہ 27 جون 1932ء کو تقریر کرتے ہیں۔

"وزیر اعظم (مسٹر میگڈ انلڈ) نے طے کر لیا ہے کہ وہ فرقہ وارانہ فیصلہ دیں گے میرے نزدیک اس میں سخت خطرہ ہے۔ اگر انہوں نے جملہ جماعتوں کے خوش کرنے کی کوشش کی تو وہ کسی کو خوش نہ کر سکیں گے اہل روم کا اصول تھا کہ نفاق ڈال کر حکومت کرو۔ لیکن ہم نے بالاتفاق طے کر لیا ہے کہ یہ اصول نامناسب ہے مگر اسی کے ساتھ اس اصول کو بھی اختیار نہ کرنا چاہیے جو اس کے برعکس ہو اور وہ یہ ہے کہ رعایا کو متحد کر دیا جائے جس کا نتیجہ سلطنت سے دست کشی ہو گا۔ دراصل یہ ایک بڑا خطرہ ہے اور اندیشہ ہے کہ ہم اس بڑے خطرہ میں نہ پڑ جائیں۔"(134)

(7) سر جان مینارڈ، ہندو مسلمانوں کے مابین عام مخالفت برطانیہ کے عہد میں شروع ہوئی۔"(135)

(8) آنریبل امبکاچرن مزدار کہتا ہے۔ اول اول اپنی عملداری کے ابتدائی زمانہ میں مسلمانوں کے مقابلہ میں ہندوؤں کو بڑھایا گیا اور اس کے بعد ہندوؤں کے مقابلہ میں مسلمانوں کو اٹھایا گیا جو باہمی رنجش اور عداوت کا موجب ہوا۔(136)"

اس طریقہ پر دفتروں اور عہدہ ہائے حکومت میں سخت نفاق پھیلایا گیا۔

خلاصہ یہ کہ ہندوستان میں قدیم سے ہندو مسلمان سکھ پارسی اور دیگر اقوام ہمیشہ سے ملے جلے عزیزوں اور رشتہ داروں کی طرح بستے اور آپس میں روا داری بلکہ اتحاد و اتفاق سے چلے آتے تھے مگر انگریزوں نے اپنے مفاد اور خود غرضی کے لیے اس کو خطرہ جان کر مختلف تدبیروں سے نفاق ڈلوایا اور آپس میں ایک دوسرے کو لڑانا اختیار کیا۔ کبھی ایک جماعت پر دست شفقت پھیرا اور کبھی دوسری پر اور اس ذریعہ سے مختلف ملتوں میں رقابت پیدا کر کے حسد، عناد، مذہبی کشت و خون کی صورتیں پیدا کیں۔ اگرچہ مسٹر چرچل کہتے ہیں کہ ہم نے بالاتفاق اس طریق کو نامناسب جان کر ترک کر دیا ہے مگر ایڈورڈ ٹامسن اپنی کتاب میں اقرار کرتے ہیں کہ ہندوستانیوں میں نااتفاقی اور اختلاف کو زندہ رکھنا قدیم سے ہمارے سیاست دانوں کا نہایت ہی مرغوب مشغلہ بنا ہوا ہے واقعی یہی صحیح ہے اور خود مسٹر چرچل بھی ہندوستانیوں کے اتحاد کو نہایت ہی مبغوض سمجھتے اور برطانوی اقتدار کے لیے موت شمار کرتے ہیں روز مرہ کے مشاہدات بتلا رہے ہیں کہ آج بھی ہندوستان میں یہی کھیل برٹش حکام کھیل رہے ہیں اور اگرچہ پہلے کے بوئے ہوئے زہریلے بیج سالہا سال کے لیے بلکہ ایک صدی یا اس سے زائد کے لیے کافی تھے مگر اب بھی برطانوی حکام اس میں پوری جدوجہد عمل میں لا رہے ہیں۔ لارڈ ویول کے متعلق خود انگلینڈ میں اس کے انکشافات اخباروں میں آ رہے ہیں۔ اور مسٹر آر۔ ایس رونیکا آف سی پی اپنے مشاہدات اور تاثرات 19 نومبر 1946ء کو الفاظ ذیل میں انگلستان سے واپسی پر ذکر کرتے ہیں۔

> "سوئزرلینڈ، آئرلینڈ اور برطانیہ کے دوران میں مجھے سر کردہ لیڈروں، قانون دانوں، جرنلسٹوں اور تاجروں سے ملنے کا موقعہ ملا جب میں لندن میں تھا تو میں نے یہ افواہیں سنیں کہ کچھ کنسرویٹو ہندوستان کے فسادات

> میں غیر معمولی دلچسپی لے رہے ہیں میں نے یہ بھی سنا ہے کہ وہ ہندوستان میں فسادات کرانے کے لیے رجعت پسند عناصر کو مالی امداد بھی دے رہے ہیں۔ ان دنوں وہاں یہ افواہ بھی گشت لگا رہی تھی کہ کنسرویٹو پارٹی کا ایک ایلچی فسادات کرانے کے لیے ہندوستان روانہ ہو چکا ہے۔"(137)

مسٹر لوئی فشر (مشہور امریکن مصنف) لندن سے بذریعہ تار ایک آرٹیکل ہندوستان بھیجتا ہے جو کہ 2 ستمبر 1946ء کو اسٹنڈرڈ کلکتہ میں شائع ہوتا ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ چرچل اور جناح میں گزشتہ مہینوں ہندوستان کی قسمت کے بارے میں نامہ و پیام ہوا وہ کیا ہے ان دونوں نے نہایت ہی رازدارانہ طور پر آپس میں خط و کتابت اور راز و نیاز کی باتیں کی ہیں۔ یہ واقعہ چرچل کے ایک ایسے ہی نہایت خفیہ خط پانے کے بعد ظہور میں آیا کہ مسلم لیگ نے وزارتی وفد کے تجاویز پر دوبارہ غور کیا اور دستور ساز اسمبلی کے مقاطعہ کا فیصلہ کر دیا جو آزاد ہندوستان کا دستور بنانے والی ہے۔ برطانوی مشن نے انتھک کوشش کی کہ سیاسی طاقت برطانیہ کے ہاتھوں سے ہندوستانیوں کو منتقل کرنے کا راستہ صاف کر دے مگر چرچل اور جناح دونوں ان کوششوں کو ناکام بنانے کی سعی کر رہے ہیں۔ مسٹر جناح کے نئے طرز پالیسی کا پھل کلکتہ میں لوٹ، موتیں اور قتل و غارت گری کی صورت میں ظاہر ہوا ہے۔ الخ۔"

حوالہ جات باب دوم

1۔ علم المعیشت ص 572

2۔ معیشت والھند ص 318

3۔ روشن مستقبل ص 44

4۔ سیاسی تاریخ ہند از جان میلکم

5۔ خوشحال برطانوی ہند ص 41

6۔ تنظیم امرتسر جلد 6 نمبر 15 - 28 اگست 1928ء

7۔ معیشت الھند ص 663

8۔ روشن مستقبل ص 32

9۔ معیشت الھند ص 670

10۔ روشن مستقبل ص 39

11۔ سوانح کلایو مصنفہ میکالے ص 517

12۔ روشن مستقبل ص 41 ۔ 42

13۔ تنظیم امرتسر مورخہ 28 اگست 1928ء

14۔ ایضاً

15۔ انڈسٹریل رپورٹ مالوی ص 302

16۔ حکومت خود اختیاری از مضامین میکالے نسبت لارڈ کلایو ص 9

17۔ روشن مستقبل ص 48

18۔ ایضاً

19۔ حکومت خود اختیاری ص 26

20۔ روشن مستقبل 47 ۔ 48

21۔ تقاریر برک مقدمہ ہسٹنگز ج ا ص 17

22۔ روشن مستقبل ص 46

23۔ ایضاً

24۔ خوشحال برطانوی ہند ص 43

25۔ حکومت خود اختیاری ص 80

26۔ ایضاً ص 26

27۔ ایضاً ص 27

28۔ ایضاً ص 341

29۔ ان ہمی انڈیا از حکومت خود اختیاری ص 81

30۔ اخبار ملت دہلی مورخہ 18 جنوری 1933ء جلد 8 شمارہ نمبر 14

31۔ حکومت خود اختیاری ص 81

32۔ مدینہ بجنور 25 فروری 1930ء

33۔ بیان ایسوی ایٹڈ، چیمبرز آف کامرس نزد سائمن کمیشن از مدینہ بجنور 25 فروری 1930ء ص 16

34۔ حکومت خود اختیاری ص 20

35۔ ایضاً

36۔ ایضاً ص 42

37۔ ایضاً ص 45

38۔ ایضاً ص 83

39۔ ایضاً

40۔ ایضاً

41۔ ایضاً

42۔ ایضاً

43۔ ایضاً ص 28 ۔ 27

44۔ اخبار سچ لکھنؤ مورخہ 13 جولائی 1928ء

45۔ ہندوستان ٹائمز مورخہ 13 ستمبر 1930ء از رپورٹ سائمن کمیشن

46۔ ماڈرن انڈیا از مالیات عامہ

47۔ مدینہ بجنور 25 جنوری 1930ء از انڈین نیوز لندن ص 21

48۔ حکومت خود اختیاری ص 38 از دادا بھائی ص 50

49۔ اخبار وکیل امرتسر جلد 29 شمار نمبر 63 مورخہ 24 نومبر 1923ء

50۔ مدینہ بجنور جلد 19 ص 85، 28 دسمبر 1930ء

51۔ رسالہ مظلوم کسان ص 29 از آر ۔ سی ۔ دت

52۔ معاشیات ہند ص 259

53۔ رسالہ مظلوم کسان ص 29

54۔ رسالہ مظلوم کسان میں 28 ۔ 29 از آر ۔ سی ۔ دت

55۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کا غیر مطبوعہ ریکارڈ برٹش میوزیم میں

56۔ انتخاب لاجواب لاہور مورخہ 21 اگست 1928ء

57۔ ایضاً

58۔ ایضاً

59۔ معیشت الہند ص 97

60۔ مدینہ بجنور 25 مارچ 1930ء از انڈین نیوز لندن

61۔ اخبار انجس لدھیانہ 27 جون 1925ء

62۔ خوشحال برطانوی ہند

63- علم المعیشت ص 584

64- علم المعیشت ص 577

65- علم المعیشت ص 588 ۔ 589

66- حکومت خود اختیاری ص 10

67- رسالہ تلک ص 11

68- رومیش چندر دت ص 45

69- ایضاً

70- ایضاً

71- علم المعیشت ص 616

72- حکومت خود اختیاری ص 23 از دت جلد دوم ص 112

73- علم المعیشت ص 590

74- علم المعیشت ص 592

75- اخبار پرتاپ لاہور مورخہ 14 اگست 1921ء

76- علم المعیشت ص 593

77- دت ص 262 ۔ 263

78- علم المعیشت ص 593

79- علم المعیشت ص 586

80- علم المعیشت ص 591

81- علم المعیشت ص 598

82- حکومت خود اختیاری ص 23 از دت جلد دوم ص 112

83- حکومت خود اختیاری 67

84- ایضاً

85- سفرنامہ ہملٹن جلد اول ص 148 از دہ سالہ ہندوستان عہد اورنگ زیب میں
مصنفہ مرزا سمیع اللہ بیگ چیف جج حیدر آباد

86- سفرنامہ ہملٹن جلد 2 ص 21

87- سفرنامہ ہملٹن جلد 1 ص 45

88- ایضاً

89- روزنامہ احسان ج 6 نمبر 28 مورخہ 27 مارچ 1939ء

90- برٹش انڈیا کے قدیم کاغذات از وہیلر ص 70

91- تاریخ برٹش انڈیا ص 23 از جیمس مل

92- علم المعیشت برنی ص 589

93- ایضاً

94- مسلمانوں کا روشن مستقبل ص 51

95- مقدمہ برگ از ہسٹنگز جلد اول ص 139

96- مقدمہ برک از ہسٹنگز جلد اول ص 213

97- روشن مستقبل ص 52- 53- 54

98- حکومت خود اختیاری ص 50

99- روشن مستقبل ص 38

100- ایضاً ص 49

101- حکومت خود اختیاری ص 26- 27

102- ایضاً ص 68

103- ایضاً ص 15

104- روشن مستقبل 15

105- حکومت خود اختیاری ص 79

106- ہمارے ہندوستانی مسلمان از ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر

107- حکومت خود اختیاری ص 19

108- ایضاً

109- ایضاً

110- ایضاً

111- روشن مستقبل ص 59-60

112- حکومت خود اختیاری ص 7

113- روشن مستقبل ص 19-20

114- حکومت خود اختیاری ص 15-16-17

115- خوشحال برطانوی ہند ص 109

116- روشن مستقبل ص 128

117- تاریخ تعلیم از میجر باسو ص 203

118- ایضاً ص 105

119- ایضاً

120- ہمارے ہندوستانی مسلمان ص 202

121- مدینہ بجنور مورخہ 9 جون 1943ء

122- امریکی اخبار کامن سنس 1934ء

123- ہندوستانی ٹائمز جولائی 1936ء

124- حکومت خود اختیاری ص 85

125- روز نامہ ملت دہلی 26 جولائی 1932ء

126- ان ہیپی انڈیا از لالہ لاجپت رائے ص 408

127- روشن مستقبل ص 237

128- حکومت خود اختیاری ص 56

129- علماء ہند کا شاندار ماضی جلد صفحہ 14

130- روشن مستقبل ص81

131- حکومت خود اختیاری ص 55

132- ایضاً

133- انقلاب 1857ء تصویر کا دوسرا رخ ص 108 مترجم

134- لیڈر اخبار مورخہ 14 جولائی 1932ء

135- ان ہیپی انڈیا ص 308

136- ہندوستان کا قومی ارتقاء ص 247

137- پرتاپ لاہور مورخہ 21 نومبر 1946ء جلد 27 نمبر121

تیسرا باب

ہندوستان میں انگریزوں کے ہاتھوں مسلمانوں کی بربادی

- مسلمانوں کو برباد کرنے کے طریقے
- مسلمانوں اور مسلمان بادشاہوں سے غداری
- مسلمانوں کا قانونی اداروں سے اخراج
- انگریزی اقتدار سے مسلمانوں کو شکایات
- حوالہ جات

تیسرا باب

ہندوستان میں انگریزوں کے ہاتھوں مسلمانوں کی بربادی

یورپین عموماً اور انگریز خصوصاً تمام ایشیاء اور افریقہ کے باشندوں کے دشمن رہے ہیں اوران کو نیم وحشی غیر متمدن خارج از انسانیت وغیرہ کہتے ہوئے ان کی عزت، مال اور ذرائع دولت وغیرہ پر نہایت بربریت سے چھاپہ مارتے رہے ہیں مگر بالخصوص مسلمانوں پر ان کو سیاسی رقابت کا بھی ہمیشہ سے خیال قائم رہا اور ان کو سخت ترین دشمنی کی آگ میں ڈالا گیا۔ جس کی بنا پر مسلمانوں کے برباد کرنے اور فنا کے گھاٹ اتار دینے کا سب سے زیادہ عملدرآمد جاری کیا گیا۔ بالخصوص اس وقت سے جبکہ ان کو بادشاہ دہلی سے دیوانی کا صیغہ بنگال و آسام بہار و اڑیسہ کے بارے میں دے دیا گیا تھا۔ چاہیے تو یہ تھا کہ وہ اپنے ولی نعمت کو پہچانتے اور اس کے ساتھ وفاداری اور نمک حلالی کو عمل میں لاتے مگر رذیلوں کے ساتھ احسان کرنا ہی غلطی تھا۔

نکوئی بابداں کردن چنان است   کہ بد کردن بجائے نیک مرداں

شہنشاہ اکبر، جہانگیر، شاہجہاں، عالمگیر اور ان کے وارثوں نے انتہائی غلطی کی تھی کہ ان غیر اقوام اور رذیلوں کو اپنے ملک میں اقامت اور حقوق شہریت کی معہ تجارت اجازت

دے دی اور بار بار ان کی نالائقی کو دیکھتے اور تجربہ کرتے ہوئے بھی بڑھاتے رہے۔

چنانچہ کپتان الگزینڈر ہملٹن اپنے سفرنامہ میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے کارکنوں کی بغاوت اور شاہی فوج کا ان پر مسلط ہونا اور بارگاہ سلطانی میں ڈیپوٹیشن کا جس کا ایک ممبر وہ بھی تھا دہلی آنا اور شہنشاہ سے معافی مانگ کر انگریز مجرمین کا رہائی دلانا وضاحت سے ذکر کرتا ہے۔ اس کے باوجود شاہان مغلیہ ان یورپین لوگوں پر اعتماد کرکے بڑے عہدے بھی عطا کرتے رہے۔ بہرحال جو کچھ نہ ہونا تھا وہ پیش آیا۔

الغرض انگریزوں نے دیوانی پر اقتدار پاتے ہی مسلمانوں کے ساتھ سوت کا معاملہ برتنا شروع کیا اور ہر صیغہ سے مسلمانوں کو چھانٹنا اور اپنوں سے یا مسلمانوں کے دشمنوں سے بھرنے کا معاملہ تدریجی طور پر جاری کیا۔ اس زمانہ میں تمام ملکی اور فوجی صیغوں پر مسلمان ہی چھائے ہوئے تھے اور انہیں میں اعلیٰ قابلیت سیاسی اور فوجی تھی۔

چنانچہ ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر ص 337 پر لکھتا ہے۔

> ”حقیقت یہ ہے کہ جب یہ ملک ہمارے قبضے میں آیا تو مسلمان ہی سب سے اعلیٰ قوم تھی۔ وہ دل کی مضبوطی اور بازوؤں ہی میں برتر نہ تھے بلکہ سیاسیات اور حکمت عملی کے علم میں بھی سب سے افضل تھے لیکن اس کے باوجود مسلمانوں پر حکومت کی ملازمتوں کا دروازہ بند ہے۔ غیر سرکاری ذرائع زندگی میں بھی انہیں کوئی نمایاں جگہ حاصل نہیں۔“

صفحہ 236 پر لکھتا ہے۔

> ”ایک صدی قبل حکومت کے تمام ذمہ دار عہدوں پر مسلمانوں کا مکمل قبضہ تھا۔ ہندو محض شکریہ کے ساتھ ان چند ٹکڑوں کو قبول کر لیتے تھے جو ان کو سابق فاتح اپنے دسترخوان سے ان کی طرف پھینک دیتے تھے اور انگریزوں کی حیثیت چند ایک گماشتوں کا کلرکوں کی تھی۔“

صفحہ 222 پر لکھتا ہے۔

> ”مختصراً یہ کہ مسلمان نواب فاتح تھے اور اس حیثیت سے حکومت پر چھائے ہوئے تھے۔ کبھی کبھی کوئی ہندو ماہر اقتصادیات یا کوئی ہندو جرنیل بھی نمایاں حیثیت اختیار کر لیتا تھا ان مثالوں کی موجودگی ہی اس امر کا بہترین ثبوت ہے کہ ایسا شاذونادر ہوتا تھا۔“

ڈاکٹر ہنٹر صفحہ 231 پر لکھتا ہے۔

> "لیکن پھر بھی سوچنا چاہیے کہ جتنے ہندوستانی سول سروس میں داخل ہوتے یا ہائی کورٹ کے جج بنتے ہیں ان میں ایک بھی مسلمان نہیں حالانکہ جب یہ ملک ہمارے قبضہ میں آیا تو اس سے کچھ عرصہ بعد تک بھی حکومت کے تمام کام مسلمانوں ہی کے ہاتھوں سرانجام پاتے تھے۔ جیسا کہ ہم لکھ چکے ہیں۔"

صفحہ 232 پر لکھتا ہے۔

> "کارنوالس کے مجموعہ قوانین نے اس اجارہ داری کو محکمہ قانون میں اس قوت کے ساتھ نہیں توڑا جس قوت کے ساتھ اس نے دیوانی محکمہ میں توڑا تھا لیکن پھر بھی کمپنی کے پہلے پچاس سالہ دور حکومت میں حکومت کی ملازمتوں میں سب سے بڑا حصہ مسلمانوں ہی کا تھا لیکن دوسری نصف صدی میں ہوا کا رخ بدل گیا۔"

صفحہ 246 پر لکھتا ہے۔

> "انگریزوں کے ہندوستان پر قابض ہونے سے پہلے وہ (مسلمان) ملک کی سیاسی ہی نہیں بلکہ دماغی قوت بھی تسلیم کئے جاتے تھے۔"

اور صفحہ 265 پر اسلامی تعطیلات کے بارے میں لکھتا ہے۔

> "گویا وہ قوم جو کبھی ہندوستان کے تمام عدالتی عہدوں پر فائز تھی اب اس حد تک ذلیل ہو چکی ہے۔ بہرحال یہ جاننا تسلی بخش ہے کہ اور نہیں تو اس بے انصافی پر عملدرآمد ہونے کی اجازت نہیں دی گئی۔ حکومت اعلیٰ نے مداخلت کی اور حاکمانہ طور پر اسلامی تعطیلات کے چند دن مقرر کر دیئے یقیناً وہ اتنے نہ تھے جتنے مسلمان چاہتے تھے۔"

مسٹر ہنری ہیرنگٹن طامس (بنگال سول سروس کا پنشنر) اپنے رسالہ "بغاوت ہند اور ہماری آئندہ پالیسی۔" کے صفحہ 13 تا 17 میں 1858ء میں لکھتا ہے۔

> "عزم تعلیم اور ذہنی صلاحیت کے اعتبار سے مسلمان ہندوؤں سے کہیں زیادہ فائق ہیں اور نسبتاً ہندو ان کے سامنے طفل مکتب معلوم ہوتے ہیں۔ علاوہ اس کے مسلمانوں میں کارگزاری کی اہلیت زیادہ ہوتی ہے

> جس کی وجہ سے سرکاری ملازمتیں زیادہ تر انہیں کو ملتی ہیں۔ اس طرح ان کو سرکاری کاموں اور ملکی مصالح سے واقفیت کا موقعہ ملا اور ان کی رائے کو وقعت حاصل ہو گئی۔"

اگرچہ مسلمانوں کو گرانا انگریزوں نے 1765ء سے شروع کیا تھا اور اس طرح گرتے گرتے سو سال کا عرصہ گزر گیا تھا مگر پھر بھی 1858ء میں ان کی دماغی اور عملی قابلیت کی دوسروں پر فوقیت اس درجہ باقی تھی جس کو ہیرنگٹن طامس بتاتا ہے اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان کی قابلیت سیاسیات اور حکومت وغیرہ میں پہلے کس درجہ پر فائق ہو گی جس کی صریح دلیل ہندوستان کا انگریزوں سے پہلے زندگی کے ہر شعبہ میں بالاتر ہونا اور روز افزوں ترقی کرنا ہے جس کو ہم واضح کر آئے ہیں۔ مگر انگریزوں نے اپنی خود غرضیوں اور سیاسی رقابت اور آئندہ کے تحفظات کی بناء پر کیا کیا اس کی شہادت مندرجہ ذیل اقتباسات دیں گے۔

مسلمانوں کو برباد کرنے کے طریقے

مسلمان حاکموں کی برطرفی

ڈاکٹر ہنٹر صفحہ 195 پر لکھتا ہے-

> ”مسلمان شہنشاہ کی ظاہری برتری کو مٹانے سے بہت پہلے ہم نے مسلمان حاکموں کو برطرف کرنا شروع کر دیا تھا-“

صاحب حکومت اختیاری صفحہ 14 پر لکھتا ہے-

> ”ہندوستان میں انگریزی عملداری کی ایک خصوصیت یہ رہی ہے کہ ہندوستانی ابتداء سے بڑے عہدوں سے (جن پر عموماً مسلمان فائز تھے) قطعاً خارج کر دیئے گئے قوانین بنانے میں اور ملک کے لوگوں کے درمیان انصاف کرنے میں ان کا کوئی اختیار باقی نہیں ہے- عملداری کی اس خصوصیت کے مضر اثرات کا اندازہ منجملہ دیگر انگریزوں کے سرطامس منرو کو بخوبی ہوا جس کا اظہار انہوں نے اپنی رپورٹ میں حسب ذیل الفاظ میں کیا-
>
> ”وضع قوانین میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہے اور قوانین کے عملدرآمد میں ان کو بہت کم دخل ہے- باستثناء چند نہایت چھوٹے عہدوں کے وہ کسی بڑے عہدہ تک خواہ وہ فوجی ہو یا سول نہیں پہنچتے- وہ ایک ادنیٰ قوم کے فرد سمجھے جاتے ہیں- تمام فوجی اور دیوانی عہدے جو کچھ بھی اہمیت رکھ سکتے ہیں اب یورپینوں کے قبضہ میں ہیں جس کا پس انداز روپیہ خود ان کے ملک کو چلا جاتا ہے-“

ان بڑے عہدوں اور ملازتوں سے ان کا خارج کرنا ناقابلیت کی وجہ سے نہ تھا بلکہ صرف ان کے ہندوستانی رقیب اور مسلمان ہونے کی وجہ سے تھا- ہم پہلے لکھ آئے ہیں کہ خود ذمہ دار انگریزوں کا اقرار ہے کہ ہندوستانی مسلمان قوت فیصلہ اور دماغی قوتوں میں انگریزوں سے فائق تر تھے-

سرارسکن پیری کہتا ہے-

> ”ہندوستانی مجوزین کی قوت فیصلہ کمپنی کے ان ججوں سے جو اپیل سنتے تھے بدرجہا بہتر تھی-(1)“

جان سلیور (مدراس گورنمنٹ کا ممبر) کہتا ہے۔

> "وہ لوگ (باشندگان ہند) ٹیکسوں کے لگانے میں جن کی ادائگی کے لیے وہ مجبور کیے جاتے ہیں کوئی اختیار نہیں رکھتے قوانین کو جن کی تعمیل ان پر فرض ہوتی ہے۔ مرتب کرنے میں ان کی کوئی آواز نہیں ہوتی اپنے ملک کے انتظام میں ان کا کوئی حقیقی حصہ نہیں ہوتا اور ان کے حقوق دیئے جانے سے اس شرمناک حیلہ سے انکار کیا جاتا ہے کہ ان میں اس قسم کے فرائض انجام دینے کے لیے ذہنی اور اخلاقی اوصاف کی کمی ہے۔(2)"

اور پھر اس پر مزید یہ طرہ تھا کہ ہندوستانی ججوں کو باوجود اس اعلیٰ صلاحیت کے یورپین ججوں کی تنخواہ کا صرف پچیسواں حصہ ملتا تھا۔ سرارسکن پیری لکھتا ہے۔

> "یورپین جج کو تقریباً تین ہزار پونڈ سالانہ تنخواہ ملتی ہے۔ لیکن ہندوستانی منصف صرف ایک سو بیس پونڈ سالانہ پاتا ہے۔"

دلسوز بے انصافیاں - توہین و تذلیل اوقاف کی بربادی - جائدادوں کی ضبطی

> "لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ بڑے افسروں سے لے کر چھوٹے افسروں تک (موجود وائسرائے سے زیادہ کسی نے بھی مسلمانوں کے ساتھ ناانصافیوں پر زیادہ غور نہیں کیا) ہر شخص کو یقین ہو گیا ہے کہ ہم نے ملکہ کی مسلمان رعایا کے حقوق پورے نہیں کیے اور ہندوستان کی آبادی کا ایک بہت بڑا حصہ جس کی تعداد تین کروڑ کے لگ بھگ ہے اپنے آپ کو برطانوی حکومت کے ماتحت تباہ و برباد ہوتا دیکھ رہا ہے۔ اس کو شکایت ہے کہ جو لوگ کل تک اس ملک کے فاتح اور حکمران تھے آج نان جویں کے روکھے سوکھے ٹکڑوں کو بھی ترس رہے ہیں اس کے جواب میں یہ کہنا کہ یہ سب کچھ نتیجہ ہے ان کے اپنے انحطاط کا عذر گناہ بدتر از گناہ کا مصداق ہو گا کیونکہ ان کا انحطاط بھی تو ہماری ہی سیاسی غفلت اور لاپرواہی سے مرتب ہوا۔ جب تک اس ملک کی عنان حکومت ہمارے ہاتھ میں نہیں آئی تھی۔ تب بھی مسلمانوں کا یہی مذہب تھا وہ ایسا ہی کھانا کھاتے اور جملہ ضروریات زندگی میں ویسا ہی طرز بود و

مانند رکھتے تھے جیساکہ اس زمانہ میں وہ اب بھی وقتا فوقتا اپنے احساس قومیت اور جنگی اولوالعزمیوں کا مظاہرہ کرتے رہتے ہیں۔ بایں ہمہ یہ وہ قوم ہے جسے برطانوی حکومت کے ماتحت تباہ و برباد کیا گیا ہے۔(3)"

مگر یہ جب ہی ممکن ہے کہ ہم ان پر متواتر اور مسلسل ناانصافیوں کے احساس کو دور کر دیں جو انگریزی حکومت کے ماتحت مسلمانوں کے اندر پیدا ہو گیا ہے۔

"اس حقیقت سے چشم پوشی بے سود ہے کہ مسلمان ہم پر کیسے کیسے شدید الزامات عائد کرتے ہیں۔ ایسے الزام جو شاید ہی کسی حکومت پر عائد کئے گئے ہوں۔

(1) وہ ہمیں اس بات کا ملزم ٹھہراتے ہیں کہ ہم نے ان پر ہر قسم کی باعزت زندگی کا دروازہ بند کر دیا ہے۔

(2) وہ ہمیں اس بات کا ملزم ٹھہراتے ہیں کہ ہم نے ایک ایسا طریقہ تعلیم رائج کر دیا ہے جس سے ان کی قوم بہرہ ور نہیں ہو سکتی اور جو ان کی ذلت و خواری کا سبب بن گیا ہے۔

(3) وہ ہمیں یہ بھی الزام دیتے ہیں کہ ہم نے مسلمان قاضیوں کی برطرفی سے ہزار ہا خاندانوں کو مبتلائے آفات کر دیا ہے۔ یہ قاضی نکاح کے لیے مذہبی اجازت دیتے تھے اور ان کا کا قدیمی زمانہ ہی سے اسلام کے متبرک قوانین کی نگہداشت اور نفاذ و عمل میں لانا تھا۔

(4) ان کو شکایت ہے کہ ہم نے مسلمانوں سے مذہبی فرائض کو پورا کرنے کے ذرائع چھین لیے اور اس طرح روحانی اعتبار سے ان کے ایمان کو خطرے میں ڈال دیا۔

(5) ہمارا بڑا جرم ان کے نزدیک یہ ہے کہ ہم نے مسلمانوں کے مذہبی اوقاف میں بددیانتی سے کام لیتے ہوئے ان کے سب سے بڑے تعلیمی سرمائے کا غلط استعمال کیا۔ ان مخصوص الزامات کے علاوہ جن کے متعلق ان کو یقین ہے کہ باآسانی ثابت کئے جا سکتے ہیں اور بھی بہت سی شکایات ہیں جو محض جذبات پر مبنی ہیں اور شاید انگریزوں کے تصور سے

قاصر دماغ پر کوئی اثر نہ ڈال سکیں- مگر آئرلینڈ کی طرح ہندوستان میں بھی یہ شکایتیں مسلمانوں کو حاکموں سے بد ظن رکھتی ہیں- وہ علی الاعلان کہتے ہیں کہ ہم نے بنگال میں قدم رکھا تو مسلمانوں کے ملازمین کی حیثیت سے لیکن اپنی فتح و نصرت کے وقت ان کی مطلق پرواہ نہیں کی اور نو دولت طبقہ کی گستاخانہ ذہنیت کے ساتھ اپنے سابق آقاؤں کو پاؤں تلے روند ڈالا- مختصر یہ کہ ہندوستانی مسلمان برطانوی حکومت کو غفلت اور بے اعتنائی کا مجرم جذبات شجاعت سے معرا، اور سرمایہ میں کمپنیوں کی طرح بددیانتی سے کام لینے والے اور دیگر بڑی بڑی ناانصافیوں کا جن کا سلسلہ سو سال تک پھیلا ہوا ہے مرتکب ٹھہرات ہیں-(4)"

"یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ وہ اس طریقہ تعلیم سے پرہیز کرتے ہیں جو فی نفسہ کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو لیکن ان کے ملی رجحانات کو قطعاً خاطر میں نہیں لاتا- حقیقت میں اس طرح ان کی ضروری سے ضروری احتیاجات بھی پوری نہیں ہوتیں- یہ طرز تعلیم ان کے مفاد کے خلاف اور ان کی مدنی روایات کے منافی ہے-(5)"

"تعلیم یافتہ مسلمان جن کو پرانے طریقہ پر ناز ہے حکومت کے ان عہدوں اور ملازمتوں میں جگہ نہیں پاتے جن پر اس سے بیشتر ان کی اجارہ داری قائم تھی- وہ حیران ہیں کہ یہ سب کچھ اور دیگر ذرائع زندگی قابل نفرت ہندوؤں کے ہاتھ چلے گئے یا جا رہے ہیں- جن مسلمانوں کی تعلیم ذرا بہتر ہوتی ہے- وہ بھی نالاں ہیں- گو ان کا یہ احساس مذہبی ایذا رسانی کی حد تک نہیں پہنچا- اگرچہ ان کے مذہبی خیالات کے مطابق لاپروائی کی حد تک پہنچ جاتا ہے ان کے تعصب کو جس کا جواز قرآن مجید سے ہر وقت ثابت کیا جا سکتا ہے یہاں تک برانگیختہ کر دیا گیا ہے کہ ڈر ہے کہ کہیں ساری مسلمان قوم بے وفا، جاہل اور متعصب گروہ کی شکل اختیار نہ کر لے-(6)"

"انہیں یہ رنج نہیں کہ حکومت کی نوازشوں سے حسب دستور سابق انہیں کوئی حصہ نہیں ملتا انہیں یہ رنج ہے کہ وہ اس سے بتدریج خارج

کیے جا رہے ہیں وہ اس بات کا گلہ نہیں کرتے کہ اب زندگی کی دوڑ میں انہیں ہندوؤں کا مقابلہ درپیش ہے۔ انہیں گلہ ہے تو یہ کہ اور کہیں نہیں کم از کم بنگال میں ان کے لیے عرصہ حیات تنگ ہو چکا ہے۔" (7)

"مختصرا یوں کہیے کہ یہ قوم ہے جس کی روایات بہت شاندار ہیں مگر جس کا اس کے باوجود کوئی مستقبل نہیں۔ اگر اس قوم کی تعداد تین کروڑ ہے تو یہ محض اس قوم کے لیے ہی نہیں بلکہ اس قوم کے حاکموں کے لیے بھی ایک بہت ہی اہم سوال ہے۔ مشرقی بنگال میں کاشتکاروں کی بہت زیادہ تعداد مسلمان ہے۔" (8)

حقیقت میں سارا صوبہ مسلمان امراء سے جو کبھی طاقتور اور برسر اقتدار تھے بھرا پڑا ہے وہ گزشتہ عظمت کی نشانیاں ہیں اس وقت بھی مرشد آباد میں ایک اسلامی عدالت ایک نقلی سلطنت کا کھیل کھیل رہی ہے۔ ہر ضلع میں کسی نہ کسی شہزادہ کی اولاد بے بام محلات اور پر از خار تالابوں کے درمیان نہایت تکبر اور ترش روئی سے خون جگر پیتی نظر آتی ہے اس قسم کے بہت سے خاندانوں کو میں بذات خود جانتا ہوں ان کے گھروں میں نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کی کمی نہیں ان کے پوتے پوتیاں بھی ہیں اور ان کے نواسے نواسیاں بھی لیکن اس فاقہ مست گروہ میں ایک بھی ایسا نہیں ہے جسے اپنے ہی لیے زندگی میں کام کرنے کا کوئی موقع حاصل ہو۔ وہ غلیظ برآمدوں اور ساتھ ٹپکتے ہوئے مکانوں میں اداس زندگیاں بسر کر رہے ہیں۔ اور دن بدن قرض کے تباہ کن گڑھوں میں گرتے چلے جاتے ہیں۔ تاآنکہ پاس ہی کا ہندو مہاجن ایک دن ان سے جھگڑا مول لے لے گا اور چند لمحوں میں قرض خواہوں کا ایک جم غفیر عدالت کے حکم سے بیع قطعی کا حق حاصل کر کے قدیم مسلمانوں کے اس خاندان کو دیکھتے دیکھتے ہڑپ کر لے گا۔ یہاں تک کہ صفحہ ہستی سے اس کا نشان تک مٹ جائے گا۔ (9)۔

اگر کسی خاص مثال کی ضرورت ہو تو میں ناگو کے راجاؤں کی مثال پیش کر سکتا ہوں پہلے پہل جب انگریزوں کو ان سے واسطہ پڑا تو ان کی

سالانہ آمدنی دو صدیوں کی غلطیوں اور فضول خرچیوں کے باوجود پچاس ہزار پونڈ تھی۔ یہ راجہ اپنے لیے ستونی شامیانے میں بیٹھ کر اپنی اس ریاست کا نظارہ کیا کرتے تھے جو آج کل دو انگریزی اضلاع پر منقسم ہے۔ ان کی مسجدیں اور لاتعداد بارہ دریاں ایک مصنوعی جھیل کے کنارے چاروں طرف چلی گئی تھیں اور صاف و شفاف پانی میں جس کے اندر ایک بھی خودرو پودا نظر نہیں آتا تھا منعکس ہوتی تھیں۔ راجہ کی خانگی سیڑھیوں سے ہر روز ایک سنہری بجرا مستانہ وار اس جزیرہ کا رخ کرتا ہے جو اس جھیل کے عین وسط میں واقع ہے اور رنگارنگ پھولوں سے پٹا پڑا ہے۔ محل کے دروازہ پر سپاہی پہرا بدلتے رہتے ہیں اور جب آفتاب غروب ہونے کے قریب ہوتا ہے تو شہزادوں کے باغات سے بچوں کے کھل کھلانے ہور خواتین کی شیریں آوازیں سننے میں آتی ہیں۔"

مگر اب سوائے فلک نما ڈیوڑھی کے اس محل کا کوئی نشان باقی نہیں۔ مسجد کی بے بام و در دیواروں سے استرکاری کی تمام زیبائشیں مٹ چکی ہیں۔ وسیع و عریض باغ اور ان کے صاف ستھری نہریں ویرانہ ہیں۔

اب ان میں چاولوں کی کاشت ہوتی ہے اور ان کے رنگا رنگ مچھلیوں والے تالاب گندے اور سڑے ہوئے گڑھوں کی شکل اختیار کر چکے ہیں بارہ دریوں کی جگہ اب صرف اینٹوں کا ملبہ ہے کہیں کہیں اگر کسی دیوار کا کوئی حصہ نظر آ جاتا ہے تو عربی وضع کی کسی محراب دار کھڑکی سے اس نظارہ پر اور بھی حسرت برسنے لگ جاتی ہے۔

"مگر ان میں سب سے زیادہ حسرت ناک منظر شاہی جھیل کا ہے جس کے کنارے محل اب بھی استادہ ہے جو پرانے زمانے کا خوبصورت اور ستونوں والا محل نہیں بلکہ ایک ویران کھنڈر ہے اس کی خراب و خستہ دیواروں کو سطح آب پر جمی ہوئی کائی سے بڑی ہی مناسبت معلوم ہوتی ہے (نوٹ از مصنف میں عمارت اور تالاب کا وہ نقشہ بیان کر رہا ہوں جو میں نے 1864ء میں دیکھا تھا میں نے سنا ہے کہ تالاب کو صاف کیا گیا

ہے اور محل بھی خستہ ہو گیا ہے) وہ بدنصیب خواتین جو کبھی رانی کہلاتی تھیں اب کبھی شام کی سیر کو پردہ دار بجروں میں نہیں نکلتیں ان کے زنانخانوں پر چھت باقی نہیں۔ ان کے مکین اب معمولی مکانوں میں چلے گئے ہیں جو تباہ شدہ اصطبل کے پاس واقع ہیں۔ ناگو خندان کی گزشتہ عظمتوں کی یاد صرف ایک نہر سے باقی ہے جو اب بھی دلدلوں کے بیچ میں اسی راستہ سے بہتی ہے جس سے کبھی محلوں کے درمیان سے گزرتی تھی اور جسے دیکھ کر قدیم الایام روما کی خاموش یادگاروں کی ایک ہلکی سی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ دریائے ٹائبر کے سوائے روم کا کچھ بھی باقی نہیں رہا۔ دنیا کی بے ثباتی بھی کیا چیز ہے کہ جو شے مضبوطی سے قائم کی جائے وہی تباہ برباد ہو جاتی ہے۔ اور نقل مکانی کرتی رہے اس کو ثبات و دوام حاصل ہو جاتا ہے۔"

اس خاندان کے نمائندے خستہ محل کے ایک کونے میں دبکے ہوئے اپنی عسرت زدہ زندگیاں بسر کر رہے ہیں۔ وہ نشہ آمیز مٹھائیوں کو چوستے اور خود رو پودوں سے اٹی ہوئی جھیل پر حسرت بھری نگاہوں سے تکتے رہتے ہیں۔ اگر کوئی سیاست دان ایوان عام میں سنسنی پیدا کرنا چاہتا ہو تو اس کے لیے یہ کافی ہے کہ بنگال کے کسی ایسے مسلمان گھرانے کی سچی داستان بیان کر دے۔

وہ اپنی کہانی کو اس طرح شروع کرے گا۔ ایک قابل شہزادہ بہت بڑے علاقہ پر حکمرانی کر رہا ہے۔ وہ اپنی فوج کا سپہ سالار ہے اس کے بے شمار خدمت گار ہیں وہ مشرقی شاہانہ دربار کی تمام روایات کو برقرار رکھتا ہے۔ اور بستر مرگ پر مسجدوں کی تعمیر اور مذہبی اوقاف کا حکم دے کر اپنی روح کو تسکین دیتا ہے اس کے بعد وہ اس کے موجودہ بے عقل جانشین کی تصویر کھینچے گا وہ ان جنگلوں میں جب انگریز شکاریوں کی آمد کی خبر سنتا ہے تو اپنے آپ کو چھپا لیتا ہے اور اگر اس کے خادم مجبور بھی کریں کہ اجنبیوں کی عزت افزائی کرنی ضروری ہے تو وہ ان سے ملاقات پر ہمیشہ ایک ہی بات دہراتا ہے اور وہ یہ کہ فلاں تاجر نے ابھی ابھی اس

کے محل کو چند روپیوں کے بدلے قرق کر لیا ہے۔

میں نے بنگال کے مسلمان نوابوں اور کاشتکاروں کے حالات ذرا وضاحت سے بیان کئے ہیں تاکہ انگریزوں کے سامنے ان لوگوں کا نقشہ کھینچ دوں جن کی شکایات کا بیان اس باب میں کیا جائے گا یہ بھی بتلا دوں کے میرے بیانات کا تعلق جنوی بنگال سے ہے کیونکہ یہ وہ صوبہ ہے جسے میں اچھی طرح جانتا ہوں اور جہاں تک مجھے علم ہے مسلمانوں نے برطانوی حکومت کے ماتحت سب سے زیادہ یہیں نقصان اٹھایا ہے پھر اگر میں دوسروں کو بھی یقین دلاؤں اور خود میرا بھی خیال ہو کہ یہ بیانات تمام مسلمانان ہند پر راست آتے ہیں تو مجھے اس پر معاف فرمایا جائے۔ میری رائے میں اگر کسی قوم کی حالت کو درست کرنے کی ضرورت کبھی محسوس ہوگی تو وہ جنوبی بنگال کے مسلمان نواب ہیں ان کے دولت و ثروت کے پرانے ذرائع ختم ہو چکے ہیں الخ" (10)

مسلمانوں کی آمدنی کے ذرائع

(1) ملک میں آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ دیوانی کا محکمہ ہے جس پر مسلمانوں کی اجارہ داری قائم تھی۔

(2) محکمہ پولیس بھی آمدنی کا اچھا خاصا بڑا ذریعہ ہے اور اس کے تمام افسر بھی مسلمان تھے۔

(3) آمدنی کا تیسرا بڑا ذریعہ قانونی عدالتیں ہیں اور یہاں بھی مسلمان چھائے ہوئے تھے۔

(4) اور ان سب سے بڑھ کر فوج' اس کے عہدہ داروں میں وہ لوگ نہیں آ سکتے تھے جو اپنے فرائض کو کسی معمولی منافع پر بجا لاتے بلکہ فاتحوں کی ایک جماعت ہوتی تھی جو اپنے کاشت کاروں کے نام فوج میں درج کراتے اور ان کی تنخواہیں شاہی خزانے سے خود اپنے لیے وصول کرتے۔ گویا آج سے ڈیڑھ سو سال پہلے بنگال کے خاندانی مسلمانوں کے لیے ناممکن تھا کہ وہ غریب ہوں لیکن آجکل ناممکن ہے کہ وہ بدستور امیر رہیں مختصر یہ کہ مسلمان نواب فاتح تھے اور اسی حیثیت سے حکومت پر چھائے ہوئے تھے۔" (11)

ایک نواب کے خزانے میں ہر سال تین ذرائع سے دولت جمع ہوا کرتی تھی۔ فوج کی افسری 'مالگزاری جمع کرنے کی خدمت' اور سیاسی و قانونی خدمات سرانجام دہی' یہ اس کی عظمت کے جائز ذرائع تھے لیکن اس کے علاوہ عدالتی خدمات اور سینکڑوں اور ذرائع بھی تھے جو فراہمی دولت میں کام آتے۔" (12)

مسلمانوں کی ذرائع آمدنی میں سے برطانوی حکومت کے ماتحت کیا باقی رہ گیا

(1) سب سے پہلے جنگی خدمات کو لیجئے جن کا دروازہ ان پر تمام و کمال بند ہے اچھے گھرانے کا کوئی مسلمان فرد ہماری فوج میں داخل نہیں ہو سکتا اور اگر ہو بھی جائے تو وہ اس کے لیے دولت پیدا کرنے کا ذریعہ نہیں بن سکتی۔ (13)

(نوٹ) بہت ہی کم مسلمانوں کے پاس گورنر جنرل کی کمیشن ہے اور جہاں تک مجھے علم ہے ملکہ کی کمیشن کسی کے پاس بھی نہیں۔ ہندوستانی صرف سپاہی کی حیثیت سے فوج میں بھرتی ہو سکتے ہیں اور شاذو نادر اگر کوئی افسری تک پہنچ بھی گیا ہے تو اس نے بھی درجہ بدرجہ ہی ترقی کی ہے اور اس قاعدہ سے کوئی بھی مستثنٰی نہیں صرف ایک مسلمان آنریری کپتان کے درجہ تک پہنچا ہے اور وہ کپتان حیات علی ہے جس کی سفارش کرنل روٹری نے غدر کے زمانہ میں کی تھی۔ یہ مسلمان ملکہ کے کمیشن لینے کا ہر طرح حق دار ہے۔ کیوں کہ میں ذاتی طور پر اس سے اور اس کے کارناموں سے واقف ہوں۔(14)"

مسلمانوں کی سفارش برائے فوجی خدمات

"ذاتی طور پر میرا عقیدہ ہے کہ ہندوستانی امراء کو جلد یا بدیر بعض شرائط کے ماتحت انگریزی فوج میں کمیشن افسر کی حیثیت سے داخل نہیں کر لینا چاہیے۔ آج کل کوئی کمیشن افسر ملکہ کی فوج میں ملازمت سے مال و دولت حاصل نہیں کر سکتا اور اس بات کو مسلمان بھی اچھی طرح جانتے ہیں مگر وہ ابھی تک فوجی زندگی کے اعزازات اور معقول تنخواہ کے خواہش مند ہیں اور اس بات کو سختی سے محسوس کر رہے ہیں کہ ان کا آبائی پیشہ ہمیشہ کے لئے ان سے چھن گیا۔(15)"

مسلمانوں کا دوسرا ذریعہ آمدنی

مسلمان امراء کا دوسرا ذریعہ آمدنی تھا مالگزاری جمع کرنا۔ اس اجارہ داری کی بنیاد اسلامی قوانین پر قائم گئی تھی۔ ٹیکس کی ادائگی مغلوبیت کی نشانی ہے۔ فاتح صرف ٹیکس ہی نہیں لیتا تھا بلکہ ٹیکس وصول کرنے کا نفع والا کام بھی انہیں کے سپرد ہوتا تھا۔ اس بات کو بار بار دہرانے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ ہندوستان میں فاتح اور مفتوح کے تعلقات اسلامی قوانین کے اس قدر ماتحت نہ تھے جتنے سیاسی اغراض کے۔ اسلئے پر جوش

اور غیر ملکی فاتحوں کو دیوانی کی تفصیلات میں الجھنا ناپسند تھا۔ وہ کاشتکاروں سے براہ راست معاملہ کرنے کی ذمہ داری اپنے ہندو پیادوں پر چھوڑ دیتے ۔ یہ طریقہ اس قدر عام تھا کہ اکبر نے جب ایک ہندو کو وزیر مالیات کے عہدہ پر فائز کیا اور اسی عذر کے ماتحت ٹوڈرمل نے مالیات کا قلمدان ہاتھ میں سنبھالا تو مسلمان شہزادوں نے احتجاج کے طور پر ایک وفد دربار شاہی میں بھیجا لیکن شہنشاہ نے جواب دیا۔ "تمہاری جائیدادوں اور معافی کی زمینوں کا انتظام کن کے ذمہ ہے۔" انہوں نے جواب دیا "ہمارے ہندو دلالوں کے" "بہت اچھا تو مجھے بھی اپنی ریاست کے انتظام پر ایک ہندو کو مقرر کرنے کی اجازت دیجئے ۔"

مالیات کے بڑے بڑے عہدے تو مسلمانوں ہی کے پاس رہے لیکن کاشتکاروں کے ساتھ براہ راست معاملہ کرنے کا دستور ہندو پیادوں کے ہاتھ میں رہا۔ حقیقت میں یہ ہندو ملازمین کی رقم سے خود اپنا حصہ وضع کرلیتے ۔ محکمہ مالیات شہنشاہ اکبر کے سامنے جوابدہ تھا اور اسلامی نظام مالیات کی ایک ہی اہم کڑی ۔ "مالگذاری کے قوانین" وہ نافذ کرتا لیکن یہ نفاذ عدالتوں کے ذریعہ نہیں بلکہ تلوار کے زور سے ہوتا۔ اگر مالیہ وصول نہ ہوتا تو سپاہیوں کو حکم دیا جاتا کہ وہ اپنی غارت گری سے دیہاتیوں کی زندگی کو اس وقت تک اجیرن بنائے رکھیں جب تک کہ ان سے آخری پائی تک وصول نہ ہو جائے ۔ کاشتکار اور ہندو پیادے دونوں کا وتیرہ ہمیشہ یہ ہی رہا ہے کہ کسی نہ کسی طرح مقررہ رقم پر چھٹکارا حاصل کرلیا جائے اس کے برعکس اعلیٰ مسلمان عہدہ داروں کی کوشش یہ تھی کہ جہاں تک ممکن ہو مقررہ رقم سے زیادہ وصول ہو۔

بنگال کو انگریزوں نے حاصل کیا تو شہنشاہ دہلی کے دیوان ہونے کی حیثیت سے پھر یہ عہدہ کسی بہت بڑی رشوت سے نہیں بلکہ تلوار کے زور سے لیا گیا۔ قانوناً ہم صرف شہنشاہ دہلی کے دیوان تھے ۔ یعنی چیف ریونیو افسر۔ اسی بناء پر مسلمانوں کا دعویٰ ہے کہ ہم کو اسی اسلامی طریقہ پر کاربند رہنا چاہیے جس کے انتظام کا ہم نے اس وقت ذمہ لیا تھا۔

جہاں تک میرا خیال ہے اس میں طرفین کا باہمی سمجھوتہ فی الواقعہ یہی تھا۔(16)

انگریزوں کا طاقتور ہوتے ہی مسلمانوں کو برباد کرنا اور معاہدوں کو توڑ ڈالنا

انگریزوں نے چند ایک سال تو مسلمانوں عہدہ داروں کو بحال رکھا لیکن جب اصلاح کا وقت آیا تو اس قدر احتیاط سے قدم اٹھائے کہ اس پر بزدلی کا گمان ہونے لگتا ہے بایں ہمہ سب سے کاری ضرب جو ہم نے پرانے طریق پر لگائی وہ اس قدر پر فریب تھی کہ اس کا پیش از وقت اندازہ نہ مسلمانوں کو ہو سکا نہ انگریزوں کو میرا مطلب ہے ان تبدیلیوں سے جو لارڈ کارنوالس نے رائج کیں اور جن سے 1793ء کا دوامی بندوبست مترتب ہوا اس بندوبست سے ان مسلمان افسروں کا کاروبار ہمارے ہاتھ میں آگیا جو حکومت اور ٹیکس جمع کرنے والوں کے درمیان واسطہ کا کام دیتے تھے جن کے سپاہیوں کو مالگزاری ٹیکس جمع کرنے کا جائز حق پہنچتا تھا مسلمان تعلق داروں اور ان کے سپاہیوں اور شمشیر زنوں کے بجائے اب ہم نے ہر ایک ضلع میں ایک کلکٹر مقرر کر دیا ہے اور اس کے ساتھ غیر مسلح خاصہ دار بھی جیسا کہ اس سے پہلے عام طور پر عدالتوں کے پیادے کام کرتے تھے مسلمان امراء کا یا تو مالگزاری سے کوئی تعلق نہیں رہا یا وہ محض زمیندار ہیں جن کو زمین کی آمدنی سے ایک مقررہ حصہ مل جاتا ہے۔ بہرحال ان تبدیلیوں کو دوامی بندوبست نے رائج نہیں کیا اس نے صرف ان کی تکمیل کی تھی البتہ اس نے مسلمان گھرانوں کو سخت نقصان پہنچایا۔ مگر ایک دوسرے رنگ میں اس بندوبست کا عام رجحان اس طرف تھا کہ ان ماتحت ہندو افسروں ہی کو زمین کا مالک قرار دے دیا جائے جو براہ راست کاشتکاروں سے مالگزاری وصول کرتے تھے۔(17)

زمینداری کے سلسلہ میں مسلمانوں کی تباہی کی دوسری وجہ

میں نے 90-1788ء کے بندوبست کے مسودات کا مطالعہ بڑی احتیاط سے کیا ہے اور میں بخوبی سمجھتا ہوں کہ ان دفعات کے باوجود جو 1793ء کے قانون میں دلالوں کے بارے میں درج ہیں اس وقت کے افسران مال کی نظروں میں پچھلے نظام مالگزاری کی صرف تین ہی کڑیاں تھیں یعنی حکومت ' مقامی ایجنٹ یا زمیندار جو کاشت کاروں سے براہ راست ' مالگزاری جمع کرتے تھے۔ اور کاشتکار جو زمین میں ہل چلاتے تھے اور انہیں تین کڑیوں کو ہم نے نظام میں داخل کیا۔ مسلمانوں کے نظام دیوانی کی دوسری کڑیوں کو ہم نے بالکل نظرانداز کر دیا یا وہ خود بخود مفقود ہو گئیں۔ مثلاً خود مختار تعلق داروں کی علیحدگی ہی سے بہت سے مسلمان خاندانوں کی عظمت خاک میں مل گئی۔ یہ خاندان اپنی ریاست کے کچھ حصہ کی کاشت کا دوامی پٹہ دوسروں کے نام لکھ دینے کے باوجود اپنے ماتحت زمینداروں پر ایک قسم کا قانونی حق رکھتے تھے اور پھر جب موقعہ ہوتا ان سے نذرانہ کے طور پر نقدی یا جنس ہتھیا لیتے۔ ایک افسر جس نے مسلمانوں کی موجودہ بے چینی اور دوامی بندوبست سے اس کے تعلق کا مطالعہ بڑی دقیق نظر سے کیا ہے لکھتا ہے "اس بندوبست نے ہندو کلکڑوں کو جو اس سے پہلے معمولی عہدوں پر مامور تھے ترقی دے کر زمیندار بنا دیا ہے ان کو زمین کی ملکیت کا حق حاصل ہو گیا ہے اور اب وہ اس دولت کو سمیٹ رہے ہیں جو مسلمانوں کی حکومت کے ماتحت مسلمانوں کا حق تھا۔ (18)"

مسلمانوں اور مسلمان بادشاہوں سے غداری

> سو یہ سب سے بڑی ناانصافی ہے جس کا مسلمان امراء انگریزی حکومت کو مجرم ٹھہراتے ہیں۔ ان کا دعویٰ یہ ہے کہ ہم نے مسلمان شہنشاہ سے بنگال کی دیوانی اس شرط پر لی تھی کہ ہم اسلامی نظام کو برقرار رکھیں گے۔ لیکن جونہی ہم نے اپنے آپ کو طاقتور پایا اس وعدے کو فراموش کر دیا۔ ہمارا جواب یہ ہے کہ جب ہم نے بنگال میں مسلمانوں کے نظام دیوانی کا مطالعہ کیا تو اس کو اس قدر یک طرفہ اس قدر ناکارہ اور اصول انسانیت کے خلاف پایا کہ اگر ہم اس کو برقرار رکھتے تو تہذیب کے لیے باعث ننگ ہوتے اس کے بعد وہ لکھتا ہے۔
>
> ہم اضلاع کے اندراج سے یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ اسلامی حکومت کا مقصد محض روپیہ جمع کرنا تھا۔"

یہ تو بقول ہنٹر مسلمانوں کی حکومت کا منشا رہا اب خود برطانوی سامراج کا منشاء کیا تھا یہ بھی خود ان کے دوستوں کی زبان سے سن لیجئے۔ مسٹر ہیری ورلسٹ (گورنر بنگال) لکھتا ہے۔

> کاشت کار اور کاریگر اگرچہ گراں شرح کا سودا کرتے تھے مگر اسی کے ساتھ وہ سرمایہ جہاں سے کہ وہ قرض لیتے تھے بڑھتا جاتا تھا مگر انگریزی عملداری میں معاملہ برعکس ہو گیا ہے۔ تاتاریوں کا حملہ ضرور شر انگیز عداوت تھی مگر اس کے مقابلہ میں ہماری حفاظت کو دیکھا جائے کہ اس سے ہندوستان تباہ ہو رہا ہے وہ ان کی عداوت تھی اور یہ ہماری دوستی۔ ہر ہر روپیہ جو ایک انگریز ہندوستان سے کماتا ہے وہ ہمیشہ کے لیے ہندوستان سے جدا ہوتا ہے۔ (19)

ایسٹ انڈیا کمپنی کا منصفانہ طرز عمل ملاحظہ فرمائیے۔

> "مالگزاری جمع کرنے والوں کے ذمہ حکومت کے تمام فرائض کر دیئے گئے تھے ان کو اس بات کی اجازت تھی کہ جو جی میں آئے کریں بشرطیکہ مالگزاری کا روپیہ باقاعدہ جمع کرتے رہیں عوام کو اس لیے ستایا جاتا ہے کہ زمینداروں کو لگان وصول ہوتا رہے ان کو اس لیے لوٹا جاتا تھا کہ

زمینداروں کے ملازمین دولت مند ہو جائیں اس ظلم و ستم کے خلاف شکایت بے سود تھی کیونکہ یہ زمیندار اور اس کے افسر کی مرضی پر منحصر تھا کہ وہ ان کی شکایات کو سنے یا نہ سنے ان کی شکایات کے ازالہ کا امکان بہت کم تھا کیونکہ ظالم بالعموم زمیندار ہی کا ملازم ہوتا تھا۔ پھر ڈاکوؤں کو کوشش کرکے گرفتار بھی کر لیا جاتا تھا تو ان کے لیے مشکل نہ تھا کہ قید کرنے والوں سے یارانہ گانٹھ لیں۔ (20)"

اس نظام قدیم کے توڑنے میں صریح وعدہ خلافی کا اقرار

جب ہم نے اس نظام کو توڑنا شروع کیا جس کو برقرار رکھنے کا ہم نے وعدہ کیا تھا تو ان بے چاروں کی جان میں جان آگئی۔ سب سے بڑی ناانصافی جو ہم نے مسلمان امراء سے کی وہ یہ تھی کہ ہم نے ان کے حقوق معین کر دیے۔ اس سے پہلے نہ ان کے حقوق کوئی مستقل حیثیت رکھتے تھے اور نہ متعین تھے حکومت وقت کے بہت سے تسلیم شدہ حقوق کی بیش بہا قربانی کے بعد ہم نے ملکیت زمین کو موروثی کر دیا اب مستقلاً اس کے مالک تھے۔ مگر جو قوم صدیوں سے قابل نفرت لوٹ مار کی عادی ہو محض گورنر جنرل کے لکھ دینے سے اپنی جاگیروں کے انتظام کا پر امن مشغلہ اختیار نہیں کر سکتی۔ دیہاتوں پر مسلمانوں کے ظلم ختم ہو گئے اور تیس سال بعد واگزاری کے قانون نے ان کی قسمتوں پر آخری مہر لگا دی۔ گزشتہ پچھتر سال سے بنگال کے مسلمانوں کے گھرانے یا صفحہ ہستی سے بالکل نابود ہو گئے ہیں یا ان لوگوں کے مقابلہ میں حقیر اور پست ہیں جن کو ہماری حکومت نے سربلند کیا ہے لیکن پھر بھی ان کی سرکشی گستاخی اور کاہلی میں کوئی فرق نہیں اور ایسا کیوں نہ ہو' آخر وہ نوابوں اور فاتحوں کی اولاد ہیں۔

مسلمانوں کی دولت کے دو بڑے ذرائع یعنی فوج اور محکمہ دیوانی کے متعلق ہم نے جو طرز عمل اختیار کیا ہے اس کے جواز میں بہت سے دلائل موجود ہیں گو اس میں کوئی شک نہیں کہ اس طرز عمل سے بنگال

کے مسلمان گھرانے بالکل تباہ و برباد ہو گئے۔ ہم نے مسلمان امراء کو فوج میں داخل نہیں کیا کیونکہ ہم کو یقین تھا کہ ہماری عافیت ان کو بے دخل کر دینے ہی میں ہے ہم نے ان کو دیوانی کے منفعت بخش محکمہ سے اس لیے خارج کر دیا کہ ایسا کرنا حکومت اور عوام کی بہتری کے لیے از حد ضروری تھا مگر یہ دلائل کتنے ہی وزنی کیوں نہ ہوں ان پرانے نوابوں کو مطمئن نہیں کر سکتے جو برطانوی حکومت کے بے راہ روی کی وجہ سے بڑی بڑی تکلیفیں اٹھا رہے ہیں۔ فوج سے بے دخلی مسلمانوں کے نزدیک سب سے بڑی قومی ناانصافی ہے اور ان کے پرانے نظام نظام مالیات سے ہمارا انحراف صریحاً وعدہ خلافی۔(21)“

مسلمانوں کا قانونی اداروں سے اخراج

ان کی عظمت کا تیسرا بڑا ذریعہ قانونی اور سیاسی یعنی دیوانی ملازمتوں کی اجارہ داری تھی۔ حالات اور واقعات پر زیادہ زور دینا ناواجب ہے لیکن پھر بھی سوچنا چاہیے کہ جتنے ہندوستانی سول سروس میں داخل ہوتے یا ہائی کورٹ کے جج بنتے ہیں ان میں ایک بھی مسلمان نہیں ہے۔ حالانکہ جب یہ ملک ہمارے قبضہ میں آیا تو اس سے کچھ عرصہ بعد تک بھی حکومت کے تمام کام مسلمانوں کے ہاتھوں سرانجام پاتے تھے جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں۔ مسلمان کلکٹر ہی مالگزاری جمع کرتے تھے۔ مسلمان فوجدار اور کوتوال ہی پولیس کے افسر تھے۔ مسلمانوں کا ایک بہت بڑا محکمہ جس کا صدر مقام نظام کے محل واقع مرشد آباد میں تھا اور صوبے کے تمام اضلاع میں اس کے افسروں کا جال بچھا ہوا تھا فوجداری قوانین نافذ کرتا تھا۔ مسلمان جیلر بنگال کے تمام قیدیوں سے رشوت لیتے تھے یا اپنی مرضی سے بھوکوں مرتے تھے قاضی یعنی اسلامی قوانین کے ماہر دیوانی اور خانگی عدالتیں قائم کرتے تھے۔ یہاں تک کہ جب ہم نے تربیت یافتہ انگریز افسروں کے ذریعہ انصاف کرانا چاہا تو یہی قاضی قانونی نکات پر مشورہ دینے کے لیے ان کے ساتھ بیٹھتے اسلامی شریعت ہی ملک کا قانون تھا اور حکومت کے تمام کارپرداز اور ماتحت افسر بدستور مسلمان ہی تھے۔ وہی سرکاری زبان بول سکتے تھے وہی سرکاری دستاویزات پڑھ سکتے تھے جو فارسی کے شکستہ خط میں لکھائی ہوئی ہوتی تھیں۔ کارنوالس کے مجموعہ قوانین نے اس اجارہ داری کو محکمہ قانون میں اس قوت کے ساتھ نہیں توڑا جس قوت کے ساتھ اس نے دیوانی محکمہ میں توڑا تھا۔ لیکن پھر بھی کمپنی کے پہلے پچاس سالہ دور حکومت میں حکومت کی ملازمتوں میں سب سے بڑا حصہ مسلمانوں ہی کا تھا لیکن دوسری نصف صدی میں ہوا کا رخ بدل گیا۔ پہلے تو اس کی رفتار کمزور تھی لیکن جوں جوں کاروبار سلطنت کو دیسی زبان میں نہ کہ ”پتو من“ میں جو مسلمان

فاتحوں کی غیر ملکی زبان تھی چلانے کی ضرورت کا احساس بڑھتا گیا یہ رفتار بھی بتدریج تیز ہوتی گئی۔ اب ہندوؤں نے ملازمتوں میں داخل ہونا شروع کیا اور رفتہ رفتہ سرکاری زندگی کے تمام شعبوں پر چھا گئے یہاں تک کو ڈسٹرکٹ کلکٹری میں جہاں اب بھی پرانے طریقے کے مطابق دوستی کی بناء پر ملازمت ملنے کا امکان ہے بہت کم مسلمان افسر ہیں جو مسلمان ابھی اس محکمہ میں باقی ہیں وہ بہت بوڑھے ہیں اور ان کا کوئی جانشین نہیں ہے۔ ابھی دس سال ہوئے ناظر یا مالگزاری کے افسر کی آسامیاں مسلمانوں کے بعد مسلمانوں ہی کو ملا کرتی تھیں مگر اب جیل کی ایک دو غیر مشہور آسامیوں کے سوائے ہندوستان کے یہ سابق فاتح اور کسی ملازمت کی امید نہیں رکھ سکتے مختلف دفاتر میں کلرکوں کا عملہ عدالت کی ذمہ دار آسامیاں اور تو اور پولیس کی اعلیٰ ملازمتیں سرکاری اسکولوں کے چالاک ہندو لڑکوں سے پر کی جاتی ہیں۔

اگر غیر مشہور نان گزیٹیڈ افسروں کے جم غفیر سے لے کر اعلیٰ عہدوں تک کا مطالعہ کیا جائے تو یہ سوال شخصی آراء سے نکل کر یقینی طور پر اعدادو شمار میں پہنچ جاتا ہے۔ دو سال کا عرصہ ہوا میں نے ایک سلسلہ مضامین میں ثابت کیا تھا کہ بنگال کے قانونی اور مالگزاری کے محکمے جن کی ملازمت کی بڑی خواہش کی جاتی ہے اور جن میں تناسب کا بہت خیال رکھا جاتا ہے مسلمانوں سے بالکل خالی ہو رہے ہیں۔ ان مضامین کا ترجمہ بہت جلد فارسی میں ہو گیا اور بہت سے دیسی اور اینگلو انڈین اخبارات نے ان کو نقل کیا تھا یا ان پر بحث کی تھی۔

حکومت بنگال نے مسلمانان کلکتہ کی اعلیٰ تعلیم کے متعلق تحقیقات کرنے کے لیے ایک کمیشن مقرر کیا تھا اس کے باوجود حکومت کی ملازمتوں میں مسلمانوں کا تناسب بدستور کم ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اس بیان کے ساتھ ذیل کے اعدادو شمار زیر نظر رکھئے سب سے اعلےٰ عہدوں کی جو آسامیاں پچھلی نسل سے پر کی گئی تھیں ان میں مسلمانوں کو زیادہ شکایت کی گنجائش نہیں کیونکہ اپریل 1869ء میں ہر دو ہندوؤں کے

مقابلہ میں ایک مسلمان تھا اور اب ہر ایک تین ہندوؤں کے مقابلہ میں ایک مسلمان ہے۔ دوسرے درجہ میں اس وقت تناسب دو مسلمان اور نو ہندوؤں کا تھا اور ایک مسلمان اور دس ہندوؤں کا ہے تیسرے درجہ میں اس وقت چار مسلمان اور باقی ستائیس ہندو اور انگریز تھے اور اب تین مسلمان اور باقی چوبیس ہندو اور انگریز ہیں۔ جب ہم چھوٹے درجوں میں جاتے ہیں تو 1869ء میں تمام اقوام کے لوگوں کی کل تعداد تیس تھی جن میں چار مسلمان تھے اور اب انتالیس کی کل تعداد میں صرف چار ہیں۔ امیدواروں میں جن سے آسامیاں پر کی جاتی ہیں۔

کل دو مسلمان تھے اور ان کی کل تعداد اٹھائیس تھی لیکن اب ان میں ایک بھی مسلمان نہیں۔

بہر حال غیر مشہور محکموں میں جہاں بنگال کی سیاسی جماعتیں تناسب کا بہت زیادہ خیال نہیں کرتیں مسلمانوں کی حالت اور بھی بد تر ہے۔ 1869ء میں ان محکموں کا تناسب یہ تھا

اسسٹنٹ گورنمنٹ انجینئرز کے تین درجوں میں

ہندو (14 نفر) مسلمان (0)

اکاؤنٹنٹ آفس میں

ہندو (50) مسلمان صرف 3

محکمہ پبلک ورکس کے سب انجینئر

- ہندو (24) مسلمان (1) اوور سیر ہندو (63) اوور سیر مسلمان (2)

نو آموز طبقہ

- ہندو (4 نفر) انگریز (2 نفر) مسلمان (0)

برسباڑ ڈیبنیٹ محکمہ

- ہندو (22) مسلمان (0) (12)

ان گزٹیڈ ملازمتوں کی فہرست جن پر ہندو، مسلمان، انگریز سب فائز ہو سکتے ہیں

بنگال میں سرکاری ملازمتوں کی تقسیم اپریل 1871ء میں

نام عہدہ	یورپین	ہندو	مسلم	کل تعداد
اکوشٹ سول سروس جنکا تقرر انگلستان میں بادشاہ کیطرف سے ہوتا ہے	260	+	+	260
عدالتہائے دیوانی کے افسر (غیر منظور شدہ اضلاع میں	47	+	+	47
اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر	26	7	+	33
ڈپٹی مجسٹریٹ وڈپٹی کلکٹر	53	113	30	196
انکم ٹیکس اسیسر	11	43	6	60
رجسٹریشن ڈپارٹمنٹ	33	25	2	60
عدالت خفیفہ کے جج اور سب جج	14	25	8	47
منصف	1	178	37	316
محکمہ پولیس تمام گزیٹڈ افسر	106	2	+	109
پبلک ورکس ڈپارٹمنٹ انجینئر	154	19	+	173
پبلک ورکس ڈپارٹمنٹ کا ماتحتی عملہ	72	125	4	201
پبلک ورکس ڈپارٹمنٹ اکوشٹ	22	54	+	76
میڈیکل ڈیپارٹمنٹ' میڈیکل کالج' جیل' خیراتی ڈسپنسری' حفظان صحت	89	65	4	158
چیک کانیکہ اور اضلاع کے میڈیکل آفیسر	38	14	1	53
محکمہ تعلیم و دیگر محکمہ جات مثلاً چنگی' بحری افسر' سروے' افیون	412	10	+	422
کل تعداد	1338	681	92	2111

غور فرمایئے کہ گزٹیڈ ملازمتوں میں جن کی کل تعداد دو ہزار ایک سو گیارہ ہے اس میں یورپین ملازم ایک ہزار تین سو اڑتیس ہیں اور ہندوستانی صرف سات سو تہتر میں بھی مسلمان کل بانوے ہیں یعنی کل ملازموں کے بیسویں حصہ سے بھی کم حالانکہ ایک صدی پہلے تمام عہدے انہیں کے پاس تھے اس اسلام دشمنی اور انگریزی نوازی کو انگریز ہی کی زبانی معلوم فرمایئے۔ اور مسلمانوں کے برباد کرنے کا فوٹو ذہن میں کھینچئے۔

ایک صدی قبل حکومت کے تمام ذمہ دار عہدوں پر مسلمانوں کا مکمل قبضہ تھا۔ ہندو محض شکریہ کے ساتھ ان چند ٹکڑوں کو قبول کر لیتے تھے جو ان کے سابق فاتح اپنے دستر خوان سے ان کی طرف پھینک دیتے تھے اور انگریزوں کی حیثیت چند ایک گماشتوں اور کلرکوں کی تھی۔ مسلمانوں اور ہندوؤں کا تناسب جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے۔ اب ایک اور سات کا ہے۔ ہندوؤں اور یورپینوں کا تناسب ایک اور دو کا مسلمانوں اور یورپینوں کا تناسب ایک اور چودہ کا تمام نظام حکومت میں اس قوم کا تناسب جو آج سے ایک صدی پہلے ساری حکومت کی اجارہ دار تھی کم ہوتے ہوتے ایک اور تیئس رہ گیا ہے اور وہ بھی ان گزٹیڈ ملازمتوں میں ہے جہاں تناسب کا خاص طور پر خیال رکھا جاتا ہے۔ پریزیڈنسی شہر کے دفتر کی معمولی ملازمتوں میں مسلمانوں کا حصہ تقریباً معدوم ہو چکا ہے۔ ابھی پچھلے ہی دنوں ایک بہت بڑے محکمہ کے متعلق معلوم ہوا کہ وہاں ایک شخص بھی ایسا نہیں جو مسلمانوں کی زبان پڑھ سکے دراصل کلکتہ کے سرکاری دفتر میں مسلمان اب اس سے بڑھ کر اور کوئی امید بھی نہیں رکھ سکتے کہ قلی اور چپراسی دواتوں میں سیاہی ڈالنے والا' قلموں کو ٹھیک کرنے والے کے سوا کوئی اور ملازمت حاصل کر سکیں۔ (22)

مسلمانوں کو فنا کرنے کے بعد ابھارنا اور ہندوؤں کے خلاف ان کو بھڑکانا

کیا ہندو ہمیشہ مسلمانوں سے بہتر ثابت ہوتے ہیں۔ کیا ان کو صرف ایک ایسے غیر جانبدار ماحول کی تلاش تھی جس میں رہ کر مسلمانوں کو اس دوڑ میں پیچھے چھوڑ جائیں۔ کیا مسلمانوں کے پاس سرکاری ملازمتوں کے علاوہ اپنی زندگی کو بہتر بنانے کے دوسرے ذرائع بکثرت موجود ہیں؟ اس لیے وہ سرکاری ملازمتوں سے بے اعتنائی برتنے اور ہندوؤں کے لیے اس میدان کو کھلا چھوڑ دیتے ہیں۔ (23)

مسلمانوں کی برتری کا اقرار اور ان کے عہدوں سے نکالنے کی مذمت

بے شک ہندو مسلمانوں سے زیادہ ذہین ہیں مگر ابھی تک انہوں نے اس عام اور نمایاں فوقیت کا کوئی ثبوت نہیں دیا جو گورنمنٹ کی ملازمتوں میں اجارہ داری کے لیے ضروری ہے اور ایسا کرنا ان کی گزشتہ تاریخ کے بالکل خلاف بھی ہے حقیقت یہ ہے کہ جب یہ ملک ہمارے قبضہ میں آیا تو مسلمان ہی سب سے اعلیٰ قوم تھی۔ وہ دل کی مضبوطی اور بازوؤں کی توانائی ہی میں برتر نہ تھے بلکہ سیاست اور حکمت عملی کے علم میں سب سے افضل تھے۔ لیکن اس کے باوجود مسلمانوں پر حکومت کی ملازمتوں کا دروازہ بالکل بند ہے غیر سرکاری ذرائع زندگی میں بھی انہیں کوئی نمایاں جگہ حاصل نہیں۔ (24)

مسلمانوں کا قانونی اداروں سے اخراج

اعلیٰ خاندانوں کے مسلمانوں کے لیے صرف ایک ہی پیشہ باقی رہ گیا ہے اور وہ پیشہ وکالت کا ہے۔ طبابت کا پیشہ جیسا کہ میں ابھی بیان کروں گا بالکل الگ حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن اب یہ حال ہے کہ سرکاری ملازمتوں سے کہیں زیادہ سختی کے ساتھ مسلمانوں پر قانون کا دروازہ بند کر دیا گیا ہے۔ بنگال میں ہر میجسٹی کے ہائی کورٹ آف جوڈیکچر میں دو ہندو جج ہیں اور مسلمان ایک بھی نہیں ہے۔ اس زمانہ میں اینگلو انڈین اور ہندو اس بات کا گمان بھی نہیں کر سکتے کہ ہائی کورٹ کے جج کبھی اس قوم میں سے مقرر کئے جائیں گے جو تمام عدالتی محکموں پر قابض تھی۔ پچھلی دفعہ جب میں نے 1869ء میں اعداد و شمار جمع کئے تھے تو ان کا تناسب حسب ذیل تھا۔

سرکاری قانونی افسر۔

انگریز (4 نفر) ہندو (2) مسلمان (0)

ہائیکورٹ کے وہ ملازم جن کا عہدہ اتنا بلند تھا کہ ان کا نام شائع کیا جائے

انگریز (14) ہندو (7) مسلمان (0)

بیرسٹر

انگریز (معلوم نہیں) ہندو (3) مسلمان (0)

اگر ہائیکورٹ کے ان وکلاء کی فہرست دیکھی جائے جن کا درجہ بیرسٹروں سے ذرا کم ہے تو یہ داستان اور بھی زیادہ عبرتناک ہو جائے گی یہ اس پیشہ کا ایک شعبہ ہے جو تمام کا تمام مسلمانوں کے ہاتھ میں تھا اور اس زمانہ کے کئی ایک آدمی ابھی تک بقید حیات موجود ہیں۔ ذیل کی فہرست 1834ء سے شروع ہوتی ہے۔ 1868ء کے وکلاء میں سے ایک انگریز ایک ہندو اور دو مسلمان ابھی تک زندہ ہیں۔

1838ء تک مسلمانوں کی تعداد ہندوؤں اور انگریزوں کی مجموعی تعداد کے برابر تھی اور تناسب حسب ذیل تھا۔

مسلمان وکلاء (6 نفر) ہندو (7 نفر) انگریز (1۔ نفر)

> جتنے وکلاء 1845ء اور 1850ء کے درمیان (ان دونوں سالوں کو شامل کرتے ہوئے) داخل فہرست کئے گئے ہیں۔ ان میں سے 1869ء کے زندہ وکلاء میں سے سب کے سب مسلمان ہیں۔ 1851ء تک بھی مسلمان اپنی جگہ سے نہیں ہٹے تھے اور حقیقت میں وہ ہندوؤں اور انگریزوں کی مجموعی تعداد کے برابر تھے۔ لیکن 1851ء سے یہ صورت حالات بدلنا شروع ہوتی ہے اب نئے نئے آدمیوں نے میدان میں آنا شروع کیا۔ قابلیت کے مختلف معیار قائم ہوئے چنانچہ اب فہرست کو دیکھیے تو معلوم ہو گا کہ 1853ء سے 1868ء تک کل دو سو چالیس ہندوستانی داخل کئے گئے جن میں دو سو انتالیس ہندو اور صرف ایک مسلمان۔
>
> اب ہم اس قانونی پیشہ کے دوسرے شعبوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ 1868ء میں ہائیکورٹ کے اٹورنی پروکڑا اور سالسٹرز میں سے ستائیس ہندو تھے اور مسلمان ایک بھی نہ تھا۔ آئندہ قانون داں بننے والوں میں سے چھبیس ہندو ہیں مسلمان کوئی نہیں غرضیکہ اس پیشے کے کسی شعبہ کا ذکر کیا جائے نتیجہ ہر حال میں یکساں ہو گا۔ 1868ء میں رجسٹرار ہائی کورٹ کے دفتر میں (17) ملازمین کی یہ حیثیت تھی کہ اگر

ان کے نام شائع کر دیئے جائیں تو ان میں چھ انگریز اینگلو انڈین ہوں گے- گیارہ ہندو اور مسلمان صفر- ریسیور کے دفتر سے چار نام ملے ہیں جن میں دو انگریز دو ہندو اور مسلمان کوئی نہیں- کلرک آف دی کراؤن اور ٹیکس افسر کے دفتر میں انگریزوں کی تعداد چار تھی ہندوؤں کی پانچ لیکن مسلمانوں مفقود محکمہ قانون کے کونے کونے سے اکوٹنس، شرف کورونز اور مترجمین کے دفاتر سے بیس نام بھیجے گئے ان میں سے آٹھ انگریز گیارہ ہندو اور صرف ایک مسلمان اس فہرست میں اپنی قوم کی نمائندگی کر رہا تھا لیکن یہ بیچارہ ایک ملا تھا جسے ہفتہ میں صرف چھ شلنگ ملتی تھی (تقریباً چھ روپیہ ماہانہ) 239

مسلمانوں کی طبابت

اب طبابت کی باری آتی ہے- بد قسمتی سے یہ پیشہ جیسا کہ ہندوستانی اطباء میں رائج ہے اعلیٰ خاندان کے مسلمانوں کے نزدیک پیشہ کی حیثیت نہیں رکھتا ایک معزز مسلمان کے ہمیشہ دو طبی مشیر ہوں گے- ایک تو وہ جسے انگریزی میں عام طور پر معالج کہتے ہیں اور جسے اپنے آقا کی نظر میں بڑی عزت اور وقعت حاصل ہوتی ہے، دوسرا جراح جس کو عرف میں حجام کہتے ہیں- داڑھی مونڈنے سے لے کر عضو کاٹنے تک تمام اعمال جراحی یہی کرتا ہے- پھر طب جراحت کے درمیان اس قدر تفاوت ہے کہ جس طبیب کی حالت ذرا بھی اچھی ہے وہ زخموں کی مرہم پٹی کرنے سے صاف انکار کر دیتا ہے- البتہ حجام جراح اس قسم کی حدود کا پابند نہیں عملی طور پر ہر قسم کی طب اس کی حدود میں داخل ہے- حقیقی مسلمان اطباء بہت ہی کم ہیں اور روز بروز کم ہوتے چلے جا رہے ہیں- شمالی ہندوستان میں گو ابھی تک ان کا چرچا ہے مگر بنگال کے اضلاع میں وہ بالکل معدوم ہیں- طبابت کا پیشہ اب ان پڑھ حجاموں کے ہاتھ میں ہے یا ہندو ڈاکٹروں کے-(13)"

انگریزی اقتدار سے مسلمانوں کو شکایات

مسلمانان بنگال کے پرائیویٹ خطوط اور اخباری مضامین سے زیادہ کوئی شے قابل رحم میری نظر سے نہیں گزری کچھ مدت ہوئی کلکتہ کے ایک فارسی اخبار (14) نے لکھا تھا آہستہ آہستہ مسلمانوں سے ہر قسم کی ملازمت خواہ وہ چھوٹی ہو یا بڑی چھینی جا رہی ہے اور دوسری قوموں کو دی جا رہی ہے۔ خصوصاً ہندوؤں کو۔ حکومت اپنی تمام رعایا کو برابر سمجھنے پر مجبور ہے۔ لیکن وقت ایسا آگیا ہے کہ وہ اپنے گزٹ میں اس بات کا خاص طور پر اعلان کرتی ہے کہ مسلمانوں کو سرکاری نوکری نہیں دی جائے۔ ابھی ابھی سندربن کے کمشنر کے دفتر میں چند آسامیاں خالی ہوئی تھیں اس افسر نے سرکاری گزٹ میں اشتہار دیتے ہوئے صاف صاف لکھ دیا تھا کہ یہ ملازمتیں سوائے ہندوؤں کے اور کسی کو نہیں ملیں گی۔

الغرض مسلمان اب یہاں تک قعر ذلت میں گر چکے ہیں کہ وہ سرکاری ملازمتوں کے قابل ہوں تب بھی ان کو سرکاری اعلانات کے ذریعہ ملازمت سے باز رکھا جاتا ہے ان کی قابل رحم حالت پر کوئی توجہ نہیں کرتا۔ اعلیٰ حکام تو ان کی ہستی تسلیم کرنے کے لیے بھی تیار نہیں۔

مسلمانان اڑیسہ کی شکایات

ذیل کے فقرات اس درخواست سے لیے گئے ہیں جو کچھ عرصہ ہوا مسلمانان اڑیسہ نے کمشنر کے سامنے پیش کی ان پر تکلف فقروں پر ممکن ہے بعض لوگوں کو ہنسی آ جائے مگر اس صوبہ کے سابق فاتحین کی حالت زار جس سے مجبور ہو کر انہوں نے اپنی ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں محض روٹی کے لیے التجا کی ہے بڑی ہی افسوس ناک ہے اور ہمیشہ انسان کو متاثر کرتی رہے گی۔

> "ہر مجسٹی ملکہ معظمہ کی وفادار رعایا ہونے کی حیثیت سے ہم یقین رکھتے ہیں کہ ملک کی سرکاری ملازمتوں میں ہمارا بھی مساویانہ حق ہے اگر سچ پوچھیے تو اڑیسہ کے مسلمانوں کو روز بروز تباہ کیا جا رہا ہے اور ان کے سر بلند ہونے کی کوئی امید نہیں مسلمان اعلیٰ خاندانوں سے تعلق رکھتے ہیں لیکن اب بالکل نادار ہیں اور ہمارا کوئی بھی پرسان حال نہیں۔ اب ہماری

> حالت ماہی بے آب کی طرح ہو رہی ہے۔ مسلمانوں کی اس ابتر حالت کو ہم جناب عالی کے حضور پیش کرنے کی جرات کر رہے ہیں۔ اس یقین کے ساتھ کہ جناب عالی ہی اڑیسہ کے ڈویژن میں ہر میجسٹی ملکہ معظمہ کے واحد نمائندہ ہیں ہمیں امید ہے کہ نسل و رنگ کے امتیاز سے بالا تر ہو کر ہر قوم کے ساتھ یکساں سلوک کیا جائے گا۔ اپنی سابقہ ملازمتوں کے چھن جانے سے ہم اس قدر مایوس ہو چکے ہیں کہ صمیم قلب سے دنیا کے دور دراز گوشوں کا رخ کرنے کے لیے تیار ہیں۔ ہم ہمالیہ کی برفانی چوٹیوں پر چڑھنے کے لیے مستعد ہیں۔ ہم سائبیریا کے بے آب و گیاہ حصوں میں مارے مارے پھرنے کے لیے آمادہ ہیں بشرطیکہ ہمیں یقین دلایا جائے کہ ایسا کرنے سے ہمیں دس شلنگ ساڑھے سات روپیہ ہفتہ کی ملازمت سے سرفراز کیا جائے گا۔ (15)
>
> "آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ مسلمانوں پر اس طرح سرکاری ملازمتوں اور تسلیم شدہ پیشوں کا دروازہ بند کر دیا گیا ہے بنگال کے مسلمانوں میں ذہانت کی کمی نہیں اور غربت کی خلش ہر وقت ان کو اس بات پر اکساتی رہتی ہے کہ وہ اپنی زندگی بہتر بنانے کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور کریں۔" (جواب ظاہر ہے کہ وہ ہندوستانی قوم کے فرد اور سیاسی رقیبوں میں سے دماغی قابلیت والے ہیں جن سے ہر وقت خطرہ ہے کہ اگر وہ کچھ بھی خوشحال اور قوی ہوں گے تو برطانوی غلامی کا جوا گردن سے پھینک کر دعویدار بن جائیں گے۔") مولف غفرلہ۔

ایک نہایت دل سوز اور انتہائی شرمناک معاملہ صوبہ بنگال و بہار و اڑیسہ کے اوقاف کا ہے۔ ان صوبوں کے مسلمان امراء نے بڑی بڑی جائدادیں رفاہ عام تعلیم وغیرہ کے لیے وقف کر رکھی تھیں جن سے تمام مصارف اس قسم کے انجام پاتے تھے۔ دیہات اور قصبات اور شہروں میں بے شمار مدارس اور اسکول جاری تھے۔ جن سے پبلک بغیر کسی قسم کے مصارف اور فیس ادا کرنے کے تعلیم پاتی تھی۔ بقول پروفیسر میکس مولر اسی ہزار مدرسے صوبہ بنگال میں جاری تھے۔ کوئی گاؤں یا قصبہ ان مدارس سے خالی نہ تھا جس کا بیان ہم پہلے کر چکے ہیں ان وقف شدہ زمینوں سے حکومت ایک پائی بھی وصول نہیں

کرتی تھی اور تمام آمدنی تعلیم وغیرہ کی انہیں مدارس میں خرچ ہوتی تھی حکومت تعلیمی اداروں پر اپنا خزانہ خرچ کرنے سے سبکدوش تھی اور تعلیمی چرچا ملک کے کونہ کونہ میں جاری تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی للچائی ہوئی آنکھیں اور زرطلبی کی انتہائی ہوس کب اس کو برداشت کر سکتی تھی۔ قبضہ پاتے ہی یہ حرص سوار ہوئی کہ جس طرح ممکن ہو ان زمینوں پر قبضہ کیا جائے۔ اگرچہ نتیجہ میں یہ علمی اور ضروری فریضہ انسانیہ (جس کو ہر متمدن قوم اور حکومت اپنے منصبی فرائض میں سے شمار کرتی اور کروڑوں اشرفیاں خرچ کرکے اپنی رعایا اور قوم کو علم سے آراستہ کرتی ہے۔) موت کے گھاٹ اتر جائے طرح طرح سے اس کی کوششیں شروع ہوئیں جس کی تفصیل مجملاً حسب ذیل ہے۔

> ''مسلمانان بنگال کا ہر اعلیٰ خاندان ایسے اسکول کا خرچ بھی برداشت کرتا تھا جس میں خود اس کے اور غریب ہمسایوں کے بچے مفت تعلیم حاصل کرسکتے تھے۔ جوں جوں صوبہ کے مسلمان خاندانوں پر ادبار چھاتا گیا۔ یہ خاندانی اسکول کم ہوتے اور ان کے اثرات بھی بتدریج مٹتے گئے۔ یہ ہمارے عہد حکومت کی دوسری نصف صدی تھی جب ہم نے انگریزی قانون کی ناقابل مدافعت قوت کو ان کے مقابلہ پر لا کھڑا کیا زمانہ قدیم سے ہندوستانی شہزادوں کا دستور چلا آتا تھا کہ وہ نوجوانوں کی تعلیم اور خدا کی رضا جوئی کے لیے زمین کے قطعات وقف کرتے تھے۔ مالگزاری جمع کرنے والا زمیندار یا مقامی مالک زمین کو اجازت تھی کہ ماتحت زمینوں میں جو چاہے کرے بشرطیکہ مالگزاری کی مقررہ مقدار ادا کرتا رہے۔ وہ اپنے مذہب کے مطابق مندر یا مسجد کے ساتھ کچھ علاقہ معافی کا وقف کردیتا اور کوشش کرتا کہ ساری عمر کے ظلم و تعدی کا کفارہ بستر مرگ پر مختلف قسم کے نیک کاموں سے ہو جائے۔ جب ہم نے صوبہ بنگال پر قبضہ کیا تو اس وقت کے قابل ترین افسر مال (مسٹر جیمز گرانٹ) کا تخمینہ تھا کہ صوبہ کا تقریباً ایک چوتھائی حصہ حکومت کے ہاتھ سے نکل چکا ہے۔ 1772ء میں وارن ہاسٹنگز کو اس انتہائی بے ایمانی (یہ الفاظ قابل غور ہیں) کا حال معلوم ہوا تو ان علاقوں کی واپسی کے خلاف عوام کا جذبہ اس قدر سخت تھا کہ کوئی کاروائی نہ ہو سکی۔ 1793ء میں لارڈ کارنوالس

نے پھر اس معاملہ کو بڑی شدومد سے اٹھایا کہ جس معافی کے علاقہ کے متعلق حکومت وقت سے منظوری نہ لی گئی ہو اس پر حکومت کا قبضہ ہونا چاہیے مگر اس وقت کی طاقت ور حکومت بھی اس اصول پر کار بند رہنے کا حوصلہ نہ کر سکی۔ پھر یہ معاملہ پچیس سال تک یونہی کھٹائی میں پڑا رہا اور 1815ء میں حکومت نے ایک بار پھر اپنے اس حق پر اصرار کیا۔ لیکن اس کے باوجود عمل کرنے کی جرات نہ ہوئی۔ لیکن آخر کار 1838ء میں مجلس قانون ساز اور محکمہ منتظمہ نے مل کر ایک بہت بڑی کوشش کا آغاز کیا۔ جس کے ماتحت عدالتیں مقرر کی گئیں اور آئندہ اٹھارہ سال تک تمام صوبہ میں مخبر، جھوٹے گواہ اور خاموش مگر مستقل مزاج افسران واگزاری گشت کرتے رہے۔ واگزاری کے مقامات پر 8 لاکھ پونڈ خرچ کرنے کے بعد حکومت کی مالگزاری میں تین لاکھ پونڈ سالانہ کا اضافہ مستقل ہو گیا یعنی ساٹھ لاکھ پونڈ کا سوا پانچ فیصد سالانہ کے حساب سے۔

اس رقم کا بہت بڑا حصہ ان زمینوں سے حاصل ہوتا ہے جو مسلمانوں یا اسلامی اوقاف کے پاس معافی کی حیثیت سے ہیں اس سے جو ابتری اور نفرت و حقارت کے جذبات پیدا ہوئے وہ ہمیشہ کے لیے دستاویزات میں ثبت ہو چکے ہیں۔ سینکڑوں خاندان تباہ ہو گئے اور مسلمانوں کا تعلیمی نظام جس کا دارومدار انہی معافیات پر تھا بالکل تہ وبالا ہو گیا۔ مسلمانوں کے تعلیمی ادارے اٹھارہ سال کی اس مسلسل لوٹ کھسوٹ کے بعد یک قلم مٹ گئے۔ جو شخص غیر جانبداری سے اس کی تحقیق کرے گا وہ اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ جب واگزاری کے قوانین کا مقصد محض ایسے حق کے نافذ کرنے کا تھا جس کو ہم نے بار بار پر زور طریقہ پر اپنے لیے محفوظ رکھا تھا تو پھر واگزاری کے مقدمات میں انتہائی سختی کیوں برتی گئی درآنحالیکہ وہ ہندوستان کے عام رائے کے بالکل خلاف تھی اس میں کوئی شک نہیں کہ حکومت کے صاف اور صریح قوانین کی موجودگی میں مروجہ رسم و رواج کا حق ایک غلط سی بات ہے

لیکن پچھتر سال کا مسلسل قبضہ اس امر کا حق ضرور پیدا کر دیتا ہے کہ حکومت نرمی کا برتاؤ کرے۔ ہمارے واگزاری کے افسر جنہوں نے قانون کو نافذ کیا تھا رحم کرنا جانتے ہی نہیں تھے ان دنوں کا خوف و ہراس اب تک بہت سے لوگوں کو یاد ہے اس سے ہمارے خلاف نفرت و حقارت کی ایک شدید وجہ پیدا ہو گئی اس وقت سے کسی شخص کا عالم دین ہونا جو ہندوستانی نوابوں کی نظر میں بڑا قابل عزت اور منفعت بخش پیشہ تھا۔ بنگال میں ہمیشہ کے لیے بند ہے۔ سب سے زیادہ نقصان اسلامی اوقاف کو پہنچا۔ لیکن اس میں بھی کچھ شک نہیں کہ مسلمانوں کے تعلیمی نظام کی تباہی واگزاری ہی سے شروع ہوتی ہے۔ وہابی مقدمات کے ذمہ دار افسر کی رائے میں یہ مسلمانوں کی تباہی کا دوسرا سبب تھا۔ بہر حال ان مقدمات کو حق بجانب ٹھہرایا جا سکتا ہے لیکن مسلمانوں کے اس الزام کا جواب نہیں دیا جا سکتا کہ ہم نے تعلیمی اوقاف کا ناجائز استعمال کیا۔ اس حقیقت کو چھپانے سے کیا فائدہ کہ مسلمانوں کے نزدیک اگر ہم اس جائداد کو جو اس میں مصرف کے لئے ہمارے قبضہ میں دی گئی تھی ٹھیک ٹھیک استعمال کرتے تو بنگال میں ان کے پاس آج بھی نہایت اعلٰے اور شاندار تعلیمی ادارے موجود ہوتے۔"

ڈاکٹر ہنٹر صفحہ 262 میں لکھتا ہے۔

"لیکن ان بے انصافیوں کی فہرست ابھی مکمل نہیں ہوئی جن کا مسلمان اپنے انگریز حاکموں کو ملزم ٹھہراتے ہیں۔ وہ ہمیں صرف اس بات کا ملزم قرار نہیں دیتے کہ ہم نے کامیاب زندگی کی تمام راہیں ان پر مسدود کر دی ہیں بلکہ یہ بھی ہے کہ ہم نے ان کی عاقبت کو خطرہ میں ڈال دیا ہے۔ دنیا کے ہر اچھے مذہب نے روحانی فرائض کی انجام دہی کے خاص دن مقرر کر رکھے ہیں ہم اس غم و غصہ کا اچھی طرح اندازہ کر سکتے ہیں جو انگریزوں کو اس وقت ہو گا جبکہ کوئی غیر ملکی فاتح خود بخود اپنی مرضی سے اس بات کا اعلان کر دے کہ آئندہ اتوار کو چھٹی نہیں ہوا کرے گی۔ ہندو اور مسلمان یکساں طور پر اپنے مذہبی تہواروں کی تنظیم کرتے ہیں

اور ان کے متعلق بڑے نازک جذبات رکھتے ہیں۔ ہندوستان کے بہت سے حصوں میں ان جذبات کا احترام کیا گیا ہے لیکن معلوم نہیں جنوبی بنگال کے مسلمانوں کو کچھ عرصہ سے کیوں نظرانداز کر دیا گیا ہے۔ ہم نے اول تو ان کی مذہبی ضروریات سے تدریجاً اغماض کیا۔ پھر ان کو بالکل بھلا دیا اور آخر کار ان سے قطعی منکر ہو گئے۔ پچھلے سال کلکتہ ہائیکورٹ کے مسلمان وکلاء نے اس بارہ میں دو عرض داشتیں بھیجی تھیں۔ انہوں نے اس بات کی طرف اشارہ کیا تھا کہ جب عیسائیوں کو سال میں باسٹھ چھٹیاں دی جاتی ہیں اور ہندوؤں کو باون تو پھر مسلمانوں کو بارہ کیوں ملتی ہیں۔ اس سے پہلے مسلمانوں کے لیے منظور شدہ چھٹیاں اکیس تھیں۔ اس کے باوجود عرضی گزاروں کی التجا صرف یہ تھی کہ ان تعطیلوں کی کم سے کم تعداد جواب گیارہ تک پہنچ چکی ہے اور کم نہ کی جائے۔ مختصراً یہ کہ اس حکم سے ان کے مذہبی تہواروں کا خاتمہ ہو جاتا ہے یہ ممانعت اس حکومت کی بہتر سالہ روایات کے خلاف ہے اگر ہندوؤں اور عیسائیوں کو ان کے مذہب کے مطابق چھٹیاں دی جا سکتی ہیں تو آپ کے سائل عرض پرداز ہیں کہ مسلمانوں کو بھی مذہبی فرائض کی بجا آوری اور تہواروں کو منانے کی چھٹی کیوں نہیں مل سکتی۔" گویا وہ قوم جو کبھی ہندوستان کے تمام عدالتی عہدوں پر فائز تھی اب اس حد تک ذلیل ہو چکی ہے حکومت اعلیٰ نے مداخلت کی اور حاکمانہ طور پر اسلامی تعطیلات کے چند دن مقرر کر دیئے۔ یقیناً وہ اتنے نہ تھے جتنے مسلمان چاہتے تھے۔"

ڈاکٹر ہنٹر مذکور صفحہ 265 میں لکھتا ہے:۔

"مسلمانوں کو شکایت ہے کہ ہم نے ان کو قانونی پیشہ ہی سے خارج نہیں کر دیا بلکہ مجلس قانون ساز کے ایک ایکٹ کی رو سے ان کے مذہبی اور شخصی قوانین کو پورا کرنے والے ضروری منصبداروں سے بھی محروم کر دیا ہے۔ اسلامی حکومت میں قاضی کے فرائض منصبی میں فوجداری دیوانی اور شرعی عدالت کے فرائض داخل تھے۔ پہلے پہل جب ہم نے ملک پر

قبضہ کیا تو عدالتی نظام کو جاری رکھنے کے لیے بڑی حد تک انہیں پر بھروسہ کیا تھا ہمارے سب سے پرانے قوانین میں ان کی اہمیت کو تسلیم کر لیا گیا ہے ہم نے قاضی کے عہدے کو برقرار رکھا اس کے فرائض کے متعلق پچیس دفعات کی طویل فہرست ہندوستان کی قانونی کتابوں میں اب بھی مل سکتی ہے۔

(بنگال کورڈ آر نمبر 4 1793ء و آر xiii 1793ء وغیرہ)

حقیقتاً قاضی کی حیثیت مسلمانوں کے شخصی اور مذہبی قوانین میں اس قدر ضروری ہے کہ اس بات کا فیصلہ ہو گیا تھا کہ جب تک قاضی برقرار رہیں گے ہندوستان دارالاسلام کہلاتا رہے گا۔ لیکن جب ان کو علیحدہ کر دیا گیا تو یہ ملک دارالحرب بن جائے گا۔ مسلمانوں کی بے اطمینانی سے ہم اس بات کو مجبور ہو گئے ہیں کہ عام مسلمانوں کے جذبات کی تحقیقات کریں۔ بد قسمتی سے ان تحقیقات کی ابتداء بہت تھوڑے دنوں سے ہوئی۔ 1863ء میں صوبجات کے گورنروں میں سے ایک نے اعتراض کیا تھا کہ قاضیوں کا تقرر گویا اس بات کا اقرار ہے کہ حکومت ان کی مقدس حیثیت کو تسلیم کرتی ہے جس کا مطلب یہ ہو گا کہ ہم مسلمانوں کو اس امر کا حق دیتے ہیں کہ وہ ان کا تقرر بطور خود کر سکتے ہیں چنانچہ بہت کچھ بحث و تمحیص اور حکومت بمبئی کی طرف سے پرزور احتجاج کے بعد اس مضمون پر تمام سابقہ قوانین منسوخ کر دیئے گئے اور حکومت نے قاضیوں کا باقاعدہ تقرر بند کر دیا۔ (ایکٹ نمبر xi 1864ء جو بعد میں 1868ء کے ایکٹ viii کے ضمیمہ کی رو سے منسوخ کر دیا گیا تھا مگر اس نے ان قوانین کو زندہ نہ کیا جس کی رو سے پہلے تقرر کیا جاتا تھا (اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پچھلے سات سال سے مسلمانوں کا بہت بڑا اور ہمیشہ بڑھتا ہوا حصہ ایک ایسے عہدہ دار سے محروم ہو گیا جس کا وجود شادی بیاہ اور دوسری خاندانی رسم و رواج کے منانے کے لیے از حد ضروری ہے۔ شروع شروع میں اس مصیبت کا احساس زیادہ نہیں ہوا تھا کیوں کہ پرانے قاضی ابھی موجود تھے اور قانون مذکور کا اطلاق صرف اس وقت

ہوتا تھا جب کوئی قاضی مرجاتا یا پنشن پالیتا اور پھر اس کی جگہ ازروئے قانون پر نہیں کی جا سکتی تھی۔ اول اول موجودہ وائسرائے نے اس معاملہ پر غور و خوض کرنا شروع کیا تھا مگر قطعی فیصلہ کئے بغیر پھر 1870ء میں مدراس ہائیکورٹ نے اس مسئلہ پر بحث کی اور اس کا فیصلہ کر دیا۔ مسٹر جسٹس کو بٹ کے فیصلہ کے بعد شک و شبہ کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ صرف حکومت ہی قاضیوں کو مقرر کر سکتی ہے۔ اگر قاضی کا تقرر نہ ہو تو مسلمان اس بات کے مجاز نہیں کہ از خود کسی کو قاضی منتخب کر لیں۔

(اصل مقدمہ نمبر 4530 محمد ابوبکر مخالف میر غلام حسن اور انور)

گویا 1864ء کے ایکٹ نے اس قوم سے ان کے قوانین کا ایک اہم عہدیدار چھین لیا جس کے فرائض تھے انتقال ناموں کی تسوید و تعریف عقد نکاح اور دوسرے مذہبی فرائض و مراسم کی بجا آوری۔

اب صورت حالات یہ ہے کہ جنوبی بنگال میں سب سے بڑی مصیبت جو ایک مجسٹریٹ پر آسکتی ہے اور جس سے چھٹکارا پانے کا کوئی ذریعہ نہیں ہوتا۔ مسلمانوں کے ازدواجی مقدمات ہیں۔ بعض نامعلوم وجوہ کی بنا پر مسلمانوں کے ازدواجی تعلقات کچھ عرصہ سے بہت ہی نازک ہو گئے ہیں۔ زنا کاری اور اغوا کے مقدمات (یہ دو تو تعزیرات ہند کے ماتحت آجاتے ہیں) اضلاع دہانہ کی عدالتوں میں دھڑا دھڑ آرہے ہیں۔ ان دس مقدمات میں سے نو ایسے ہوتے ہیں جن میں نکاح قانونی طور پر ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ مشرقی بنگال کے دو حلقوں میں 62 ـ 1861ء کے اندر یعنی جب سے حکومت نے قاضیوں کا تقرر بند کر دیا ہے اس سے دو سال پہلے کل مقدمات کی تعداد 561 تھی۔ 1866ء میں یعنی قاضیوں کا تقرر بند ہو جانے کے دو سال بعد یہ تعداد بڑھتے بڑھتے 1984 تک پہنچ گئی۔ لیکن اس وقت سے فوجداری اعداد و شمار میں ان کی تعداد کم ہوتی گئی ہے۔ واقعتاً نہیں بلکہ اس لیے کہ اب یہ دستور ہے کہ ایسے مقدمات کو دیوانی عدالت میں منتقل کر دیا جاتا ہے۔ دوسرا پہلو اس سے بھی زیادہ خطرناک

> ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ باقاعدہ قاضیوں کی غیر موجودگی میں مسلمانوں کے لیے ناممکن ہے کہ وہ اپنی زندگی مذہبی قواعد کے مطابق بسر کرسکیں ان کی اجازت مذہبی مراسم کے لیے ہی ضروری نہیں بلکہ مسلمانوں کی روز مرہ زندگی میں بھی کئی ایک چھوٹے چھوٹے شرعی مسئلے ایسے پیدا ہوتے رہتے ہیں جن کا صحیح حل صرف قاضی ہی کر سکتا ہے۔ اس قسم کے منصب کی غیر موجودگی میں ہر اس شخص کو جو حکومت کا وفادار نہیں مسلمانوں پر واضح کرنے کا بہت کافی موقعہ مل جاتا ہے کہ موجودہ حکومت اس قابل ہی نہیں کہ ہم اس کے ماتحت اچھی زندگی بسر کرسکیں۔ برعکس اس کے حکومت کے مقرر کردہ قاضیوں کو ماننا اور ان سے کام لینا فی الحقیقت اس حکومت کے بااختیار اور جائز ہونے کا اعتراف کرنا ہے۔"

ہم نے اس جگہ زیادہ تر شہادتیں ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر کے مصنفہ رسالہ (ہمارے ہندوستانی مسلمان) سے نقل کی ہیں۔ اس لیے کہ وہ 1857ء سے پہلے واقعات پر زیادہ وضاحت کے ساتھ روشنی ڈالتی ہیں چونکہ وہ جنوبی بنگال میں عرصہ دراز تک ملازم رہا تھا اس لیے اس کو اعداد و شمار پیش کرنے اور احوال کے مفصل معلوم کرنے کے ذرائع بہت سے حاصل تھے۔ مگر یہ احوال صرف بنگال یا اس کے جنوبی حصہ کے نہیں تھے بلکہ تمام ہندوستان کے یہی احوال تھے۔ چنانچہ اس کا یہ قول ہم پہلے نقل کر آئے ہیں۔

یہ کہنا کہ فتوحات سے انگریزوں نے ہندوستان کو حاصل کیا ہے بالکل غلط ہے بلکہ ڈپلومیسیوں عہد شکنیوں، رشوتوں آپس میں پھوٹ ڈالنے وغیرہ چالبازیوں سے ملک حاصل کیا گیا تھا۔ پروفیسر سیلے ایکسپنشن آف انگلینڈ میں لکھتا ہے:

> اگر ہندوستان میں متحدہ قومیت کا کمزور جذبہ بھی پیدا ہو جائے اور اس میں اجنبیوں کے نکالنے کی کوئی عملی روح نہ بھی ہو بلکہ صرف اس قدر احساس عام ہو جائے کہ اجنبی حکومت سے اتحاد عمل ہم ہندوستانیوں کے لیے شرمناک ہے تو اسی وقت سے ہماری شہنشاہیت کا خاتمہ ہو جائے گا۔ کیونکہ ہم درحقیقت ہندوستان کے فاتح نہیں ہیں اور نہ اس پر فاتحانہ حکمرانی کرسکتے ہیں۔ اگر اس طرح ہم حکومت کرنی بھی چاہیں گے تو اقتصادی طور پر قطعاً برباد ہو جائیں گے۔

> "میرے بیانات کا تعلق جنوبی بنگال سے ہے کیونکہ یہ وہ صوبہ ہے جس میں اچھی طرح جانتا ہوں اور جہاں تک مجھے علم ہے مسلمانوں نے برطانوی حکومت کے ماتحت سب سے زیادہ یہیں نقصان اٹھایا ہے پھر اگر میں دوسروں کو یہ یقین دلاؤں اور خود میرا بھی یہی خیال ہو کہ یہ بیانات تمام مسلمانان ہند پر راست آتے ہیں تو مجھے اس پر معاف فرمایا جائے۔"

واقعہ یہی ہے کہ انگریزوں نے جو طرز عمل بنگال میں اختیار کیا تھا وہی طریقہ ہر ہر صوبہ میں جاری کیا گیا۔ لفٹنٹ جنرل میک لیوڈ اینس نے اپنی کتاب (بغاوت فوج) میں مندرجہ ذیل الفاظ لکھے ہیں۔

> "ملک کے لوگوں کی کثیر تعداد ہمارے تحت میں فتوحات سے یا جبریہ الحاق سے آئی تھی حکمراں خاندان تخت سے اتارے گئے یا کچل دیئے گئے۔ بڑے خاندان ذلیل کئے گئے۔ لوگوں کے اختیارات اور مناصب اور جائدادیں چھن جانے سے مصیبتیں نازل ہوئیں۔ ان حالات میں اس بارہ میں شک کرنا خلاف عقل تھا کہ ہمارے دشمنوں کی ایک جماعت تیار اور مرتب ہو گئی تھی۔"

بادشاہ دہلی سے 1806ء کے معاہدہ کے مطابق دفتروں اور عدالتوں کی زبان فارسی تھی جس میں مسلمانوں کو پوری مہارت تھی مگر 1837ء میں خلاف معاہدہ تمام دفاتر کی زبان انگریزی کر دی گئی۔ مس میو مدر انڈیا میں لکھتی ہیں۔

> "ایک چھوٹا سا بیج بویا گیا اور اس کے پھل سے ہم اب متمتع ہو رہے ہیں یہ عدالتوں کی زبان کی تبدیلی تھی جو فارسی سے انگریزی کر دی گئی۔ "ہندوستان کی تعلیم کو مغربیت کا رنگ دینے کا یہ لازمی نتیجہ تھا۔ یہ تبدیلی معمولی معلوم ہوتی تھی اور اس کے نتائج بھی معمولی تھے۔ اس کی مثال ایسی تھی جیسی کہ کلہاڑی سے ایک ضرب لگائی جاتی ہے۔ مسلمانوں نے اس تبدیلی پر سخت احتجاجات کئے اور فی الواقع یہ ان کے لیے سخت برباد کن تھی۔(32)"

انگریزوں نے ملک مسلمانوں سے لیا تھا اس لیے کہ ان کو ہروقت خطرہ رہتا تھا کہ کہیں مسلمان ہم سے اس ملک کو واپس نہ لے لیں اور ہم کو یہاں سے بے دخل نہ کر دیں۔

خصوصاً اس بناء پر کہ ان کی دماغی قابلیت اور جسمانی طاقت' عزم و استقلال ' سیاسی مہارت وغیرہ ایسے اوصاف ہیں جن کے ہوتے ہوئے ایسے خطرات کا ہمیشہ انتظام کرنا ضروری سمجھتے رہے کہ مسلمانوں کو اس قدر کچل دیا جائے کہ ان میں اٹھنے کی طاقت نہ رہے اور ہندوؤں کو اتنا ابھار دیا جائے کہ اگر کسی وقت میں مسلمانوں سر اٹھائیں بھی تو یہ ان کے دبانے کے لیے کافی ہو سکیں مگر ہندوؤں کو بھی اتنا نہ ابھارا جائے کہ وہ ہمارے مقابلہ پر آ سکیں اسی بناء پر اگرچہ ہندوؤں نے تعلیم میں بہت کچھ ترقی حاصل کر لی تھی ان کو ذمہ دار عہدوں سے ہمیشہ محروم رکھا گیا بالخصوص فوج کے بالائی عہدوں کے پاس اخیر تک کسی ہندوستانی کو پھٹکنے نہیں دیا گیا۔ حالانکہ یہی ہندوستانی ہندو اور مسلمان شاہان مغلیہ وغیرہ کے تمام عہدوں پر سپہ سالاری (جرنیلی) سے لے کر ادنیٰ فوجی عہدہ تک اور وزارت سے لے کر ادنیٰ سویلین تک تمام ملکی اور فوجی خدمتیں باحسن الوجوہ انجام دیتے تھے۔(33)

بہر حال مسلمان انگریزوں کی آنکھوں میں ہمیشہ کانٹے کی طرح کھٹکتے رہے اور ان کو طرح طرح کی تدبیروں سے برباد کیا گیا۔ ڈاکٹر ہنٹر لکھتا ہے۔

> "ایسٹ انڈیا کمپنی کے سابق ملازمین اپنی حیثیت کو اچھی طرح سمجھتے تھے اور جب انہوں نے پہلے پہل صوبہ جات پر قبضہ کیا تو اسلامی نظام کو برقرار رکھا انہوں نے شرع اسلامی کو ملک کا قانون بنایا اور اس کے نفاذ کے لیے مسلمان قاضی مقرر کیے اس وقت جو بھی کیا جاتا دہلی کے مسلمان شہنشاہ کے نام پر کیا جاتا۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی بادشاہت کا ظفری امتیاز حاصل کرنے سے اس قدر ڈرتی تھی کہ ایک طویل مدت تک بھی جب مسلمان ملازمین کی وساطت سے حکومت کرنے کی کوشش اسلامی نظام کی ناقابل ذکر بدعنوانیوں کے باعث قطعاً ناکامیاب ہو چکی تھی اس نے یہی ظاہر کیا کہ وہ بادشاہ کی نائب ہے۔ یہ ایک تاریخی واقعہ ہے کہ اس کی ظاہر داری نے آخر ایک قابل نفرت تماشے کی صورت اختیار کر لی تھی۔ ہم اس زمانے میں بھی جب ہمارا اریزیڈنٹ شاہ دہلی کو ایک غریب قیدی کی طرح کھانے پینے کے لیے کچھ ماہوار رقم بطور وظیفہ دیا کرتا تھا جو حکم جاری کرتے اسی کے نام پر کرتے

(1773ء تک سکوں پر یہ عبارت کندہ ہوتی تھی جو ناموں کے تغیر کے ساتھ متواتر جاری رہی۔ بادشاہ شاہ عالم پاسبان دین محمدی سایہ رحمت الٰہی نے یہ سکہ ہفت اقلیم میں جاری کرنے کے لیے ڈھالا۔ اور دوسری طرف کندہ ہوتا تھا۔ مرشد آباد میں تخت نشینی کے انیسویں سال ہمایوں میں ڈھالا گیا۔)

چونکہ اب تک جو لوگ ہندوستان کی تاریخ پر قلم اٹھاتے رہے وہ کبھی ہندوستان نہیں آئے اس لیے ان سے توقع نہیں کی جا سکتی کہ انگلستان میں بیٹھ کر ایسٹ انڈیا کمپنی کے اس عجیب و غریب طرز عمل کو سمجھ سکیں گے جس کو ہم نے ابھی بیان کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر ہم نے بادشاہت قبول کرنے میں دس سال بھی جلدی کی ہوتی تو ہم مسلمانوں کی ایسی بغاوت میں گھر جاتے جو 1857ء کی بغاوت سے بھی کہیں زیادہ خطرناک ہوتی۔ مسلمان محسوس کرتے کہ ان کی حیثیت یک قلم بدل گئی ہے ہماری اپنی حالت بھی ایک ایسی کافر طاقت کی ہو جاتی جس نے دارالاسلام پر قبضہ کر لیا ہو۔ اندریں حالات مسلمانوں کی ایک بہت بڑی اکثریت جمع ہو جاتی کہ بغاوت کو فرض عین قرار دے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازمین کی قابل تعریف اعتدال پسندی اور اس عزم بالجزم نے کہ "اسلامی سلطنت کی تدریجی اور طبعی موت میں ایک لمحہ بھر کی عجلت نہیں کی جائے۔" اس مصیبت کو ہمارے سر سے ٹال دیا ہندوستان بتدریج اور غیر محسوس طور پر دارالسلام سے دارالحرب میں تبدیل ہوتا گیا۔

شاہی ضلع وار دستاویزات کی کئی سال تک تحقیق کرنے کے بعد بھی میرے لیے یہ بتلانا ناممکن ہے کہ یہ تبدیلی کس سال یا کس مدت میں واقع ہوئی۔ مسلمان بادشاہ کی ظاہری برتری کو مٹانے سے بہت پہلے ہم نے مسلمان حاکموں کو برطرف کرنا شروع کر دیا تھا۔ لیکن اب برائے نام عظمت کے محض تماشہ بن جانے کے بعد بہت کافی عرصہ حتیٰ کہ 1835ء تک ہمارے سکے اسی کے نام سے جاری ہوتے تھے (1835ء

> میں کمپنی کے روپیہ پر جس کا وزن 180 گرین تھا انگریزی بادشاہ کی شکل بنائی گئی تھی اور ایسٹ انڈیا کا نام لکھا گیا تھا) پھر جب ہمیں یہ جرات ہوئی کہ سکوں پر انگریز بادشاہ کی شکل دیدی جائے تب بھی ہم نے اسلامی دستور العمل اور عدالتوں میں اسلامی زبان کو برقرار رکھا گو یہ باتیں بھی اپنی اپنی باری پر بتدریج مٹ گئیں۔ حتیٰ کہ 1864ء میں ہم نے ایک دلیرانہ قدم اٹھایا میرے خیال میں یہ قدم بڑا ہی غیر دانشمندانہ تھا۔ یعنی مجلس قوانین ساز کے ایک ایکٹ کے ذریعہ ہم نے تمام مسلمان قاضیوں کو برطرف کر دیا۔ اس قانون نے نئی ہندوستانی سلطنت کی اس عمارت کو مکمل طور پر دارالحرب میں بدل دیا جس کی تعمیر پوری ایک صدی 1765ء سے 1864ء تک ہو رہی تھی۔ اسلامی حکومت کے اس طرح بتدریج مٹنے سے ہماری مسلمان رعایا پر نئے نئے فرائض عائد ہوتے گئے۔"(34)

"مسلمانوں سے انہیں خطروں کے ماتحت ہندوستان میں سود در سود کا قانون بھی رائج کیا گیا۔ دوسری مصلحت یہ تھی کہ ہندوستان پر قومی قرضہ (انڈین نیشنل ڈیٹس) اس قدر بڑھ جائے کہ وہ کبھی سبکدوش نہ ہو سکے اور روپیوں کے دریا سود کی وجہ سے انگلستان کی طرف ہمیشہ بہتے رہیں۔ ہندوستان میں قدیمی زمانہ سے دام دوپٹ کا قانون جاری تھا یعنی اصل قرض کی مقدار ہی میں سود کی ڈگری دی جاتی تھی۔ پھر اس ڈگری کے بعد حکومت قرض خواہ کی پشت پناہ نہ ہوتی تھی قرض خواہ (مہاجن اور قرضدار آپس میں کسی مقدار پر صلح کرکے سبکدوش ہو جاتے تھے۔ مگر انگریزی قانون حکومت کو مہاجن کا پشت پناہ بنانے لگا۔ حکومت قرض دار کو صرف قید و بند ہی نہیں بلکہ قرقی وغیرہ سے بھی مجبور کرکے مہاجن کو کامیاب بنانے لگی۔ اول تو سود اور سود در سود ہی ایسی عظیم الشان مصیبت بن گیا کہ سو در سود قرضہ چند ہی سالوں میں لاکھوں کی مقدار پر پہنچ جاتا تھا۔ ثانیاً حکومت اپنی ذمہ داری کی بناء پر جائدادیں اور گھر کے زیورات اور دیگر سامان وغیرہ قرق کرکے بیچنے لگی۔ اس قانون نے ہزاروں مسلم امراء اور نوابوں کے خاندان اور لاکھوں زمینداروں کو لنگوٹیا' نان جویں کا محتاج ' فاقہ مست بنا دیا۔ ان امراء اور نوابوں اور زمینداروں کی زمانہ ہائے سابق میں بڑی بڑی آمدنیاں، تھیں ان کی عادتیں تمام ضروریات زندگی اور رسومات بیاہ شادی اور

رسومات موت و غمی اور امور مذہبی وغیرہ میں نہایت کشادہ بلکہ فضول خرچیوں اور اسراف تک کی پڑی ہوئی تھیں۔ وقت پر اگر سرمایہ موجودہ کافی نہ ہوتا تھا تو قرض لے کر پوری کرتے اور اپنی جائدادوں وغیرہ کی آمدنیوں سے قرض ادا کرتے تھے مگر اس قانون سود در سود نے بہت ہی تھوڑے عرصہ میں سب کا دیوالیہ نکال دیا۔ پرانے روساء اور امراء اگرچہ حکومت اور عہدہ ہائے بالا سے محروم کر دیئے گئے تھے مگر ان کی عادتیں اور نام و نمود کی خواہشیں برابر باقی تھیں اس لیے ان کی کشادہ دلی اور رسوم کی ادائیگی میں فرق نہ آیا اور نہ آتا تھا۔ رسی جل جاتی ہے مگر اس کی اینٹھن نہیں جاتی۔ چنانچہ یہی ہوا۔ مہاجن جائدادوں کے مالک بن گئے اور لاکھوں مسلمان خاندان بربادی کے گھاٹ اتر کر نیست و نابود ہو گئے علاوہ ان رسوم کے تعلیمی مصارف کی روز افزوں زیادتی اور کورٹوں کے اندھا دھند مصارف نے (جو کہ زمانہ ہائے قدیمہ میں پائے نہ جاتے تھے کیونکہ انگریزی قانون نے انصاف اور تعلیمات کو انتہائی گرانبار اور گراں کر دیا ہے۔ بالخصوص عدالت دیوانی میں تو انصاف حاصل کرنا بغیر مصارف شدید کے ناممکن ہو گیا ہے) بھی ہزاروں غیر مسرف خانوادوں کو خاک میں ملا دیا۔ یہ سب مٹنے والے خاندان عموماً مسلمان تھے اور مہاجن عموماً غیر مسلم تھے۔

ادہر صنعت و تجارت کے پیشے بھی عام طور پر مسلمانوں میں پائے جاتے تھے۔ خشکی اور سمندروں میں سفر کرنے کے مسلمان ہی عادی تھے۔ دور دراز ملکوں سے ان کے تعلقات تھے۔ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ کس طرح دونوں کو انگریزوں نے مٹایا ہے جس سے خصوصی طور پر لاکھوں تجارت پیشہ اور دست کار خاندانوں کا خاتمہ ہو گیا۔ بہر حال انگریزی حکومت اور اس کے ذمہ داروں نے عام ہندوستانیوں اور بالخصوص مسلمانوں او بالاخص بڑے مسلمان روسا اور امراء کو انتہائی درجہ میں نیست نابود کر دیا۔

مذکورہ بالا امور جن کو ہم نے کافی شرح وسط کے ساتھ بیان کیا ہے۔ یہی وہ امور تھے جنہوں نے مسلمانوں میں ایک تڑپ پیدا کر دی۔ یہ تڑپ کیا تھی۔ ایک درد تھا۔ پوری ملت کا ایک درد تھا جو اس کو گلو خلاصی پر مجبور کر رہا تھا یہ ایک نیم بسمل قوم کی اضطرابی حرکت تھی۔ جسکا منشا یہ تھا کہ ملک اور ملت ان مصائب سے نجات پائے جن کے نشتر شب و روز جسد ملت کے ہر رگ و پے میں پیوست ہو رہے تھے اس مذبوحانہ اضطراب نے مسلمانوں کو کس طرح آمادہ انقلاب کیا اور انکے رہنماؤں بالخصوص حضرت علماء نے اپنی ایمانی فراست اور دانش

مندانہ بصیرت سے کس طرح انقلاب کالائحہ عمل پیش کیااور حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہ' العزیز اور آپکے متوسلین نے کس طرح جانبازانہ اور سرفروشانہ کوششوں میں اپنی زندگی صرف کی اسکی تفصیل دوسری جلد (جدوجہد آزادی میں علماء حق کا کردار) میں پیش کی جائے گی۔ واللہ الموقف وھو المعین

حوالہ جات باب سوم

1۔ حکومت خود اختیاری ص 30

2۔ رپورٹ سلیکٹ کمیٹی ص 402

3۔ ہمارے ہندوستانی مسلمان ص 212

4۔ ایضاً

5۔ ڈبلیو ہنٹر از مسٹر بے لے سیکرٹری محکمہ داخلیہ حکومت ہند

6۔ ہمارے ہندوستانی مسلمان

7۔ ایضاً

8۔ ایضاً

9۔ ایضاً

10۔ ایضاً ص 217۔ 221

11۔ ایضاً ص 222

12۔ ایضاً ص 222

13۔ ایضاً ص 223

14۔ ہمارے ہندوستانی مسلمان حاشیہ ص 243

15۔ ایضاً ص 223

16۔ ایضاً

17۔ ایضاً

18۔ ایضاً ص 227

19۔ حکومت خود اختیاری ص 12

20۔ ایضاً ص 228

21- ایضاً ص 231

22- ایضاً

23- ایضاً

24- ایضاً

25- ایضاً ص 299

26- ایضاً ص 234

27- ایضاً ص 241

28- اخبار دوربین 16 جولائی 1869ء

29- ہمارے ہندوستانی مسلمان ص 240

30- ہمارے ہندوستانی مسلمان ص 244

31- ایضاً

32- مدر انڈیا ص 289

33- آئین اکبری، تزک جہانگیری، تذکرۃ الامراء عالمگیری وغیرہ

34- ہمارے ہندوستانی مسلمان ص 195

چوتھا باب

انگریزوں کی دھوکہ بازی' عہد شکنی اور غداری

○ انگریزوں کی وعدہ خلافیاں اور عہد شکنیاں
○ اپنے بنائے ہوئے قانون 1833ء کی خلاف ورزی
○ اپنے اعلان وکٹوریہ کی خلاف ورزی
○ خود اختیاری دینے کے قانون کی خلاف ورزی
○ توسیع مملکت کے متعلق شاہی اعلان کی خلاف ورزی
○ خاندانی جائدادوں اور جاگیروں کے قانون کی خلاف ورزی
○ دیوانی کے معاہدوں کی خلاف ورزی
○ مقامات مقدسہ کے متعلق اعلانات اور غداری
○ حوالہ جات

چوتھا باب

انگریزوں کی دھوکہ بازی، عہد شکنی اور غداری

انگریزوں کا ہمیشہ سے اصول رہا ہے کہ ضرورت کے وقت گدھے کو باپ بنالو اور ضرورت پوری ہو جانے پر باپ کو گدھا بنا دو۔ نہایت نرم اور خوش آیند الفاظ بول کر دھوکہ دینا اور سیدھے سادھے لوگوں پر قبضہ کرنا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل رہا ہے۔ ایشیائی اور افریقی اقوام ان کے اس دام فریب میں گرفتار ہو کر ہمیشہ نقصان اٹھاتی رہی ہیں اس مکاری اور دغا بازی میں برطانوی قوم اتنی ماہر ہے کو یورپ کی دوسری قومیں بھی ان کو نہیں پہنچ سکیں۔ یہی حال ہندوستان کی غلامی اور بربادی کا باعث ہوا۔

خان بہادر خاں جو کہ نواب روہیل کھنڈ کے آخری وارث تھے انہوں نے اپنے اعلان جنگ 1857ء میں ای بات پر زور دیا تھا کہ انگریز ہمیشہ وعدہ خلافی اور جائدادوں کی ضبطی کرتے رہے ہیں اور ہندوستانیوں کو لڑاتے رہتے ہیں اب دونوں کو مل کر ان کے خلاف لڑنا چاہیے وہ روہیل کھنڈ پر قابض ہو کر خوب لڑے (یہ اس آزادی کی لڑائی کا اعلان تھا جو کہ 1857ء میں عمل میں لائی گئی اور جس کو انگریزوں نے غدر کے نام سے مشہور کیا)

انگریزوں کی وعدہ خلافیاں اور عہد شکنیاں

نواب اودھ واجد علی شاہ کو جبکہ 4 فروری 1856ء میں صوبہ اودھ کے الحاق کا حکم سنایا گیا جس میں ان کی وفاداری تسلیم کی گئی اور صرف بد نظمی کے الزام میں انہیں معزول کیا گیا (درآنحالیکہ بد نظمی خود کمپنی کے طرز عمل کا نتیجہ تھا) تو انہوں نے سر تسلیم خم کرکے وضعداری کی تکمیل کر دی- اور فرمایا کہ میں تو خادم ہوں کوئی سرکشی نہ کروں گا- البتہ حکومت انگلستان سے چارہ جوئی کروں گا- اس کے بعد انہوں نے افسروں اور فوج کو اپنی ملازمت سے علیحدہ کرکے انہیں ہدایت کی کہ وہ حکومت برطانیہ کی اطاعت اور عزت کریں- مگر اطاعت نتیجہ ہوتا ہے- انصاف اور مراعات اور وعدوں کے ایفاء کا جن کی حکام گورنمنٹ اپنی مسلسل کامیابیوں کے زعم میں ضرورت نہ سمجھتے تھے- وہ وعدے یہ تھے کہ نواب صاحب کی معزولی کے وقت تعلقداران اودھ شاہی خاندان اور وابستگان در دولت کو یہ امید دلائی گئی تھی کہ ان کے حقوق محفوظ رکھے جائیں گے مگر ہوا یہ کہ برخلاف سرکاری اعلانات کے مال گزاری میں اضافہ شروع کیا گیا- اور بجائے تعلقداروں کے براہ راست آراضی کے قابضوں سے بندوبست کی کاروائی کی جانے لگی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے تعلقداروں کی آمدنیاں آدھی کے قریب رہ گئیں- شاہی خاندان کے لوگوں کے ساتھ جس قسم کا برتاؤ کیا گیا تھا اس کا پتہ لارڈ اسٹینلی کے مراسلہ مورخہ 13 اکتوبر 1858ء سے چلتا ہے جس میں تحریر تھا-

> ”شاہی خاندان کے لوگوں اور وظیفہ خواروں کے ساتھ بے تمیزی کا برتاؤ کیا گیا اور وظائف روک دیئے جانے سے ان کا حال پتلا ہو گیا- سابق ملازموں اور باأثر لوگوں کو خاص طور پر ملازمتوں اور عہدوں سے محروم کیا گیا جن کے وہ متوقع تھے- (1)

مسٹر پیٹر فریمین ممبر پارلیمنٹ و صدر کامن ویلتھ آف انڈیا لیگ کہتے ہیں

> برطانیہ عہد و پیمان کے ذریعہ ہندوستان پر ہندوستان کے بھلے کے لیے حکومت کرنے کا پابند ہے- لیکن کیا ہم نے اس عہد کی پابندی کی ہے- میں نے اوپر جو واقعات و حقائق بیان کئے ہیں وہ اس سوال کا جواب دیں گے- بعض اوقات کہا جاتا ہے کہ اگر ہندوستان کو ہوم رول مل گیا

تو عوام جمہور پر مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑے گا۔ ایک سو برس کے برطانوی راج سے جو مصیبت ہندوستان پر نازل ہوئی ہے اس سے زیادہ مصیبت ناممکن ہے۔ جو قانون ساز مجلسیں ہم نے قائم کی ہیں ان میں عوام کی نمائندگی نہیں ہوتی اور ہم نے محصول کا بوجھ سب سے زیادہ غریبوں ہی کے دوش بے کسی پر رکھا ہے۔(2)

اضلاع کوڑہ والہ آباد کی فروخت پر مسٹر برک کی تقریر۔ ”

پہلا بادشاہ جسے کمپنی نے روپیہ لے کر فروخت کیا آل تیمور کا مغل اعظم تھا۔ یعنی شاہ عالم بادشاہ۔ یہ بلند شخصیت ایسی بلند جو انسانی عظمت کا مطمح نظر ہو سکتی ہے عام روایات کے مطابق اپنے عمدہ طرز عمل۔ پاک باطنی اور ماہر علوم مشرقیہ ہونے کے باعث بہت ہر دلعزیز و محترم تھی۔ اس کی یہ خوبیاں اور نیز یہ امر کہ اسی کے سندات کے طفیل میں ہم نے تمام ہندوستانی مقبوضات حاصل کیا۔ اس کو سربازار فروخت کرنے سے نہ روک سکے۔ اسی کے نام کا سکہ چلتا ہے اسی کے نام سے عدل و انصاف کیا جاتا ہے ملک کے طول و عرض میں اس کے نام کا تمام عبادت گاہوں میں خطبہ پڑھا جاتا ہے لیکن پھر بھی اسے بیچ ڈالا گیا۔ ایک سلطنت عطا کر دینے والے معطی اور بکثرت قوموں کے جائز حکمراں کے واسطے اس کے شاندار عطیات میں سے صرف دو ضلعے کوڑہ اور الہ آباد بطور شاہی ملک محفوظ کر دیے گئے تھے لیکن 26 لاکھ روپیہ سالانہ (خراج بنگال و بہار) کا زر خراج بند کر دینے کے بعد یہ اضلاع بھی اس کے وزیر شجاع الدولہ کے ہاتھ فروخت کر دیے گئے۔ اس معاملہ کا سب سے مذموم پہلو جو کچھ لوگوں کو نظر آئے گا وہ یہ ہے کہ ان دو ضلعوں کا سودا بھی بمشکل محض دو سال کے لیے کیا گیا۔ افسوس کہ اب یہ تیموری شہزادہ اپنی معمولی ضروریات زندگی پوری کرنے سے بھی عاجز ہے اور اس کی موجودہ لاچاری میں ہم بخشش کے طور پر بھی اسے کچھ نہیں دے سکتے۔ “

عہد نامہ بستگزد شجاع الدولہ آلہ آباد و کوڑہ۔ ”قرار پایا کہ چونکہ بموجب عہد نامہ الہ آباد مورخہ 16 اگست 1765ء اضلاع کوڑہ اور الہ آباد بادشاہ

> کو ان کے اخراجات کے لیے دیئے دیئے گئے تھے اور ان اضلاع پر بادشاہ نے اپنا قبضہ چھوڑ کر انگریز کمپنی اور وزیر کے مفاد کے خلاف ان کی سند مرہٹوں کو دیدی اور چونکہ یہ فعل مذکورہ عہد نامہ کی منشاء کے خلاف ہے۔ اس لیے یہ مقامات کمپنی ہی کو جس سے بادشاہ نے انھیں حاصل کیا تھا واپس ہو گئے اور اب وزیر اور کمپنی کے درمیان یہ معاہدہ ہوتا ہے کہ اضلاع مذکور کو ان شرائط کے ساتھ وزیر کے قبضہ میں دے دیا جائے گا کہ وہ سکہ رائج الوقت اودھ کے پچاس لاکھ روپیہ کمپنی کو دیں گے جس کی ادائیگی کا یہ طریقہ ہو گا کہ بیس لاکھ روپیہ فورا نقد اور دو سال بعد پندرہ پندرہ لاکھ روپیہ سالانہ دو قسطوں میں ادا ہو گا۔"(3)

ناظرین ملاحظہ فرمائیں کہ اس معاہدہ میں کس قدر جھوٹ اور فریب اور دیدہ دلیری سے کام لیا گیا ہے جس پر برک کی سابق تقریر روشنی ڈالتی ہے۔

اپنے بنائے ہوئے قانون 1833ء کی خلاف ورزی

1833ء میں تاج برطانیہ نے ایک طرف تو ایسٹ انڈیا کمپنی کو تجارت سے روک کر بیس سال کے لیے صرف ملک گیری اور حکومت کا فرمان اور پٹہ دیا اور دوسری طرف مندرجہ ذیل اعلان کیا۔

> اور قانون بنایا جاتا ہے کہ ممالک مذکور کے کسی باشندے کے لیے یا ملک معظم کی کسی رعیت کے لیے جو ممالک مذکور میں سکونت پزیر ہوں کمپنی کا کوئی عہدہ، کوئی خدمت اور کوئی ملازمت مذہب، جائے ولادت نسل یا رنگ کی بناء پر ممنوع نہ ہو گی۔"

مگر اس عہد و پیمان شاہی اور اعلان تاج برطانوی کی ہمیشہ خلاف ورزی کی گئی اور کبھی بھی اس کو شرمندہ عمل نہیں کیا گیا۔ وائسرائے ہند لارڈ لٹن کے مندرجہ ذیل الفاظ ملاحظہ ہوں

> "1833ء کا مسودہ قانون جو پارلیمنٹ نے منظور کیا ہے اتنا مبہم ہے اور دیسی باشندوں کے متعلق حکومت ہند کی ذمہ داریاں محتاج تشریح رکھنا ایسی واضح غلطی ہے کہ قانون منظور ہوتے ہی اس کے نتائج ظاہر ہونے لگے اور حکومت ہند اس کی پابندی سے گریز کرنے کی تدابیر کرنے لگی۔
>
> تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کے روز افزوں طبقے نے (جس کی ترقی میں حکومت ساعی رہتی ہے مگر اس کی خواہشات پوری نہیں کر سکتی) اس قانون کی دفعات کا مطالعہ کیا ہے اور دل پر نقش کر لیا ہے اب اس قانون کی رو سے اگر کسی ہندوستانی کو ایک بار ایسا عہدہ مل جائے جو پہلے سول سروس والوں کے لیے مخصوص تھا تو اس کو یہ توقع اور دعوی کرنے کا حق ہے کہ ترقیات کا زینہ بالتدریج طے کرنے کے بعد بڑے سے بڑے عہدہ پر اس کا تقرر ہو سکتا ہے۔ ہم سب سمجھتے ہیں کہ یہ حقوق اور توقعات نہ کبھی پوری کی جائیں گی نہ کی جا سکتی ہیں۔ گویا ہمارے سامنے اس وقت دو راہیں تھیں یعنی ممنوع کر دینا یا فریب دینا اور ہم نے وہ راہ اختیار کی جس میں راست روی سب سے کم تھی مقابلہ کے امتحان جیسے کہ انگلستان میں رائج ہیں ہندوستانیوں کے لیے

> مقرر کرنا یا شرکت امتحان کے وقت امیدواروں کی قید عمر میں تخفیف کر دینا وہ عریاں حیلے ہیں جو بالقصد اس کے لیے اختیار کئے گئے ہیں کہ اس قانون کو مفلوج اور معطل کر دیا جائے۔ چونکہ یہ تحریر خفیہ ہے اس لیے بلا تامل میں کہنے کو تیار ہوں کہ میرے نزدیک ہندی اور برطانوی دونوں حکومتیں ابھی تک اس الزام کا معقول جواب نہیں دے سکتی ہیں کہ انہوں نے ہندوستانیوں کے کان تک تو ایک وعدہ جانفزا پہنچا دیا لیکن ان کے قلوب کو ایفاء کی مسرت سے محروم رکھنے کی کوشش میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔(4)

ڈیوک آف آرگل کہتا ہے۔

"میں اعتراف کرتا ہوں کہ ہم ادائے فرض سے قاصر رہے اور ہم نے جو وعدے اور پیان گئے تھے پورے نہیں کئے۔"(5)

> اسی سلسلہ میں لارڈ سالسبری کہتا ہے۔
>
> "دوستو! میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس گندم نمائی اور جو فروشی سے فائدہ کیا ہے۔"

مذکورہ بالا اعلان 1833ء جبکہ بنایا گیا اور پاس ہو کر مشتہر ہوا تو ممبران پارلیمنٹ (ہاؤس آف کامنس) نے نہایت زور دار الفاظ میں اس کی معقولیت اور ضرورت کو تسلیم کیا تھا بلکہ لارڈ میکالے نے مندرجہ ذیل الفاظ میں اس کی زور دار تائید کی تھی۔

> "ممکن ہے کہ ہمارے نظام حکومت کے سایہ میں ہندوستان کی سیاسی ذہنیت اس قدر نشوونما پا جائے کہ خود اس نظام کے اندر نہ سما سکے۔ ممکن ہے کہ بہتر حکومت کے ذریعہ سے ہم اپنی رعایا میں بہتر حکومت کی صلاحیت پیدا کر دیں اور مغربی علوم سے آشنا ہونے کے بعد آئندہ کسی عہد میں وہ مغربی اداروں کا مطالبہ کرنے لگیں۔ وہ دن کبھی آئے گا یا نہ آئے گا مجھے معلوم نہیں۔ لیکن اس کو روکنے یا ٹالنے کی ہرگز کوشش نہ کروں گا اور جب کبھی یہ دن آئے گا تو برطانیہ کی زندگی میں وہ دن سب سے زیادہ فخر و مباہات کا دن ہو گا۔"

مگر حسب پیشین گوئی لارڈ میکالے جبکہ ہندوستانیوں نے تعلیم میں اس قدر کامیابی حاصل

کرلی کہ امتحان مقابلہ میں وہ انگریزوں کو شکست دینے لگے تو زور دار کوشش ہونے لگی کہ انگریزوں کے لیے سول سروس کے عہدے مخصوص کر دیئے جائیں۔ ذمہ داران حکومت نے ضروری سمجھا کہ اس اعلان کو عمل میں لانے سے گریز کیا جائے اور حیلوں اور بہانوں سے اس کو مفلوج کر دیا جائے۔ چنانچہ عرصہ دراز تک جس کی مقدار تقریباً بیس سال ہوتی ہے ہندوستانی عہدہ ہائے عالیہ سے اس کے بعد بھی بالکل محروم رہے۔ آخر کار احتجاجی آوازیں اٹھیں ' شکایات کے بازار گرم ہوئے ' پروٹسٹوں کی بھرمار ہوئی ' حق طلب اور حق کوش زبانوں اور قلموں نے فضا کو اپنی گونج سے مکدر کر دیا تو آسمان انگلینڈ سے کڑکتی ہوئی آواز آئی کہ ہندوستانی نالائق ہیں عہدہ ہائے عالیہ کی قابلیت نہیں رکھتے۔ مگر وہ ہندوستانی دماغ اور قلم ' اور وہ مشرقی قلب اور گروہ جس کے دماغی اور عملی بہترین کارناموں سے تاریخ قدیم بھری پڑی ہے اور جس کی تصدیق خود یورپین موخین کر چکے ہیں کب دب سکتا تھا اور کب ایسی لچر اور لوچ بات پر سکوت کر سکتا تھا چنانچہ بار بار جوابات اور سوالات کی بھرمار ہوتی رہی تو حسب عادت کمیشن بٹھایا گیا۔ تحقیقات پر معلوم ہوا کہ عدم قابلیت کا عذر بالکل غلط اور محض بہانہ ہی بہانہ اور حیلہ سازی ہے ان کا عہدوں سے محروم ہونا صرف ہندوستانیت اور کالے رنگ ہونے کی بناء پر اور نسلی امتیاز کی وجہ سے ہے۔ سر ارسکن پیری (جس نے اس تحقیقات قابلیت میں شہادت دی تھی۔) کہتا ہے کہ ”ہندوستانی مجوزین کی قوت فیصلہ کمپنی کے ان ججوں سے جو اپیل سنتے تھے بدرجہا بہتر تھی۔“

سر جان سلیور (مدراس گورنمنٹ کا ممبر) کہتا ہے۔

> ”وہ لوگ (باشندگان ہند) ٹیکسوں کے لگانے میں جن کی ادائیگی کے لیے وہ مجبور کیے جاتے ہیں کوئی اختیار نہیں رکھتے۔ قوانین کو جن کی تعمیل ان پر فرض ہوتی ہے مرتب کرنے میں ان کی کوئی آواز نہیں ہوتی اپنے ملک کے انتظام میں ان کا کوئی حقیقی حصہ نہیں ہوتا اور ان کے حقوق دیئے جانے سے اس شرمناک حیلہ سے انکار کیا جاتا ہے کہ ان میں اس قسم کے فرائض انجام دینے کے لیے ذہنی اور اخلاقی اوصاف کی کمی ہے۔“(6)

لارڈ اڈسلے 1867ء میں کہتا ہے۔

> ”اگر ہم چاہتے ہیں کہ اس فرض کو ادا کریں جو ہندوستان کی طرف سے ہم پر عائد ہے تو ہم اس طرح سبکدوش ہو سکتے ہیں کہ ملک میں جتنے اشراف و اکابر ہیں ان کی امداد اور مشورہ سے فائدہ اٹھائیں۔ یہ جواب کہ ہندوستانی دماغ میں تدبر اور قابلیت کا سرمایہ ناکافی ہے ایک بے معنی لغویت ہے۔“

بہرحال مذکورہ بالا اعلان 1833ء کے ایفاء کی مدبرین برطانیہ کی طرف سے برابر عملی مخالفت ہوتی رہی اور طرح طرح کے جھوٹے حیلوں سے اس کو ٹالا گیا۔ 1857ء میں انقلابی تحریکات کی آگ کے نشوونما پانے کے وجوہ میں سے ایک وجہ یہ بھی تھی۔

اپنے سنائے ہوئے اعلان وکٹوریہ 1858ء کی خلاف ورزی

1858ء کے اعلان وکٹوریہ میں اس امر کو اور بھی زیادہ قوت کے ساتھ سراہا گیا۔ یہ اعلان نہ صرف ملکہ وکٹوریہ (تاج برطانیہ) کی طرف سے تھا بلکہ دارالعوام (ہاؤس آف کامنس) اور دارالامراء (ہاؤس آف لارڈس) اور مذہبی طبقہ (کلیسا) کی طرف سے متفقہ تھا اس کی دفعہ 6 میں مندرجہ ذیل الفاظ تھے۔

> ”اور یہ بھی ہمارا حکم ہے کہ جہاں تک ممکن ہے ہماری سب رعیت کو گو کسی قوم اور مذہب کی ہو بلاتعرض و طرف داری کے ہماری ملازمت میں ان عہدوں پر جن کو وہ اپنی علمیت اور قابلیت اور دیانت سے انجام دے سکتے ہوں مقرر کرتے رہیں۔“

1858ء کا یہ شہنشاہی اعلان بہ نسبت 1833ء کے پارلیمنٹری اعلان کے نہایت زور دار اور تاکیدی الفاظ کے ساتھ وسیع اور واضح پیمانہ پر واقع ہوا تھا مگر کیا اس کو عملی جامہ پہنایا گیا اور اس کے ایفاء کا خیال کیا گیا۔

مسٹر ہیرلڈ کاکس کا آرٹیکل مندرجہ سنڈے ٹائمز لندن اس کو بتلائے گا۔ اس اقتباس کا ترجمہ حسب ذیل ہے۔

> ”مسٹر گاندھی کے طرز عمل میں برطانوی حکومت کی طرف سے ایک واضح انقلاب رونما ہو گیا ہے اس کی وجہ موجودہ برطانوی تدبر کی ناکامی ہے کہ وہ اس مساویانہ عدل و انصاف کی عزت نہیں کرتے جس کا ملکہ معظمہ کے عہد حکومت میں اعلان کیا گیا تھا۔ آج اس اعلان کا حوالہ دینا ضروری ہے کہ اس کی مسلسل خلاف ورزی نے ہی یہ دن دکھایا کہ سلطنت کو نازک ترین مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔“ اعلان کے الفاظ یہ تھے۔
>
> ”باعتبار رنگ، نسل، مذہب یا زبان قانون کسی میں فرق و امتیاز نہیں کرے گا۔ بلکہ اس کے تحفظ کا پورا پورا خیال رکھا جائے گا کہ ہر ایک سے غیر جانبدارانہ سلوک ہو۔“(7)

لالہ لاجپت رائے آنجہانی 1916ء میں تحریر کرتے ہیں کہ

> "اس قسم کے اعلان کو پچانوے سال گزر چکے ہیں مگر آج تک بھی اس پر عمل درآمد نہیں ہوتا (نوسو) روپیہ سے (ہزار) روپیہ تک کے عہدوں پر کل چار فیصد ہندوستانی مقرر ہیں باقی ماندہ چھیانوے فیصد عہدوں پر انگریز اور اینگلو انڈین فائز ہیں۔ حالانکہ وہی ہندوستانی جو انگریزی عمل داری میں نالائق قرار دیئے گئے ہیں، ہندوستانی ریاستوں میں وزارت اور مدار المہامی کے کام خوش اسلوبی سے انجام دے رہے ہیں۔(8)

ایک ہزار یا اس سے زائد تنخواہ والے عہدوں پر تو ہندوستانیوں کا پہنچنا تقریباً محال ہی رہا۔ ہر قسم کے احتجاجات ہوتے رہے۔ مگر فوجی اعلی عہدے اور سول سروس وغیرہ کے بڑے بڑے عہدے انگریزوں کے لئے مخصوص رکھے گئے۔ یہ صرف عملی کوتاہی نہیں تھی بلکہ ہمیشہ ذمہ داران برطانیہ نہایت دیدہ دلیری کے ساتھ ایسے ایسے قومی اعلانات شاہی اور پارلیمنٹری پاس شدہ تجاویز کو پائے استحقار سے ٹھکراتے ہی رہے۔

خود اختیاری دینے کے قانون کی خلاف ورزی

اسی بناء پر پھر اہل ہندوستان کو مطمئن کرنے کے لئے 18 اگست سن 1917ء کو ملک معظم کا مشہور اعلان حکومت خود اختیاری کی بابت شائع کیا گیا۔ جس میں ہندوستانیوں کو ذمہ دار حکومت دینے کا وعدہ تھا۔ اور اس سے اگلے دن اعلان کیا گیا جس میں ہندوستانیوں کو فوجی کمیشن کے اعلیٰ عہدے دیئے جایا کریں گے۔ مگر یہ اعلانات بھی بادِ ہوا ثابت ہوئے اور چار مہینہ ہی کے بعد رولٹ کمیٹی مقرر کی گئی جو کہ صلح اور آشتی کے بالکل منافی تھی جس کے نتیجہ میں بیتہ گرہ، قتل غارت گری ظہور پذیر ہوئے۔ بے گناہوں پر ہوائی جہازوں سے بم گرائے گئے۔ مگر جبکہ ترک موالات (نان کو آپریشن) کے موثر حربہ نے گورنمنٹ کے دانت کھٹے کر دیئے تو ڈیوک آف کیناٹ کو بھیج کر ہندوستانیوں کو دلاسا دیا گیا۔ ڈیوک موصوف نے اپنی تقریر میں جو کہ 9 فروری سن 1921ء کو جدید اسمبلی کے افتتاح کے وقت ملک معظم کی طرف سے کی گئی تھی فرمایا۔

> ”سالہا سال سے بلکہ چند نسلوں سے ہمدردان ملک اور وفادار ہندوستانی اپنی بھارت ماتا کے لئے سوراج کا خواب دیکھ رہے تھے۔ آج میری سلطنت میں آپ کے لئے سوراج کی ابتداء ہو رہی ہے اور آپ کو ترقی کے وسیع ترین اور اعلیٰ درجہ کے مواقع مل رہے ہیں جن سے میری نو آبادیات کے مانند آزادی حاصل ہو۔“

نیز دوسری تقریروں میں ڈیوک موصوف اور وائسرائے نے صاف الفاظ میں فرمایا کہ۔

”اب مطلق العنان حکومت کا اصول قطعی طور پر ترک کر دیا گیا۔ پس اس وقت ہندوستان معتدبہ درجہ میں اپنا بوجھ خود اٹھائے گا۔“(9)

مگر افسوس کہ ان جملہ اعلانات بعیدہ اور قریبہ موکدہ اور غیر موکدہ کو جس طرح پہلے سے توڑنے کا سلسلہ جاری تھا۔ اب جاری رہا۔ اگر کبھی مشکلات پیش آئیں تو زور دار الفاظ میں مواعید اور عہود کو دہرایا گیا اور جب اطمینان کی سانس آنے لگی تو سب کو توڑ تاڑ کے رکھ دیا گیا۔ چنانچہ مسٹر لائیڈ جارج وزیر اعظم برطانیہ ہاؤس آف کامنس (دارالعوام میں 12 اگست کو تقریر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

”اگر پہلے سے یہ بات صاف نہیں ہے تو میں صاف طور پر کہنا چاہتا ہوں

> کہ ہماری غرض اصلاحات دینے سے یہ نہیں ہے کہ انجام کار ہم اپنی امانت سے بالکل دست بردار ہو جائیں جو بات خاص طور پر میں کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ ہندوستانی بحیثیت جماعت مقننہ کے یا بہ حیثیت مدبران ملک کے خواہ کیسے ہی کامیاب کیوں نہ ہوں مگر میرے نزدیک کوئی زمانہ ایسا نہ ہو گا کہ ان کا کام انگریزی عہدہ داروں کی ایک تھوڑی سی تعداد کے بغیر چل سکے گا جو ساڑھے اکتیس کروڑ کی آبادی میں کل بارہ سو ہیں۔"

نیز وزیر اعظم موصوف نے اسی تقریر میں یہ بھی فرمایا۔

> "انگریز افسران ملازمت کی تمام عمارت کے لیے بمنزلہ فولادی قالب کے ہیں اگر اس قالب کو ہٹا لیا جائے تو تمام عمارت منہدم ہو جائے گی۔"

مسٹر لائیڈ جارج وزیر اعظم برطانیہ اور ممبران پارلیمنٹ کی بدعہدی اور دیدہ دلیری کو ملاحظہ فرمایئے کہ مندرجہ بالا تقریر کس قدر غداریوں اور عہد شکنیوں سے بھری ہوئی علانیہ عمل میں لائی گئی ہے جس نے گزشتہ تمام شاہی اور پارلیمنٹری اعلانات جو کہ دربارہ حقوق اہل ہند متعلقہ ملازمتوں اور آزادی ہند وغیرہ تھے سب کو یک قلم پاش پاش کر دیا۔ اور پھر کوئی مخالف آواز ہاؤس سے نہیں نکلی۔

صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب مرحوم اس زمانہ میں وزیر ہند کی کونسل کے ممبر لندن میں موجود تھے اس عہد شکن تقریر سے نہایت زیادہ متاثر ہوئے اور 3 اگست 1923ء کو اور پھر 6 اگست کو دو زبردست چٹھیاں وزیر ہند کو بطور احتجاج لکھیں اور درخواست کی کہ وزیر اعظم کے پاس بھیج دی جائیں۔ ان میں نہایت تفصیل کے ساتھ دکھلایا کہ وزیر اعظم کی یہ تقریر شاہی اعلان 1917ء اور گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1919ء اور شاہی اعلان 1921ء کے کس قدر منافی تھی۔ حکومت کو کون سی ضرورت پیش آئی کہ 1921ء کے اعلان کے صرف ڈیڑھ سال بعد اس تقریر کے ذریعہ انہیں کالعدم کر دیا گیا۔ صاحبزادہ صاحب نے اپنی چٹھی میں یہ بھی دکھایا تھا کہ "قانون گورنمنٹ ہند 1919ء کے الفاظ یہ تھے۔"

> "پارلیمنٹ کی پالیسی جس کا اعلان کیا جا چکا ہے یہ ہے کہ ہندوستان کے ہر شعبہ میں ہندوستانیوں کی تعداد مسلسل بڑھائی جائے تاکہ اس سے

> برٹش انڈیا میں بحیثیت سلطنت برطانیہ کے ایک اہم جز کے ذمہ دار حکومت کا مسلسل احساس پیدا ہو۔"
>
> جب مندرجہ بالا الفاظ میں کوئی قید کسی قسم کی نہ تھی تو اب بارہ سو انگریز عہدہ داروں کی کیوں قید لگائی جاتی ہے اور جبکہ وہ ہمیشہ مسلط رہیں گے تو ہندوستانیوں میں خود اپنا انتظام کرنے کی قابلیت کیسے پیدا ہو گئی۔"(10)

صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب مرحوم نے بہت کچھ زور لگایا مگر لاٹھی کی طاقت کے سامنے حجت او دلیل کہاں چل سکتی ہے۔ اور برطانیہ کے سرکاری افراد کے ذاتی منافع کے سامنے ہندوستانیوں کے مفاد اور حقیقی فرائض سلطنت اور وعدوں کے ایفاء کی کیا پرواہ کی جا سکتی ہے۔ یہاں تو خود غرضیوں اور اپنے حلوے مانڈے کی فکر ہے۔ اور بے ایمانی اور عہد شکنی وتیرہ ہے۔ جس کے ذریعہ سے ہمیشہ انسانی شرافت کا خون بہایا گیا ہے۔

توسیع مملکت کے متعلق شاہی اعلان کی خلاف ورزی

یوں لوٹ کھسوٹ اور زرکشی کی انتہائی اور روز افزوں حرص انگریزوں میں اسی وقت سے تھی جب سے کہ وہ ہندوستان میں وارد ہوئے تھے بلکہ یہی چیز ان کے انگلستان چھوڑ کر سفر کرنے کی باعث ہوتی تھی۔ مگر جنگ پلاسی 1757ء سے اس میں چار چاند لگ گئے تھے انہوں نے ایک طرف تو تجارت کے بڑھتے ہوئے وسائل سے بہت زیادہ فائدہ اٹھایا اور دوسری طرف ملک گیری اور اقتدار و غلبہ سے غارت گری اور لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم کیا۔ روسا اور عام پبلک کو اس دور میں جن جن مصائب کا سامنا کرنا پڑا ان کو بجز علام الغیوب کوئی نہیں جانتا۔ ان دونوں حیثیتوں کے جمع ہو جانے سے کمپنی کو بے شمار فوائد اور ہندوستانیوں کو بے شمار اسباب ہلاکت و بربادی کا سامنا کرنا پڑا بالاخر ہندوستان اور یورپ میں آوازیں اٹھیں اور بالخصوص ان انگریز تاجروں کی طرف سے جو کہ ایسٹ انڈیا کمپنی میں حصہ دار نہیں تھے اور ان کو کمپنی کے اقتدار کی بناء پر من مانی کاروائی کا موقعہ نہیں ملتا تھا بالاخر 1833ء میں تاج برطانیہ کی طرف سے کمپنی کو حقوق تجارت سے روک دیا گیا۔ اور صرف ملک گیری اور حکمرانی کا چارٹر دیا گیا کہ جس کی وجہ سے تجارتی ذرائع سے جو سونے اور چاندی کے دریا کمپنی کے گھروں میں بہتے تھے ان کے دہانے خشک ہو گئے۔ منہ کو انسانی خون لگ جانے کے بعد درندے کی حرص و آز انتہائی زور پر ہو جاتی ہے اس لیے یہ سپید بھیڑیے کہاں صبر کر سکتے تھے انہوں نے طرح طرح کے نئے نئے اطوار و ذرائع توسیع مملکت اور تحصیل دولت اور زرکشی کے قائم کئے۔ معاہدوں کو توڑنا حلیف اور تابعدار ریاستوں پر نئے نئے بہانوں پر تشددات سے قبضہ کرنا‘ جابرانہ قوانین خود بنا کر ملک میں نافذ کرنا‘ کسی شرمناک اور انسانیت سوز حرکت کو برا نہ سمجھنا وغیرہ وغیرہ روز مرہ کا مشغلہ تھا۔ سندھ بغیر کسی وجہ کے قلمرو انگریزی میں ملا لیا گیا۔

افغانستان میں فوجیں رکھنے کی ناکام کوشش کی گئی۔ برہما کا بچا کھچا حصہ پنجاب‘ اودھ اور دوسری چھوٹی ریاستیں براہ راست کمپنی کی حکومت میں لے لی گئی۔ متبنی کے قانون کو غیر قابل اعتبار قرار دے کر ان جملہ ریاستوں کو اپنے قبضہ میں لے لیا گیا۔ جن پر والی سابق کا متبنی حسب دستور ہندوستان قابض تھا۔ ایسے امور کی بناء پر عام ناراضگی پھیل گئی تھی جو کہ 1857ء کی انقلابی تحریک کی باعث یا ممد و معاون بنی۔ اسی بناء پر کوئن

وکٹوریہ کے اعلان میں دفعہ 3 مندرجہ ذیل الفاظ میں رکھی گئی۔

> ”جو ملک ہمارے قبضہ میں ہے اسے زیادہ کرنا نہیں چاہتے اور جب ہم کو یہ گوارا نہیں ہے کہ کوئی شخص ہماری مملکت یا حقوق میں دست اندازی کرے تو ہم بھی پیش قدمی کی اپنی طرف سے بہ نسبت ملکیت یا حقوق اوروں کے اجازت نہ دیں گے اور والیان ہند کے حقوق و منزلت اور عزت مثل اپنے حقوق و منزلت اور عزت کے عزیز سمجھیں گے۔“

مگر اس شہنشاہی اعلان کو بھی ذمہ داران برطانیہ نے توڑ تاڑ کر رکھ دیا اور خلاف ورزی کرنے میں انتہائی جسارت کو عمل میں لاتے رہے۔ 1857ء کے بعد جب تک اپنی کمزوری کا کچھ احساس یا مخالف طاقتوں کا خوف رہا جب تک تو اس پر قائم رہے۔ مگر جوں ہی یہ یقین ہو گیا کہ اب ہم کو کسی مخالف طاقت کا خوف نہیں ہے اور نہ ہم میں کوئی کمزوری باقی ہے تو توسیع ملک اور قبضہ ممالک کا سودا سوار ہو گیا۔ خود انگلستان میں توسیع مملکت کی تحریک شروع ہوئی اور وائسرائے ہند کو حکم دیا گیا کہ وہ مغربی شمالی سرحد پر پیش قدمی کرے۔ اس وقت وائسرائے ہند لارڈ نارتھ بروک تھے انہوں نے اعلان وکٹوریہ کی پابندی اور اس پالیسی کے خطرات سے بچنے پر زور دیا ایک عرصہ تک تحریرات وغیرہ کا سلسلہ جاری رہا مگر سر بارتھ فیر جو کہ اس عہد شکنی اور فارورڈ پالیسی کا سرگرم ممبر تھا اور عرصہ سے اس جدوجہد میں کامیاب ہو کر انگلستان کے باثر اشخاص کو اپنا ہم خیال بنا چکا تھا' ایوان حکومت میں بھی کامیاب ہو گیا۔ چنانچہ لارڈ نارتھ بروک کو 1876ء میں استعفا دے کر قبل از وقت ہندوستان چھوڑنا پڑا اور لارڈ لٹن کو اس کی جگہ وائسرائے بنایا گیا اس نے ہندوستان پہنچ کر کابل کو مشن بھیجا اور پھر افغانستان اور سرحدی مقامات پر حملوں اور دراز دستیوں کے دروازے کھل گئے۔ افغانستان پر بار بار چار مرتبہ حملے ہوئے جن میں لاکھوں جانوں اور کروڑوں روپیوں کا نقصان ہوا۔ اس وقت سے لے کر آج تک کم و بیش چالیس لڑائیاں ہو چکی ہیں جن میں سے صوات' سانہ' بنیر' چترال مجبوری کابل وغیرہ کی لڑائیاں مشہور ہیں۔ آفریدیوں' مسعودیوں' وزیریوں' مہدیوں وغیرہ قبائل کو تاخت و تاراج کیا گیا۔ ان کی زمینیں چھینی گئیں۔ ان لڑائیوں پر ہندوستان کے خزانہ سے روپیہ اور جانیں پانی کی طرح بہائی گئیں۔ مسٹر آصف علی کی تحقیقات کے مطابق سات ارب سے زیادہ اس عہد شکن پالیسی کی بناء پر خرچ ہوا ہے جس میں سے صرف پچاس لاکھ پونڈ انگلستان سے

وصول ہوا حالانکہ صرف کابل کی لڑائیوں پر دو کروڑ پونڈ سے زیادہ خرچ ہوئے تھے۔ قومی جماعتیں (بالخصوص کانگریس) اس پالیسی کے خلاف ہمیشہ آواز بلند کرتی رہی ہیں چنانچہ کانگریس نے 1896ء میں مندرجہ ذیل ریزولیوشن پاس کیا۔

> "سرحد کی پیش قدمی کی پالیسی سلطنت برطانیہ کے لیے اور بالخصوص ہندوستان کے مفاد کے لیے مضرت رساں ہے۔ کیونکہ اس کی وجہ سے ہندوستان کی حدود کے باہر فوجی مہمات بھیجنی پڑتی ہیں جس سے قیمتی جانیں تلف ہوتی ہیں اور رعایا کا روپیہ ضائع ہوتا ہے اس لئے کانگریس مستدعی ہے کہ اس جارحانہ کاروائی کو بند کیا جائے اور یہ امر قرار دیا جائے۔ کہ درانحالیکہ یہ مہمات شاہی اغراض کے لیے ضروری سمجھی جائیں تو ان کے صرف کا بڑا حصہ سلطنت برطانیہ کے خزانے سے ادا کیا جائے۔"

مگر قوت کے غرور نے وعدہ شکنیوں کی مستیوں میں اضافہ ہی کیا۔ اور ہوس ملک گیری روز افزوں ہوتی رہی۔

یہی لارڈ لٹن جو کہ لارڈ نارتھ بروک کی جگہ توسیع ملک کے اعلان شاہی کو توڑنے اور فارورڈ (پیش قدمی کی) پالیسی قائم کرنے کے لیے ہندوستان بھیجے گئے تھے۔ 30 مئی 1878ء کو اپنی وائسرائی کے زمانہ میں وزیر ہند کو مندرجہ ذیل الفاظ لکھتے ہیں۔

> "مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں ہے کہ انگلستان اور ہندوستان دونوں ملکوں کی حکومتوں کے پاس اس وقت تک اس الزام کا کوئی جواب نہیں ہے کہ انہوں نے جو وعدے کئے ان کی خلاف ورزی کرنے کے کسی ذریعہ کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔" (13)

"مارک سولہویں" جنگ اور بے چینیوں کے اسباب کی تشخیص کرتے ہوئے کہتا ہے۔

> "اس کی تمام ذمہ داری انہیں وعدہ خلافیوں پر عائد ہوتی ہے۔ مسٹر چرچل کو اس پر غور کرنا چاہیے۔" (14)

خاندانی جائیدادوں اور جاگیروں کے قانون کی خلاف ورزی

1858ء کے اعلان شاہی کی دفعہ 7 میں ہے" اس کا ہم کو بخوبی علم ہے کہ اہل ہند اس آراضی کو جوان کے بزرگوں سے انہیں ورثہ پہنچی ہے بہت عزیز رکھتے ہیں۔ اس لیے ہم کو اس کا بڑا لحاظ ہے بلکہ چاہتے ہیں کہ یہ حقوق ان کے جو آراضی سے متعلق ہیں بشرط ادا کرنے مطالبہ سرکاری کے محفوظ رہیں اور ہمارا حکم ہے کہ بوقت تجویز و نفاذ قانون کے عموماً حقوق قدیم اور ملک کے رسم و رواج پر لحاظ کامل ہوتا رہے۔" نیز دفعہ 9 میں ہے۔ اور ملک کا انتظام ایسا کیا جائے کہ جس سے ہماری ساری رعایا باشندہ ملک کو فائدہ ہو کیونکہ ان کی فارغ البالی ہمارے لیے موجب اقتدار اور ان کی فراغت ہمارے لیے باعث بے خطری اور ان کی شکر گزاری ہمارے لیے پورا صلہ ہے۔"

مگر کیا ذمہ داران برطانیہ نے اس شاہی اعلان کو عملی جامہ پہنایا اور اس عہد کو ایفاء کے درجہ پر پہنچایا سر ولیم ویڈرن برن (جو کہ ہندوستان میں بڑے ممتاز عہدوں پر فائز رہ چکے تھے اور بعد میں پارلیمنٹ کے ممبر ہو گئے تھے۔) کے وہ الفاظ جو انہوں نے 1897ء میں دارالعوام (ہاؤس آف کامنس) میں تقریر کرتے ہوئے کہے تھے اس کا جواب دیں گے۔"

> ہندوستانی رعایا کی تباہ حالی اور مفلسی کی تین خاص وجوہ یہ ہیں۔
> (اول) مالگزاری کی زیادتی۔ اگرچہ گورنمنٹ برطانیہ کے احکام یہ تھے کہ مالگزاری ایسی نہ ہونی چاہیے کہ اس میں زمین کا کل منافع آجائے بلکہ اس طرح پر مقرر کی جانی چاہیے کہ کاشتکار کو اس کی محنت کا معاوضہ اور جو سرمایہ اس نے کاشت میں لگا رکھا ہے اس کا سود اور منافع خالص کا نصف حصہ اس کے پاس بچ سکے۔ لیکن یہ بات خود ہندوستان کے حکام تسلیم کر چکے ہیں کہ ان ہدایات پر ہندوستان میں کبھی عمل درآمد نہیں ہوا۔ یہاں مال گزاری اس قدر زیادہ ہوتی ہے کہ وہ سرمایہ کے سود اور کاشتکار کی مزدوری کے حصہ کو بھی ہضم کر لیتی ہے اور باوجود یہ امر تسلیم کر لینے کے مالگزاری ہمیشہ اس طرح بڑھائی جاتی ہے کہ بعض

> مواضعات میں تو سو فیصد اور بعض خصوصی آراضیات پر ہزار فیصد تک پہنچ جاتی ہے۔
>
> (دوم) دوسرا خاص سبب رعایا کی تباہی کا یہ ہے کہ وصول لگان و مالگزاری کا طریقہ نہایت سخت ہے جس کی رو سے ایک مقررہ سالانہ رقم وقت معینہ پر وصول کی جاتی ہے اور خراب فصلوں میں جو نقصان ہوتا ہے اس کا بوجھ کاشتکار پر ڈالا جاتا ہے یہ بوجھ ایسا ہے کہ کاشتکار اس کو برداشت نہیں کر سکتا اور اس کو سودی قرضہ لینا پڑتا ہے۔
>
> (سوم) اور تیسرا سبب یہ ہے کہ یورپ کے نمونہ پر قرضہ وصول کرنے کے لیے عدالتیں قائم کر دی گئیں ہیں۔ جن کی وجہ سے قرض خواہ کی پشت پناہی پر تمام سلطنت کی قوت ہوتی ہے اور اس کو اس قابل بنا دیتی ہے کہ وہ رعایا کو غلامی کے ادنیٰ درجہ تک پہنچا دے۔"(15)

مذکورہ بالا شہادت معمولی شہادت نہیں ہے جس سے جملہ حکام برطانیہ کی بدعہدی اور عہد شکنی آفتاب کی طرح روشن ہے اور جس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ عہد شکنی ایک دو دن یا ایک دو مہینہ یا سال دو سال عمل میں نہیں لائی گئی بلکہ ہمیشہ اس پر عمل درآمد ہوتا رہا جس کی وجہ سے عام طبقہ بالخصوص کاشتکار انتہائی بربادی کو پہنچ گئے۔ پھر اس پر مزید طرفہ ماجرا یہ ہوا کہ مال گزاری کا اس قدر بھاری اور ثقیل بوجھ اگر ایک ہی مرتبہ بطور دوامی بندوبست کے جیسا کہ لارڈ کارنوالس نے کیا تھا تو ممکن تھا کہ اگر گرانی اجناس کے وقت کاشتکار کو اپنی اور اپنے بچوں کی سسکتی ہوئی جان بچا لینے کا موقعہ ہاتھ آ جاتا جیسا کہ لارڈ کارنوالس کے بندوبست دوامی کئے ہوئے علاقوں میں رعایا کو بعد میں حاصل ہوا۔ (جس میں سابقہ مال گزاری پر نوے فیصد یا اس سے زیادہ اضافہ کیا گیا تھا اور کاشتکار کے پاس صرف دس فیصد چھوڑا گیا تھا۔ مسٹر آر۔ سی۔ دت لکھتا ہے۔ کہ 1793ء سے 1822ء تک صوبہ بنگال میں زمینداروں سے 90 فیصد وصول کیا گیا) مگر کارپردازان برطانیہ کی حرص و طمع اور ہندوستانیوں کے لوٹ کھسوٹ کے عزائم نے اس کا موقع نہیں دیا۔ 1858ء کے اعلان کے بعد کچھ عرصہ تک جنگ اور انقلاب 1857ء کی بھیانک صورت ان کے دماغوں اور آنکھوں کے سامنے پھرتی رہی اور مثل فارورڈ پالیسی کے زیادتی لگان و مالگزاری سے بھی گریزاں رہے مگر جبکہ اپنی قوت کا نشہ اور ہندوستانیوں کے ضعف کا یقین پورا ہو گیا تو

سب کو بالائے طاق رکھ دیا گیا اور وکٹوریہ کے اعلان کو ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا گیا۔ تفصیل اس کی مجملاً حسب ذیل ہے۔

1861ء میں کرنل بیرڈ نے قانون آراضی کی بخوبی جانچ کی اور اس کی اصلاح پر زور دیتے ہوئے سفارش کی کہ اگر باقی ماندہ علاقہ میں بھی (جو کہ لارڈ کارنوالس کے بندوبست سے بچ گئے تھے اور وہاں میعادی بندوبست جاری تھا جن میں ہر دس پندرہ برس کے بعد اضافہ ہوتا رہتا تھا) دوامی بندوبست جاری کر دیا جائے تو قحط کا زور بے حد کم ہو سکتا ہے۔ اس کو قبول کرتے ہوئے سیکرٹری آف اسٹیٹ ہند نے 9 جولائی 1862ء میں اس سفارش کی تائید کی۔ چنانچہ سلطنت برطانیہ کی گورنمنٹ نے اس کو منظور کر لیا۔ اور 23 مارچ 1867ء کو وزیر ہند سر اسٹیفورڈ نورتھ کورٹ نے گورنمنٹ کے اس فیصلہ کی کہ بندوبست استمراری جاری کر دیا جائے۔ دوبارہ تصدیق کی۔ وہ لکھتا ہے۔

> "ہز میجسٹی کی گورنمنٹ تیار ہے کہ مال گزاری میں اضافہ ہونے کی امید کو قربان کر دے اس لیے کہ مالکان آراضی کی اغراض کو حکومت برطانیہ کی بقاء سے وابستہ کر دینا زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔" (16)

مگر وہ انگریزی دل ودماغ جس کی گھٹی میں عہد شکنی اور بد عہدی پڑی ہوئی ہے اور جس کے ہر ہر جوڑ و بند میں طمع اور لالچ اور زر کشی کا طوفان ہمیشہ جوش کھاتا رہا ہے وہ کہاں ایسے اعلان اور قانون پر قائم رہ سکتا تھا جس میں اس کی حرص و آز کو نقصان اور ہندوستانیوں کو کسی قسم کے فائدہ کی صورت ہو چنانچہ یہی دوامی بندوبست کی مذکورہ بالا تجویز جس کو 1863ء میں ملکہ معظمہ نے منظور کر لیا تھا اور 1867ء میں وہ مستحکم بھی ہو گئی تھی جس سے رعایا کے دلوں میں خوشی اور امید کے جذبات پیدا ہو چکے تھے اور صوبہ آگرہ (یو - پی) کے بعض مشرقی اضلاع میں اس کا نفاذ بھی ہو چکا تھا۔ 28 مارچ 1883ء کو اکیس سال بعد سیکریٹری آف اسٹیٹ کے مندرجہ ذیل الفاظ نے اس کو ختم کر دیا۔

> "جس پالیسی کی داغ بیل 1882ء میں رکھی گئی تھی اب وقت آ گیا ہے کہ اس کو باضابطہ ترک کر دیا جائے۔" (17)

اصل واقعہ یہ ہے کہ گورنمنٹ کو رعایا کی مسلسل وفاداری اور ان کے ضعف کی بناء پر کامل اطمینان ہو گیا تھا اس لیے خلاف اعلان شاہی میعادی بندوبست کو ہی جاری رکھا گیا جس میں ہندوستانیوں کا خون زیادہ سے زیادہ چوسا جا سکتا تھا۔ اس زیادتی لگان و مال گزاری کی وجہ سے ہزاروں زمینداروں اور تعلقدار برباد ہو گئے اور ان کی جائدادیں نیلام کر دی

گئیں۔

مسٹر رابرٹ فائٹ کہتا ہے۔

> تعلقداران سے ہمارے مطالبہ جات اس رقم سے جو وہ پہلے ادا کرتے تھے تین گنے بلکہ اس سے بھی زائد ہیں اور اس زیادتی کے معاوضہ میں کوئی فائدہ نہیں ہے جو ان کو حاصل ہوا ہو۔ ساہوکاروں نے جن سے تعلقداروں کو تباہ کن شرح سود پر قرضے لینے پڑے ہیں اپنے مطالبہ میں ان کی املاک اور دیہات کو قرق کرا لیا ہے۔"

دوامی بندوبست 1793ء سے جاری ہوا تمام مزروعہ زمین فیصد 45 دوامی بندوبست کے ماتحت ہے جس میں مال گزاری کا اضافہ نہیں ہوتا مگر باقی ماندہ زمین میعادی ہے جس میں ہر بندوبست میں (جو کہ ہر سال سے تیس سال کے اندر ہوتا رہتا ہے) اضافہ کیا جاتا ہے۔ مزروعہ زمین کا 55 فیصد میعادی رکھا گیا ہے اور اسی کے متعلق مذکورہ بالا 1862ء کی تجویز تھی اور اسی کے متعلق کوئن وکٹوریہ کے اعلان میں اطمینان دلایا گیا تھا اسی میں اضافہ اور زیادتی کے لیے انگریزی قلوب ہمیشہ بے چین رہے جس کی بناء پر کاشتکار آبادی انتہائی بربادی میں مبتلا ہو گئی۔

حالانکہ انگریزی حکومت اور کمپنی کے اقتدار سے پہلے زمینوں کی مال گزاری بہت کم تھی بطور چوتھ یعنی 25 فیصد وصول کیا جاتا تھا اور حالانکہ 1765ء میں بادشاہان دہلی سے دیوانی کا فرمان (ریونیو افیسری) حاصل کرنے کے بعد کمپنی نے ستر اور اسی فیصد کا اضافہ کر دیا تھا اور یہ اضافہ بھی روز افزوں ہی ہوتا رہا یعنی 1764ء میں جو کہ نواب بنگال کا آخری زمانہ ہے تمام صوبہ بنگال کی مالگزاری اکیاسی لاکھ پچھتر ہزار پانچ سو بیس روپیہ تھی مگر 1765ء میں قبضہ پاتے ہی شروع ہوا اور اس میں اس قدر مظالم اور تشددات کئے گئے کہ ان کو ذکر کرتے ہوئے بھی رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ ان کی کچھ تفصیل ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر نے رسالہ "ہمارے ہندوستانی مسلمان" میں اور دوسرے مورخین نے ذکر کی ہے۔ اسی طرح اضافہ تمام صوبہ جات میں ہوتا رہا۔ خلاصہ یہ کہ 1856ء میں تمام مقبوضہ علاقہ ہائے برطانیہ سے 17,30,00,000 کروڑ روپیہ وصول کیا گیا۔ 1857ء کے جنگ انقلاب کے اسباب میں یہ گرانبار اضافہ لگان اور مالگزاری بھی دکھلایا گیا تھا جس کی بناء پر کوئن وکٹوریہ کے اعلان میں دفعات داخل کی گئیں تھیں جن سے زمینداروں اور کاشتکاروں کو مطمئن کرنا مقصود

تھا۔ چاہیے تو یہ تھا کہ جو اضافہ مال گزاری و لگان کمپنی کے قبضہ میں آنے پر ہوا تھا وہ دور کر دیا جاتا اور اسی درجہ پر زمین کی آمدنی کر دی جاتی جس پر شاہی نظام کے زمانہ میں تھی یا اگر یہ نہ کیا جاتا تو کم از کم اس اضافہ میں سے کچھ گھٹا دیا جاتا جو کہ اس مدت میں کمپنی نے روز افزوں زیادتی کے ساتھ کیا تھا جس کی بناء صوبہ بنگال کا خراج (8175520 لاکھ روپیہ) سے بڑھ کر تیس برس کے عرصہ میں 2,68,00,000 کروڑ) کو پہنچ گیا تھا اور صوبہ بمبئی کا اخراج (80,00,000 لاکھ روپیہ) جو کہ 1817ء کا خراج ہے جبکہ وہ دیسی اور شاہی نظام پر وصول کیا جاتا تھا مگر کمپنی نے قبضہ پاتے ہی اس میں اضافہ شروع کیا۔ یہاں تک کہ چھ برس کے بعد 1823ء میں (1,50,00,000 کروڑ) ایک کروڑ پچاس لاکھ ہو گیا اور پھر اضافہ ہوتے ہوتے 1875ء میں چار کروڑ اسی لاکھ (4,80,00,000) ہو گیا اور یہی حال تمام صوبہ جات میں زیادتی مالگزاری اور لگان کا جاری رہا جس سے رعایا سخت پریشان ہو گئی۔ شہنشاہی اعلان وکٹوریہ میں اشک شوئی اور تھپکنے کے لیے یہ الفاظ مذکورہ بالا تو ذکر کر دیئے گئے مگر کوئی عملی کاروائی تخفیف خراج کی نہیں کی گئی ہاں 1862ء کی تجویز کا اعلان کیا گیا اور رعایا کو اس کے ذریعہ سے دوامی بندوبست کا لالچ دے کر مزید اضافہ لگان کی طرف سے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ یہ محض باتوں کی تھپک اور بناوٹی دھوکہ دہی کچھ عرصہ تک جاری رہی۔ پھر 1883ء میں اس کو منسوخ کر دیا گیا۔ اور اضافہ کی چھری تمام میعادی زمینوں پر چلتی رہی۔ جس کا نقشہ ہم زیر عنوان ٹیکسوں کی بھرمار پیش کر چکے ہیں۔

یہ تمام اضافہ میعادی زمین پر ہوتا رہا اور کوئن وکٹوریہ کے اعلان کے بعد ہوتا رہا۔ اور اس زمانہ میں ہوتا رہا جبکہ ہندوستان میں قحط انتہائی شباب پر پہنچا ہوا تھا۔ رعایا بھوک کی بناء پر مکھیوں کی موت مر رہی تھی اس تمام مال گزاری کا تقریباً 84 فیصد میعادی بندوبست کے حلقوں سے وصول ہوتا رہا اور تقریباً 16 فیصد دوامی بندوبست کے حلقوں سے وصول ہوا۔

اسی زمانہ کے متعلق سر چارلس ایلیٹ چیف کمشنر آسام 1888ء میں لکھتا ہے ”میں بلا تامل کہہ سکتا ہوں کہ کاشتکاروں کے نصف تعداد ایسی ہے جو سال بھر تک یہ نہیں جانتی کہ ایک وقت پیٹ بھر کر کھانا کسے کہتے ہیں۔“

اگرچہ انگریزی اقتدار کے بڑھنے کے ساتھ ہندوستان کا قحط بھی بڑھتا رہا تھا حسب تصریحات سر ولیم ڈگبی انگریزی اقتدار سے پہلے چھ سو برس میں یعنی 1000ء سے 1700ء

کے ابتداء تک کل 18 قحط واقع ہوئے تھے اور وہ بھی تمام ملک میں نہیں ہوئے تھے بلکہ کسی ایک صوبہ میں واقع ہوئے اور دوسرے صوبے محفوظ رہے پھر جہاں یہ قحطً واقع ہوئے وہاں موتیں زیادہ نہیں ہوئیں- اس لیے کہ لوگوں کے پاس روپے زیادہ تھے غلہ کتنا بھی گراں ہو جاتا خریدنے کی طاقت موجود رہتی تھی- موت تک کی نوبت نہیں آتی تھی- دیسی بادشاہوں اور نوابوں اور راجاؤں کو رعایا سے خصوصی ہمدردی ہوتی تھی اس لیے وہ اپنی طاقت کے موافق قحط کے ازالہ کا انتظام کرتے تھے- بخلاف ان قحطوں کے جو کہ ابتداء 1800ء سے واقع ہوئے وہ نہایت ہولناک اور بہت زیادہ تھے- 1900ء کے ابتداء تک یعنی صرف ایک سو برس کے عرصہ میں اکتیس قحط واقع ہوئے اور پھر جوں جوں اقتدار برطانوی بڑھتا گیا قحطوں کی مقدار اور ہولناکی بھی بڑھتی گئی- جس کی تفصیل چوتھائی صدی کے طرز پر حسب تصریح سر ولیم ڈگبی مندرجہ ذیل ہے-

1800ء	سے	1825ء تک	5 قحط	50 لاکھ آدمی صرف قحط سے مرے
1826ء	سے	1850ء تک	2 قحط	10 لاکھ = = = ==
1851ء	سے	1875ء تک	6 قحط	50 لاکھ
1875ء	سے	1900ء تک	18 قحط	3 کروڑ 70 لاکھ

ناظرین خیال فرمائیں کہ اس صدی کی آخری چوتھائی یعنی 1875ء سے 1900ء تک کا زمانہ وہ زمانہ ہے جس کو انگریزی اقتدار کی حیثیت سے زریں اور سنہرا زمانہ کہا جاتا ہے کیونکہ انقلاب 1857ء اور اس کے ہولناک مظالم اور بیدردی سے قتل و غارت وغیرہ کے بعد ہندوستانی اس قدر کمزور اور ذلیل ہو گئے تھے کہ ان میں کوئی سکت حکام برطانیہ کے مقابلہ اور مخالفت کی باقی ہی نہیں رہی تھی- انگریزی حکام جو چاہتے تھے کرتے تھے کسی میں دم مارنے کی طاقت نہیں تھی- خلاصہ یہ کہ اس صدی کی آخری چوتھائی جو کہ انگریزی اقتدار کی سب سے بلند چوٹی ہے اس میں اٹھارہ قحط واقع ہوئے اور ڈھائی کروڑ سے زیادہ آدمی صرف قحط کی وجہ سے موت کے گھاٹ اتر گئے- ان قحطوں کے اسباب خواہ کچھ بھی ہوں مگر جب اس طرح بربادی پھیلی ہوئی ہو اور لوگ بھوک اور غذا نہ پانے کی وجہ سے اس کثرت سے مر رہے ہوں اس وقت تو ضروری تھا کہ مالگزاری اور لگان بالکل چھوڑ دیا جاتا یا کم از کم تخفیف عمل میں لائی جاتی- مگر انگریزوں کی سنگ دلی اور درندگی ملاحظہ فرمایئے کہ چھوڑنا اور تخفیف کرنا تو درکنار ہمیشہ خراج میں اضافہ ہی ہوتا رہا اور وہ بھی معمولی

اضافہ نہیں تھا بلکہ تقریباً سو فیصد اضافہ اس پچاس برس کے عرصہ میں کر دیا گیا۔ اور نہایت سختی سے وصول کیا گیا۔ نہ انسانیت کا پاس کیا گیا۔ نہ شہنشاہی اور نہ پارلیمنٹری وعدوں، مواثیق اور اعلانات کا کوئی لحاظ کیا گیا۔ نہ غریبوں اور مفلسوں کی بربادی اور ہولناک موت کا کچھ خیال رکھا گیا۔ دنیائے تاریخ میں ایسی سنگدلی اور وحشت کی مثال نہایت کم پائی جائے گی۔ مسٹر جے کیر ہارڈی (موسس لیبر پارٹی) اپنی کتاب انڈیا میں لکھتا ہے کہ

> چالیس برس کے عرصہ میں 1860ء سے 1900ء تک تین کروڑ آدمی صرف فاقہ کشی کی وجہ سے ہندوستان میں مر گئے۔" اسی کتاب میں دوسری جگہ لکھتا ہے 1891ء سے 1900ء تک نو برس کے عرصہ میں ہندوستان میں ایک کروڑ نوے لاکھ آدمی قحط سے مرے ہیں۔" اس قدر موتیں ڈیڑھ سو برس میں (یعنی 1750ء سے 1900ء تک میں تمام دنیا میں جتنی لڑائیاں واقع ہوئیں) نہیں ہوئی تھیں۔ جتنی برطانوی حکومت کے زیر اقتدار کے تحت امن و امان کی حالت میں ہندوستان میں واقع ہوئیں۔"

ذرا اس بربریت کو ملاحظہ فرمایئے کہ 1890ء سے 1900ء تک میں اتنا عظیم الشان قحط ہندوستان میں پڑا ہوا ہے کہ تقریباً دو کروڑ آدمی مر گئے ہیں مگر اسی مدت میں زمین کے خراج پر دو کروڑ بیس لاکھ روپیہ اضافہ کیا گیا۔ یعنی 1890ء میں خراج چوبیس کروڑ پانچ لاکھ تھا اور 1900ء میں چھبیس کروڑ پچاس لاکھ کر دیا گیا۔ کیا اسی کو انسانیت کی خدمت اور رعایا پروری کہا جاتا ہے۔ اس لیے ڈبلو جی پیڈر 1873ء میں لکھتا ہے کہ "ایک ایسی رائے جس پر تقریباً ہر شخص متفق ہے اگر قابل اعتماد ہو سکتی ہے تو یہ صحیح ہے کہ اہل ہند ہماری زیر حکومت بد سے بدتر حالت کو پہنچتے جاتے ہیں۔"(18)

مسٹر گرانٹ ڈف (مئی 1870ء میں مسٹر لین سے غریب ہندوستانیوں کے متعلق دارالعوام میں) کہتا ہے

"آپ کا ارادہ ہے کہ ایک مفلس قوم کو بالکل ہی پیس ڈالا جائے؟۔"(19)

حالانکہ اس زمانہ سے پہلے ہی کمپنی نے ہندوستانیوں کی بربادی کو نہایت بھیانک صورت میں مبتلا کر دیا تھا جس کو سرجان شور 1833ء میں مندرجہ ذیل الفاظ میں ظاہر کرتا ہے۔

> "انگریزی حکومت کی پیس ڈالنے والی زیادہ ستانی نے ملک اور اہل ملک کو اتنا مفلس کر دیا ہے کہ اس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔ انگریزوں کا بنیادی اصول یہ رہا ہے کہ ہر صورت سے تمام ہندوستانی قوم کو اپنی اغراض کا غلام بنا لیا جائے۔ ان پر محصولات اتنے لگا دیئے ہیں کہ اضافہ کی گنجائش نہیں چھوڑی ہے یکے بعد دیگرے جو صوبہ ہمارے تصرف میں آیا ہے اس کو مزید وصولیابی کا میدان بنا لیا گیا ہے اور ہم نے اس بات پر ہمیشہ فخر کیا ہے کہ دیسی والیان ملک جتنا وصول کرتے تھے اس سے ہماری آمدنی کس قدر زیادہ ہے۔ مختصر یہ کہ ہندوستان میں جتنی انتہائی سخت اور جابر حکومتیں گزری ہیں ان میں ایک برطانوی حکومت بھی ہے۔"

خلاصہ یہ ہے کہ کوئن وکٹوریہ کے اعلان 1858ء سے پہلے بھی اور اس کے بعد بھی آج تک زمینوں پر خراج کا بوجھ برابر بڑھتا رہا اور جو قدیمی نظام زمینوں کا تھا اس میں برابر تبدیلی اور وصولی میں زیادتی ہوتی رہی جس کا زہریلا اثر یہ ہوا کہ کاشتکار اور زمیندار انتہائی درجہ میں مفلس اور قلاش ہو گئے اور لاکھوں مالکان آراضی کو زمینوں کو بیچ ڈالنے گروی کر دینے زمین سے دست بردار ہونے اور انتہائی افلاس میں گزر بسر کرنے یا فنا ہو جانے پر مجبور ہونا پڑا۔ یہ ہیں وہ اعلانات و عہود برطانیہ اور ان پر عمل درآمد

فاعتبروا یااولی الابصار

انگریز ہندوستان کے فاتح نہیں تھے بلکہ ہندوستان کو انتظام کی درستی کے لیے مغل بادشاہان دہلی سے بطور سند و عہد و پیمان و فرمانات شاہی انہوں نے 1765ء سے 1806ء وغیرہ میں حاصل کیا تھا اس لیے اس کے امانت ہونے کا اور اس کے غیر فاتح ہونے کا بڑے بڑے ذمہ داران برطانیہ کو ہمیشہ اقرار رہا ہے

(1) ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر اپنی کتاب (ہمارے ہندوستانی مسلمان ص 225 میں لکھتا ہے۔

> "بنگال کو انگریزوں نے حاصل کیا تو شہنشاہ دہلی کے دیوان ہونے کی حیثیت سے پھر یہ عہدہ کسی بہت بڑی رشوت سے نہیں بلکہ تلوار کے زور سے لیا گیا قانوناً ہم صرف شہنشاہ دہلی کے دیوان تھے یعنی چیف ریونیو آفیسر۔ اسی بناء پر مسلمانوں کا دعویٰ ہے کہ ہم کو اسی اسلامی طریقہ پر کاربند رہنا چاہیے جس کے انتظام کا ہم نے اس وقت ذمہ لیا تھا جہاں

تک میرا خیال ہے اس میں طرفین کا باہمی سمجھوتہ فی الواقع یہی تھا۔ "

(نوٹ) چونکہ آخری زمانہ سلطنت مغلیہ میں کمزوری سلطنت کی وجہ سے صوبے باغی ہو گئے تھے اس لیے جب کسی بڑے عہدہ پر بادشاہ کی طرف سے تقرر ہوتا تھا تو اس کو فرمان بادشاہ کی طرف سے مل جاتا تھا مگر بسا اوقات اس کو اس فرمان کے منوانے میں قوت کا استعمال کرنا لازمی ہوتا تھا۔ یہی مقصد مذکورہ بالا عبارت میں مندرجہ ذیل عبارت کا ہے۔ "
پھر یہ عہدہ کسی بہت بڑی رشوت سے نہیں بلکہ تلوار کے زور سے لیا گیا۔ "

(2) کتاب مذکور ہمارے ہندوستانی مسلمان کے اسی صفحہ 225 کے حاشیہ پر ہے "وہابی مقدمات کا انچارج افسر لکھتا ہے " ہم نے دیوانی اس وعدے کے ساتھ لی تھی کہ ہم اسلامی حکومت کو جیسی کہ اس وقت قائم ہے' برقرار رکھیں گے ہم نے ایسا ہی کیا تھا۔ "

(3) ہم اس سے پہلے مسٹر پیٹر فریمین کا مقالہ جو کہ انڈین نیوز لندن میں 1930ء میں شائع ہوا تھا نقل کر چکے ہیں جس کے الفاظ مندرہ ذیل ہمارے اس دعوے کے مسلم ہونے کے شاہد ہیں۔ "
برطانیہ عہد وپیمان کے ذریعہ ہندوستان پر ہندوستان کے بھلے کے لیے حکومت کرنے کا پابند ہے۔ "

(4) مسٹر برک کی تقریر بھی ہم مفصلاً نمبر 4 میں نقل کر آئے ہیں اس کے مندرجہ ذیل الفاظ بھی قابل ملاحظہ ہیں۔

> "پہلا بادشاہ جسے کمپنی نے روپیہ لے کر فروخت کیا آل تیمور کا مغل اعظم تھا یہ بلند شخصیت ایسی جو انسانی عظمت کا مطمع نظر ہو سکتی ہے۔ عام روایات کے مطابق اپنے عمدہ طرز عمل پاک باطنی اور ماہر علوم مشرقیہ ہونے کے باعث بہت ہر دلعزیز و محترم تھی اس کی یہ خوبیاں اور نیز یہ امر کہ اسی کی سندات کے طفیل میں ہم نے تمام ہندوستانی مقبوضات حاصل کئے اس کو بر سر بازار فروخت کرنے سے نہ روک سکے اسی کے نام کا سکہ چلتا ہے اسی کے نام سے عدل و انصاف کیا جاتا ہے۔ ملک کے طول و عرض میں اسی کے نام کا تمام عبادت گاہوں میں خطبہ پڑھا جاتا ہے لیکن پھر بھی اسے بیچ ڈالا گیا ایک سلطنت عطا کر دینے والے معطی اور بکثرت قوموں کے جائز حکمراں کے واسطے اس کے شاندار عطیات

میں صرف دو ضلع الخ۔ (20)

مذکورہ بالا الفاظ مسٹر برک کے صاف روشنی ڈالتے ہیں کہ انگریز ہندوستان کے ہرگز فاتح نہیں ہیں بادشاہی سندات اور فرامین کے ذریعہ اور اس کے طفیل میں ہندوستان پر انہوں نے قبضہ کیا تھا اور قبضہ واقتدار کے زمانہ میں بھی مثل ملازموں اور خدام سلطنت کے امور انتظامیہ مالیات وغیرہ انجام دیتے تھے خطبہ اسی کے نام کا پڑھا جاتا تھا۔

(5) مسٹر لائیڈ جارج وزیر اعظم برطانیہ۔ 20 اگست 1922ء میں تقریر کرتے ہوئے ہاؤس آف کامنس میں کہتے ہیں۔

> ”اگر یہ بات پہلے سے صاف نہیں ہے تو اب میں صاف طور پر کہنا چاہتا ہوں کہ ہماری غرض اصلاحات دینے سے یہ نہیں ہے کہ انجام کار ہم اپنی امانت سے بالکل دست بردار ہو جائیں۔

مسٹر لائیڈ جارج کو اقرار ہے ہندوستان انگریزوں کے پاس امانت ہے۔ مفتوحہ چیز امانت نہیں ہوتی۔

(6) پروفیسر سیلے کہتا ہے کہ اگر ہندوستان میں متحدہ قومیت کا کمزور جذبہ بھی پیدا ہو جائے اور اس میں اجنبیوں کے نکالنے کی کوئی عملی روح بھی نہ ہو بلکہ صرف اس قدر احساس عام ہو جائے کہ اجنبی حکومت سے اتحاد عمل ہندوستانیوں کے لیے شرمناک ہے تو اسی وقت سے ہماری شہنشاہیت کا خاتمہ ہو جائے گا کیونکہ ہم درحقیقت ہندوستان کے فاتح نہیں ہیں اور اس پر فاتح حکمرانی نہیں کر سکتے اگر ہم اس طرح حکومت کرنی بھی چاہیں گے تو اقتصادی طور پر قطعاً برباد ہو جائیں گے۔

دیوانی کے معاہدوں کی خلاف ورزی

غرضیکہ ہندوستان پر انگریزو کا قبضہ فاتحانہ نہیں تھا بلکہ متعدد عہود اور مواثیق اور شروط کے ساتھ بادشاہی فرمانات حاصل کیے گئے تھے جن کے سایہ میں آہستہ آہستہ تمام ہندوستان پر قبضہ ہو سکا اور جن میں برابر دھوکا دہی غداری مکاری عمل میں لائی گئی

ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر لکھتا ہے۔

> (۱) "ایسٹ انڈیا کمپنی کے سابق ملازمین اپنی حیثیت کو اچھی طرح سمجھتے تھے اور جب انہوں نے پہلے پہل صوبجات پر قبضہ کیا تو اسلامی نظام کو برقرار رکھا انہوں نے شرع اسلامی کو ملک کا قانون بنایا اور اس کے نفاذ کے لیے مسلمان قاضی مقرر کیے اس وقت جو بھی کیا جاتا دہلی کے مسلمان شہنشاہ کے نام پر کیا جاتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی بادشاہت کا طغرائے امتیاز حاصل کرنے سے اس قدر ڈرتی تھی کہ ایک طویل مدت تک بھی جب مسلمان ملازمین کی وساطت سے حکومت کرنے کی کوشش اسلامی نظام کے ناقابل ذکر بدعنوانیوں کے باعث قطعاً ناکامیاب ہو چکی تھی اس نے یہی ظاہر کیا کہ وہ بادشاہ کی نائب ہے یہ ایک تاریخی واقعہ ہے کہ اس ظاہرداری نے آخر ایک قابل تماشے کی صورت اختیار کر لی تھی ہم اس زمانے میں جب ہمارا ریزیڈنٹ شاہ دہلی کو ایک غریب قیدی کی طرح کھانے پینے کے لیے کچھ ماہوار رقم بطور وظیفہ دیا کرتا تھا جو حکم جاری کرتے اسی کے نام پر کرتے چونکہ اب تک جو لوگ ہندوستان کی تاریخ پر قلم اٹھاتے رہے وہ کبھی ہندوستان نہیں آئے اس لیے ان سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ انگلستان میں بیٹھ کر ایسٹ انڈیا کمپنی کے اس عجیب و غریب طرز عمل کو سمجھ سکیں گے جس کو ہم نے ابھی بیان کیا ہے حقیقت یہ ہے کہ اگر ہم نے باقاعدہ بادشاہت قبول کرنے میں دس سال بھی جلدی کی ہوتی تو ہم مسلمانوں کی

ایسی بغاوت میں گھر جاتے جو 1857ء کی بغاوت سے بھی کہیں زیادہ خطرناک ہوتی مسلمان محسوس کرتے کہ ان کی حیثیت یک قلم بدل گئی ہے ہماری اپنی حالت بھی ایسی کافر طاقت کی ہو جاتی جس نے دارالاسلام پر قبضہ کرلیا ہو۔ اندریں حالات مسلمانوں کی ایک بہت بڑی اکثریت جمع ہو جاتی کہ بغاوت کو فرض عین قرار دے۔ میں اس سے پہلے بیان کر آیا ہوں کہ شریعت اسلامی کی رو سے ہر مرد عورت اور بچے کا پہلا فرض یہ ہے کہ وہ کافر حکمرانوں کی بیخ کنی کرے اور انہیں ملک سے باہر نکالدے ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازمین کی قابل تعریف اعتدال پسندی اور اس عزم بالجزم نے کہ اسلامی سلطنت کی تدریجی اور طبعی موت میں ایک لمحہ بھر کی عجلت بھی نہ کی جائے نے اس مصیبت کو ہمارے سر سے ٹال دیا ہندوستان بتدریج اور غیر محسوس طور پر دارالاسلام سے دارالحرب میں تبدیل ہوتا گیا۔ شاہی ضلع وار دستاویزات کی کئی سال تک تحقیق کرنے کے بعد میرے لیے یہ بتلانا ناممکن ہے کہ یہ تبدیلی کس سال یا کس مدت میں واقع ہوئی۔ مسلمان شہنشاہ کی ظاہری برتری کو مٹانے سے بہت پہلے ہم نے مسلمان حاکموں کو برطرف کرنا شروع کر دیا تھا۔ لیکن اس برائے نام عظمت کے محض تماشہ بن جانے کے بعد بہت کافی حتی کہ 1835ء تک ہمارے سکے اسی کے نام سے جاری ہوتے تھے۔ 1835ء میں کمپنی کے روپے پر جس کا وزن 180 گرین تھا انگریزی بادشاہ کی شکل بنائی گئی تھی اور ایسٹ انڈیا کا نام لکھا گیا تھا) پھر جب ہمیں یہ جرات ہوئی کہ سکوں پر انگریز بادشاہ کی شکل دی جائے تب بھی ہم نے اسلامی دستور العمل اور عدالتوں میں اسلامی زبان کو برقرار رکھا گویہ یہ باتیں بھی بتدریج مٹ گئیں۔ حتی کہ 1864ء میں ہم نے ایک دلیرانہ قدم اٹھایا میرے خیال میں یہ اقدام بڑا ہی غیر دانشمندانہ تھا یعنی مجلس قانون ساز کے ایک ایکٹ کے ذریعہ ہم نے تمام مسلمان قاضیوں کو برطرف کر دیا۔ اس قانون نے نئی ہندوستانی سلطنت کی اس عمارت کو مکمل طور پر دارلحرب میں بدل دیا۔ جس کی تعمیر پوری ایک صدی 1765ء سے

> 1864ء سے ہو رہی تھی اسلامی حکومت کے اس طرح بتدریج مٹنے سے ہماری مسلمان رعایا پر نئے نئے فرائض عائد ہوتے گئے۔"(21)

ڈاکٹر ہنٹر کی تصریحات پوری طرح پر روشنی ڈالتی ہیں کہ انگریزوں نے ہندوستان کو شاہان مغلیہ سے بذریعہ فرمانات اور عہدہ پیمان دھوکہ دے کر اور اطمینان دلا کر حاصل کیا تھا مگر نیتیں صاف نہ تھیں اپنی معلون اور نجس اغراض زیر نظر تھیں وعدہ کیا گیا کہ ہر زمانہ میں اسلامی اور شہنشاہی نظام کو محفوظ رکھ کر آمدنی کو ترقی اور نظام کو برتری دی جائے گی مگر دل کے چور نے ابتدا ہی سے نظام اسلامی کو برباد کرنا شروع کر دیا اور مسلمانوں کو آہستہ آہستہ نکال کر اور اپنا زہریلا مادہ داخل کر کے بادشاہی طاقت اور مسلمانوں کی برتری کو فنا کر دیا۔ اور تمام عہود پیمان کو رفتہ رفتہ اس طرح توڑ ڈالا کہ ان عہود کا کوئی تار بھی باقی نہ رہ گیا۔

> (2) پھر ڈبلیو ہنٹر لکھتا ہے۔ "انگریزوں نے چند ایک سال تو مسلمان عہدے داروں کو بحال رکھا لیکن جب اصلاح کا وقت آیا تو اس قدر احتیاط سے قدم اٹھائے کہ اس پر بزدلی کا گمان ہونے لگتا ہے۔ بایں ہمہ سب سے کاری ضرب جو ہم نے پرانے طریق کار پر لگائی وہ اس قدر پر فریب تھی کہ اس کا پیش از وقت اندازہ نہ مسلمانوں کو ہو سکا نہ انگریزوں کو۔ میرا مطلب ہے ان تبدیلیوں سے جو لارڈ کارنوالس نے رائج کیں اور جن سے 1763ء کا دوامی بندوبست مترتب ہوا۔ اس بندوبست سے ان مسلمان افسروں کا کاروبار زبردستی ہمارے ہاتھ آگیا جو حکومت اور ٹیکس جمع کرنے والوں کے درمیان واسطہ کا کام دیتے تھے اور جن کے سپاہیوں کو مال گزاری جمع کرنے کا جائز حق پہنچتا تھا۔"(22)
>
> (3) پھر صفحہ 227 پر لکھتا ہے۔ "ایک افسر جس نے مسلمانوں کی موجودہ بے چینی اور دوامی بندوبست سے اس کے تعلق کا مطالعہ بڑی دقیق نظر سے کیا ہے لکھتا ہے۔" اس بندوبست نے ہندو کلکٹروں کو جو اس سے پہلے معمولی عہدوں پر مامور تھے ترقی دے کر زمیندار بنا دیا ہے۔ ان کو زمین کی ملکیت کا حق حاصل ہو گیا ہے اور اب وہ اس دولت کو سمیٹ رہے ہیں جو مسلمانوں کی حکومت کے ماتحت مسلمانوں کا حق تھا۔" سو یہ

> سب سے بڑی ناانصافی ہے جس کا مسلمان امراء انگریزی حکومت کو مجرم ٹھہراتے ہیں۔ ان کا یہ دعوی ہے کہ ہم نے مسلمان شہنشاہ سے بنگال کی دیوانی اس شرط پر لی تھی کہ ہم اسلامی نظام کو برقرار رکھیں گے۔ لیکن جوں ہی ہم نے اپنے آپ کو طاقتور پایا اس وعدے کو فراموش کر دیا۔ ہمارا جواب یہ ہے کہ جب ہم نے بنگال میں مسلمانوں کے نظام دیوانی کا مطالعہ کیا تو اس قدر یک طرفہ اور ناکارہ اور اصول انسانیت کے خلاف پایا کہ اگر ہم اس کو برقرار رکھتے تو تہذیب کے لیے باعث ننگ ہوتے اور ہم اضلاع کے اندراج سے یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ اسلامی حکومت کا مقصد محض روپیہ جمع کرنا تھا۔ مالگزاری جمع کرنے والوں کے ذمے نظام حکومت کے تمام فرائض کر دیے گئے تھے۔ ان کو اس بات کی اجازت تھی کہ جو جی میں آئے کریں بشرطیکہ مالگزاری کا روپیہ باقاعدہ جمع کرتے رہیں۔ عوام کو اس لیے ستایا جاتا تھا کہ زمینداروں کو لگان وصول ہوتا رہے ان کو اس لیے لوٹا جاتا تھا کہ زمینداروں کے ملازمین دولت مند ہو جائیں۔ اس ظلم و ستم کے خلاف شکایت بے سود تھی کیونکہ یہ زمیندار اور اس کے افسر کی مرضی پر منحصر تھا کہ وہ ان کی شکایات کو سنے یا نہ سنے۔ ان کی شکایات کے ازالہ کا امکان بہت کم تھا کیونکہ ظالم بالعموم زمیندار ہی کا ملازم ہوتا تھا پھر اگر ڈاکوؤں کو کوشش کرکے گرفتار بھی کر لیا جاتا تو ان کے لیے مشکل نہ تھا کہ قید کرنے والوں سے یارانہ گانٹھ لیں۔ بات یہ ہے کہ مسلمانوں کے ماتحت حکومت کی حیثیت. ایسی مشین کی تھی جس سے تھوڑے آدمی دولتمند ہو جائیں یہ نہیں کہ بہتوں کی حفاظت ہو سکے معلوم ہوتا ہے اس پر نہ کبھی حاکموں کے دل میں رحم پیدا ہوا نہ ان کے ضمیر میں"

ڈاکٹر ہنٹر اقرار کرتا ہے کہ انگریزوں نے یقیناً اسی شرط پر ہندوستان کے صوبہ بنگال کی دیوانی لی تھی کہ وہ نظام اسلامی کو برقرار رکھیں گے اور اس کا بھی اقرار کرتا ہے کہ ہم نے (انگریزوں نے) اس کو توڑا اور عہد شکنی کی۔ مگر چونکہ وہ اپنے قومی جذبات میں اس قدر غرق ہے کہ اپنی قوم اور اپنی حکومت کے اعمال اور اخلاق کو اولاً صحیح نظریہ پر پرکھ ہی

نہیں سکتا یا اگر پرکھ سکتا ہے تو اس کی تاویل کرنا ضروری سمجھتا ہے۔ اس کو قومی محبت نے حقائق سے اندھا کر دیا ہے۔ حالانکہ یہ وہی نظام ہے جو کہ شہنشاہ بابر کے زمانہ سے شہنشاہ عالمگیر کے اخیر زمانہ تک تقریباً دو سو برس سے زیادہ قائم رہا بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ زمانہ ابتدائے سلطنت اسلام سے عہدہ عالمگیری کے خاتمہ تک ایک ہزار برس سے زائد قائم رہا جس میں تمام ممالک اسلامیہ بالخصوص ہندوستان رشک جناں بن گیا تھا تو صحیح ہو گا اگر وہ نظام اسلامی ناکارہ اور یک طرفہ اور اصول انسانیت کے خلاف ہوتا تو ملک کیوں اس قدر پھولتا اور پھلتا۔

> میجر باسو کہتا ہے۔ "رعایا کی خوشحالی اور سرمایہ داری کے اعتبار سے بھی مسلمانوں کا دور حکومت سونے کے حروف سے لکھے جانے کے قابل ہے۔ دولتمندی اور آرام و چین کا جو نقشہ شاہجہاں کے وقت میں دیکھنے میں آتا تھا بلاشبہ بے مثل و بے نظیر تھا۔"(23)
>
> لارڈ میکالے کہتا ہے۔ "باوجود مسلمان ظالموں اور مرہٹہ لٹیروں کے مشرقی ممالک میں بنگال باغ جنت یا نہایت دولت مند سمجھا جاتا تھا اس کی آبادی سب بے حد غایت بڑھتی تھی۔ غلہ کی افراط سے دور دراز کے صوبہ جات پرورش پاتے تھے اور لندن اور پیرس کے اعلےٰ خاندانوں کی عورتیں یہاں کے کرگھوں کے نازک ترین کپڑوں میں ملبوس ہوتی تھیں۔" (24)
>
> لارڈ کلایو لکھتا ہے۔ "یہ (ہندوستان) نامتناہی دولت والا ملک ہے۔"
>
> سرجان شور انگریزوں سے پہلے کے زمانہ کو عہد زریں قرار دیتا ہے۔

غرضیکہ یہ بالکل غلط اور جھوٹی بات ہے کہ نظام حکومت اسلامیہ یک طرفہ اور ناکارہ اور اصول انسانیت کے خلاف تھا۔ اس قسم کی بیشمار شہادتیں خود انگریزوں کی موجود ہیں کہ اس نظام کے ماتحت ہندوستان ہر طرح ترقی پذیر رہا۔ البتہ اس نظام سے جس کو کمپنی اور لارڈ کارنوالس وغیرہ نے بنایا تھا ملک انتہائی بربادی کو پہنچ گیا۔ سرجان شور (جو کہ صوبہ بنگال کی سول سروس سے تعلق رکھنے والا تھا) 1837ء میں لکھتا ہے۔

> "برطانیہ نے جو طرز حکومت قائم کیا ہے اس کے تحت ملک اور باشندگان ملک رفتہ رفتہ محتاج ہوتے جاتے ہیں اور یہی سبب ہے کہ ان

پر جلد تباہی آ گئی انگریزی حکومت کی پیس ڈالنے والی زیادہ ستانی نے ملک اور اہل ملک کو اتنا مفلس کر دیا ہے کہ اس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔ انگریزوں کا بنیادی اصول یہ رہا ہے کہ ہر صورت سے تمام ہندوستانی قوم کو اپنی اغراض کا غلام بنا لیا جائے۔ ان پر محصولات اتنے لگا دیئے ہیں کہ اضافہ کی گنجائش نہیں چھوڑی ہے یکے بعد دیگرے جو صوبہ ہمارے تصرف میں آیا ہے اس کو مزید وصولیابی کا میدان بنا لیا گیا ہے اور ہم نے اس بات پر ہمیشہ فخر کیا ہے کہ دیسی والیان ملک جتنا وصول کرتے تھے اس سے ہماری آمدنی کس قدر زیادہ ہے۔ ہر وہ عمدہ عزت اور منصب جس کو قبول کرنے کے لیے ادنیٰ سے ادنیٰ انگریز کو آمادہ کیا جا سکتا ہے۔ ہندوستانیوں کے لیے بند کر دیا گیا ہے۔ مختصر یہ کہ ہندوستان میں جتنی انتہائی سخت اور جابر حکومتیں گزری ہیں ان میں ایک برطانوی حکومت ہے جس کے دور میں حکومت اور ذی ثروت افراد (بشرطیکہ وہ بے اندازہ دولت رکھتے ہوں) دونوں انصاف کا خون کر سکتے ہیں اور کر چکے ہیں جس کے عہد میں ظلم کی داد رسی تقریباً ایک ناممکن چیز ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ رعایا ہم سے نفرت کرتی ہے اور ہر طاقت کا خیر مقدم کرنے اور اس کے پرچم کے نیچے جمع ہو جانے کے لیے تیار ہے۔ بشرطیکہ اس میں اتنی قدرت ہو کہ ہمیں تباہ کر سکے۔" اس عبارت سے پہلے وہ لکھتا ہے "لیکن ہندوستان کا عہد زریں گزر چکا ہے جو دولت کبھی اس کے پاس تھی اس کا جزو اعظم ملک کے باہر کھینچ کر بھیج دیا گیا ہے اور اس کے قدرتی عمل اس بد عملی کے ناپاک نظام نے معطل کر دیئے ہیں جس نے لاکھوں نفوس کی منفعت کو چند افراد کے فائدے کی خاطر قربان کر دیا ہے۔"(25)

مسٹر سول میریٹ ممبر کونسل 1836ء میں لکھتا ہے۔

"برطانیہ کا دور حکومت مہربان اور مقبول بتایا جاتا ہے مگر اس عہد میں ملک جس حالت کو پہنچ گیا ہے اس کا مقابلہ دیسی حکمرانوں کے عہد سے کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ اس وقت لوگ خوشحال تھے۔ یہ ملک فلاکت

> کی انتہائی پستی تک پہنچ گیا ہے۔ میں ایک واقعہ عرض کرنا چاہتا ہوں جو نہایت اہم نتائج سے لبریز ہے اور وہ یہ ہے کہ چند سال سے سرکاری مالگزاری کا بڑا حصہ ملک کا سرمایہ بک کر ادا ہو رہا ہے۔ اگرچہ وہ سرمایہ خود ہی نہایت مختصر ہے۔ سرمایہ سے میری مراد کسانوں کی منقولہ جائداد ہے۔ جو قیمتی دھات یا پتھر کے استعمال زیورات پر مشتمل ہوتی ہے۔ ان زیورات کو حسب ضرورت نفع آور کاموں میں لگایا جاتا ہے اور کاشتکاری کے لوازمات کے بہم پہنچانے کا بھی اس سے کام لیا جاتا ہے اور بالعموم اس مقصد کے حاصل کرنے کو اس وقت تک کے لیے جب تک کام پورا ہو گرو کرنے کا طریقہ اختیار کیا جاتا ہے مختصر یہ ہے کہ جس چیز پر نظر ڈالئے اس سے یہ عقیدہ کہ روز افزوں تنگ حالی ہم کو فلاکت مطلق کی طرف لے جا رہی ہے پختہ ہو جاتا ہے۔“

یہی مسٹر میریٹ ایک دوسرے مقام پر کہتے ہیں۔

> ”ہندوستان میں ہماری حکومت سے جو مصائب ظہور میں آئے ہیں وہ یا تو اس گرانقدر خراج سے براہ راست پیدا ہوئے ہیں جو یہ ملک انگلستان کو ادا کرتا ہے یا بالواسطہ اسی کا نتیجہ ہیں۔ یہ سچ ہے کہ کھلی ہوئی دست درازی کے استیصال سے جو برکات حاصل ہوتی ہیں ان کے ہندوستانی اب تک ممنون اور معترف ہیں مگر اسی کے ساتھ وہ کہتے ہیں کہ یہ بڑھی ہوئی ناداری ایک ایسے ناسور کا پتہ دیتی ہے جو درپردہ ہلاکت کے سامان کر رہا ہے اور اس کا کوئی جواب موجود نہیں ہے۔“

مندرجہ بالا حوالوں سے جو کہ برطانیہ کے مشہور و معروف ذمہ داران ارباب حکومت کے اقوال ہیں اور جنہوں نے ہندوستان میں رہ کر حالات کا بخوبی معائنہ کیا ہے صاف طور پر ظاہر ہو رہا ہے کہ ڈاکٹر ہنٹر نے جو الزامات اس اسلامی نظام پر (جس کا وعدہ اور عہد برطانیہ نے شاہان مغلیہ سے کیا تھا) رکھے ہیں وہ بالکل غلط اور محض اپنی قوم کی شرمناک جانب داری اور ناجائز پروپیگنڈہ پر مبنی ہیں اور جو بھلائیاں اپنے نظام میں دکھلائی ہیں وہ بالکل خلاف واقعہ ہیں بلکہ یہ نظام محض لوٹ کھسوٹ اور انتہائی بربادی اور خود غرضیوں پر مشتمل ہے۔ جس نے ہندوستان کو بالکل مفلس اور قلاش اور ناکارہ بنا کر ہلاکت کے

گڑھوں میں ڈال دیا ہے۔ ہندوستانی نظام قدیم کے متعلق ڈاکٹر ہنٹر کا انتقاد اور اعتراض (جو مذکورہ بالا حوالوں سے معلوم ہوتا ہے۔) بالکل برعکس ہے۔ برطانیہ اور انگریزوں کے بنائے ہوئے نظام میں وہ سب خرابیاں بلکہ اس سے بدرجہا زائد موجود ہیں جن کو ڈاکٹر صاحب موصوف اسلامی نظام میں دکھلا رہے ہیں۔

برعکس نہند نام زنگی کافور

لارڈ اڈسلے نے 1867ء میں بیان کیا تھا کہ۔

> "ہمیں دیسی حکومت کے طریقہ کو جہاں تک ممکن ہو ترقی دینے کی کوشش کرنا چاہیے۔ تاکہ دیسیوں کی قدرتی استعداد اور تدبیر کی نشوونما ہو سکے اور ان میں جتنی خوبیاں اور جوہر بھی تھے حکومت کی امداد میں کام آسکیں۔ مغلیہ سلطنت کی عظمت کا راز وہ سیر چشم حکمت عملی تھی جو اکبر اور اس کے جانشینوں کا شعار رہی جنھوں نے ہندوؤں کی اعانت اور قابلیت سے فائدہ اٹھایا اور حتی المقدور خود کو اہل ملک کے ساتھ یک ذات کر لیا۔ ہمیں ان واقعات سے سبق لینا چاہیے۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ اس فرض کو ادا کریں جو ہندوستان کی طرف سے ہم پر عائد ہے توہم اسی طرح سبکدوش ہو سکتے ہیں کہ ملک میں جتنے اشراف اور اکابر ہیں ان کی امداد اور مشورہ سے فائدہ اٹھائیں۔ یہ جواب کہ ہندوستانی دماغ میں تدبر اور قابلیت کا سرمایہ ناکافی ہے ایک بے معنی لغویت ہے۔"
> (26)

لارڈ سالسبری نے بھی لارڈ اڈسلے کی تائید کرتے ہوئے فرمایا۔

> "جو لوگ ہندوستان سے سب سے زیادہ واقف ہیں ان کی متفقہ رائے یہ ہے کہ چند چھوٹی چھوٹی دیسی ریاستیں جن کا نظم و نسق عمدہ ہو۔ ہندوستانیوں کے سیاسی اور اخلاقی ارتقاء کے لیے حد درجہ مفید ہیں۔"

اسی قدیم نظام اسلامی اور جدید نظام انگریزی کے متعلق ہینبرڈ لکھتا ہے۔

> "باوجودیکہ انگریزوں کی عام رائے اس زمانہ میں اسی طرف تھی کہ

> ہندوستان کا نظام اسی پرانے طریقہ پر رکھا جائے جیسا کہ قدیم سے چلا آتا تھا تاہم ہندوستان میں وہی نظام قائم رکھا گیا جو کمپنی کے زمانہ میں قائم ہو چکا تھا اور جس کی نسبت لارڈ سیلسبری نے 1867ء میں فرمایا تھا کہ ضابطے اور دستور کی طرف برطانوی حکومت کا رجحان اس کی سست گوش اور ابلہانہ لاپروائی جو اکثر اس کی مکمل اور پیچیدہ تنظیم کا نتیجہ ہوتی ہے ذمہ داری کا خوف اور اختیارات نظم و نسق ایک جگہ مرکوز ہونا یہ سب باتیں ایسے اسباب کا نتیجہ ہیں جن کی ذمہ داری کسی شخص پر نہیں ہے۔ لیکن ان کی بدولت حکومت ناکارہ ہو گئی ہے اور اس نااہلیت میں قدرتی حالات اور اسباب سے مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک خوفناک تباہی نمودار ہو گئی ہے۔" (27)

چنانچہ اس نظام کی وجہ سے جو مصیبت اس ملک میں ہوئی اس کا اندازہ مسٹر رابرٹ نائٹ کی مندرجہ ذیل رائے سے بخوبی ہو سکتا ہے جو کہ انہوں نے زوال گجرات کی نسبت ظاہر کی ہے۔

> "1807ء میں جبکہ گجرات میں ہم نے پہلا قدم رکھا تھا بہت سے دولت والے اور فارغ البال خاندان موجود تھے مگر ان کے بدن پر آج کپڑا بھی نہیں ہے۔ تعلقداران سے ہمارے مطالبہ جات اس رقم سے جو وہ پہلے ادا کرتے تھے۔ تین گنے بلکہ اس سے بھی زیادہ ہیں اور اس زیادتی کے معاوضے میں کوئی فائدہ نہیں ہے جو ان کو حاصل ہوا۔ ساہو کاروں جن سے تعلقداران کو تباہ کن شرح سود پر قرضے لینا پڑے ہیں اپنے مطالبے میں ان کی املاک اور دیہات کو قرق کرا لیا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ قرضہ سر سے اونچا ہوتا جاتا ہے اور گلو خلاصی کی صورت نہیں۔ خیال تو کیجیے ان کے گھرانوں کا آئندہ کیا حال ہو گا۔" (28)

الغرض نظام اسلامی قدیم کی برکتیں تو ظاہر و باہر ہیں جن کا اقرار تمام مورخین کرتے ہیں اور جنہوں نے اعلانیہ طور پر ہندوستان کو رشک جناں بنا دیا تھا اسی بناء پر شاہان مغلیہ نے اپنے فرمانوں میں ان کے باقی رکھنے اور انہیں کے ترقی دینے کا عہد لیا تھا۔ مگر انگریزوں نے چونکہ اپنی حرص و آز اور جلد سے جلد زیادہ سے زیادہ دولت مند ہو جانے کی خواہش

کو اس میں نہ پایا اور اس میں ہندوستانی پبلک کی پرورش اور ترقی تو دیکھی مگر انگریز قوم کی حریصانہ مسابقت کے آثار نہ دیکھے اس لیے اس کو چھوڑنا ضروری سمجھا اور حسب عادت قدیم اس میں عیوب کا پروپیگنڈہ اور اپنی ابلیسانہ خواہشوں کو پورا کرنے والے نظام کو اچھالنا شروع کرکے آہستہ آہستہ جاری کیا۔ (کیونکہ دفعۃً جاری کرنا خطرناک تھا) جس کے نتیجہ میں ہندوستان انتہائی فلاکت اور بربادی میں مبتلا ہو گیا۔ حالانکہ انصاف پسند اور سمجھ دار انگریز اس کے مخالف رہے 1858ء کے بعد بھی اس کو جاری رکھا گیا اور وکٹوریہ کے اعلانات کو پس پشت ڈال دیا۔ مسٹر فلپ فرانسس جو کہ بنگال کونسل کا ممبر تھا۔ لکھتا ہے۔

> "ایک انگریز کو یہ معلوم ہو کر تکلیف ہونی چاہیے کہ جب سے کمپنی کو دیوانی ملی ہے اہل ملک کی حالت پہلے سے بدتر ہو گئی ہے اور یہ کمپنی کی تجارت وغیرہ کا نتیجہ ہے میرے خیال میں یہی اسباب ہیں جن کی وجہ سے یہ ملک ایک شخصی اور مطلق العنان حکومت کے زیر سایہ تو سرسبز ہوتا رہا مگر جب انگریزوں کے تصرف میں آیا تو تباہی کے کنارے پہنچ گیا۔ (29)

خود لارڈ کلایو 1765ء میں کہتا ہے۔

> جو بدنظمی نظر آ رہی ہے وہ کس چیز کا نتیجہ ہے وہ نتیجہ ہے چند لوگوں کی لوٹ مار عیش پسند حرص اور تھوڑے عرصہ میں اس قدر دولت مند بن جانے کی ہوس کا جو صرف چند لوگ ہی بن سکتے ہیں۔"

بہرحال جو اعتراضات اور ننگ انسانیت الزامات نظام انگریزی میں ابتداء سے پائے جاتے تھے اور آج تک ظہور پزیر ہوتے رہے ان کو نظام اسلامی پر تھوپنا جسارت اور شرمناک کاروائی ہے جو کہ ہمیشہ سے انگریزی ڈپلومیسیوں کے بائیں ہاتھ کا کرشمہ رہا ہے۔

خرد کا نام جنوں رکھ لیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

پھر مسٹر ہنٹر موصوف ص 229 پر لکھتا ہے۔

> "جب ہم نے اس نظام کو توڑنا شروع کیا جس کو برقرار رکھنے کا ہم نے وعدہ کیا تھا تو ان بیچاروں کی جان میں جان آ گئی۔"

یہ اقرار بھی واضح طور پر جتلا رہا ہے کہ انگریزوں نے بادشاہان اسلام سے عہود اور پیمانات کئے تھے اور وہ جملہ اسلامی اور شہنشاہی قوانین اور طرز حکومت کا برقرار رکھنا تھا مگر انہوں

نے ان سب کو توڑ ڈالا باقی رہا یہ امر کہ آیا نظام سابق کے توڑنے اور انگریزی نظام کے جاری کرنے سے ہندوستانی عوام اور کاشتکاروں کی جان میں جان آئی یا تلف ہو گئی۔ اوپر کے وہ تھوڑے سے نوٹ جو ہم نے معتبر حوالوں سے ذکر کیے ہیں اس پر پوری روشنی ڈالتے ہیں۔ حالانکہ اس قسم کی شہادتیں طول کے خوف سے ہم نے بہت کم ذکر کی ہیں ہندوستان کی موجودہ انتہائی برباد شدہ حالت کھلے بندوں اس کی کیفیت بتلا رہی ہے۔

(5) پھر ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر صفحہ 230 میں لکھتا ہے۔

> "مگر یہ دلائل کتنے ہی وزنی کیوں نہ ہوں ان پرانے نوابوں کو مطمئن نہیں کر سکتے جو برطانوی حکومت کی بے راہ روی کی وجہ سے بڑی بڑی تکلیفیں اٹھا رہے ہیں۔ فوج سے بے دخلی مسلمانوں کے نزدیک سب سے بڑی قومی ناانصافی ہے اور ان کے پرانے نظام مالیات سے ہمارا انحراف صریحاً وعدہ خلافی ہے۔"

ان جملوں میں ڈاکٹر ہنٹر وعدہ خلافی اور ناانصافی کو مسلمانوں کا عندیہ قرار دیتا ہے (حالانکہ خود تسلیم کر چکا ہے کہ واقع میں جو ہمارے وعدے اور عہود تھے ہم ان پر قائم نہیں رہے اور 1765ء سے اس کے درپے رہے کہ ان کا تار تار بکھیر دیا جائے چنانچہ سو برس کے عرصہ میں یعنی 1864ء تک ہم نے اس کو رفتہ رفتہ بالکل نیست و نابود کر دیا اور دانستہ یا نادانستہ طریقہ پر پردہ ڈال کر اس عہد توڑنے اور نیا نظام قائم کرنے ہی کو بہتر اور ملک کے لیے مفید بتلاتا ہے اور نہایت شرمناک انداز سے اس حقیقت کو چھپانا چاہتا ہے جس کا ہم پول کھول چکے ہیں۔

مذکورہ بالا چند واقعات بطور نمونہ پیش کیے گئے ہیں جن سے ملکی اعلانات اور معاہدوں میں کھلی غداری کا پتہ چلتا ہے۔ اب میں چند جدید واقعات پیش کرتا ہوں جن کا تعلق مسلمانوں اور ان کے مذہبی مراکز "مقدس مقامات" سے ہے۔

مقامات مقدسہ کے متعلق اعلانات اور غداری

2 نومبر 1914ء کو وائسرائے ہند نے مقامات مقدسہ کے متعلق مسلمانان ہند کے لیے اعلان کیا تھا۔

> "برطانیہ عظمی اور ترکی میں جنگ چھڑ جانے کی وجہ سے جو دولت عثمانیہ نے قصداً بغیر کسی قسم کی دھمکی دیئے جانے کے غلط مشوروں سے شروع کی ہے ملک معظم کی گورنمنٹ ہر ایکسی لنسی ہند کو اختیار دیتی ہے کہ وہ عرب کے مقدس مقامات اور عراق کی مقدس زیارت گاہوں اور جدہ کے ساحل کے متعلق ایک عام اعلان کر دیں تاکہ ملک معظم کی بہت ہی وفادار ہندوستانی مسلم رعایا کو اس جنگ کے متعلق کسی قسم کی غلط فہمی نہ ہو۔ مذہبی سوال سے کسی قسم کا تعلق نہیں۔ اعلان یہ ہے کہ یہ مقدس مقامات اور جدہ برطانیہ سوال سے کسی قسم کا تعلق نہیں۔ اعلان یہ ہے کہ یہ مقدس مقامات اور جدہ برطانیہ کے بحری اور بری فوج کے حملے اور دست برد سے بالکل محفوظ رہے گا تاوقتیکہ ہندوستانی حاجی اور زوار کی آمد و رفت میں کوئی دست اندازی نہ کی گئی۔ ملک معظم کی گورنمنٹ کے کہنے سے فرانس اور روس کی حکومتوں نے اسی قسم کا اطمینان دلایا ہے۔"

اس اعلان کو چند ہی دنوں میں توڑ ڈالا گیا۔ اور 1916ء میں جدہ کے ساحل پر آٹھ دن گولہ باری کی گئی اور اس کے بعد فوجیں اتار گئیں اور پھر انہی فوجوں سے جدہ سے مکہ معظمہ پر چڑھائی کی گئی۔ ترکی حکام اور افسروں اور سپاہیوں کو پہلے جدہ میں ہتھیار ڈالنے پر مجبور کرا کے اسیر کیا گیا اور مصر بھیج دیا گیا۔ پھر مکہ معظمہ میں قشلہ اور قلعہ پر گولہ باری کرائی گئی اور جب تنگ آ کر ترکی فوجوں اور افسروں نے ہتھیار ڈال دیئے تو اس کو بھی اسیر کر کے مصر بھیج دیا گیا۔ پھر طائف پر چڑھائی کی گئی اور تقریباً ڈھائی مہینہ کی گولہ باری کے بعد جب ترکی فوجوں نے ہتھیار ڈال دیئے تو ان کو بھی اسیر کر کے مصر وغیرہ بھیج دیا گیا۔

چونکہ میں (کاتب الحروف) اس زمانہ میں حجاز (طائف) میں معیت حضرت شیخ الہند مرحوم موجود تھا۔ ان سب واقعات پر براہ راست مطلع ہوتا رہا۔ صورت یہ کی گئی کہ پہلے پہل جبکہ 1914ء کی جنگ عمومی میں چناق قلعہ کی چھ سات مہینوں تک بحری قوت نے جس پر انگریزوں کو بہت زیادہ اعتماد اور غرور تھا کوئی کامیابی حاصل نہیں کی اور منہ کی کھانی پڑی اور بیک بینی و دوگوش اپنے ہزاروں سپاہیوں کو فنا کرکے لوٹنا پڑا۔ ترکوں کی شجاعت اور بہادری سے انتہائی شرمندگی اٹھانی پڑی تو اپنی بہادرانہ لڑائی سے مایوس ہو کر پرانی چال عیاری اور ڈپلومیسی کو عمل میں لانا ضروری سمجھا گیا اور شریف مکہ (شریف حسین) سے نامہ و پیام اور ساز باز کیا گیا۔ مصر میں جرنیل میکموہن اور حجاز و عرب میں کرنیل لارنس اس کے مرکز تھے شریف حسین کو جمہوریہ عربیہ اور اس کی صدارت کا سبز باغ دکھایا گیا اور بے شمار اشرفیوں سے امداد کی گئی اور اپنے ولی نعمت ترکی کی غداری پر آمادہ کیا گیا۔ اولاً حجاز کا اقتصادی محاصرہ کرکے وہاں کے باشندوں کی آرام و زندگی کا میدان تنگ کر دیا گیا اور پھر شریف مذکور سے جو کہ بالکل ہمدم و ہمراز ہو گیا تھا بغاوت کا اعلان 5 جون 1916ء میں کرا دیا گیا۔ شریف کی بدوی فوجوں سے مدینہ منورہ اور جدہ طائف' مکہ معظمہ پر حملہ کرایا گیا۔ مگر یہ بدوی فوجیں ترکوں کی باقاعدہ مسلح فوجوں پر نہ غالب آ سکیں اور نہ ان کو ہتھیار رکھنے اور شہروں کے تخلیہ کرنے پر مجبور کر سکیں تو شریف حسین کی اس فرمائش پر کہ گولہ باری کی جائے۔ (جو بین الاقوامی معاہدوں کے خلاف تھی اور یہ کہ باقاعدہ فوج سے جدہ اور مکہ معظمہ پر حملہ کیا جائے) یہ حکم کیا گیا کہ اہل مکہ وجدہ سے ایک محضر دستخط کرا کر انگریزی بحری ذمہ داری کے پاس بھیجے کہ ہم کو ترکوں سے آزاد کراؤ۔ ہم سخت مجبور ہیں چنانچہ یہ عمل کیا گیا اور اس پر جبریہ طور سے سربر آور وہ اہلی شہر کے دستخط کرائے گئے اور کمانڈار بحری قوت کے پاس محضر بھیجا گیا اس کے پہنچنے کے بعد گولہ باری شروع کر دی گئی۔ چنانچہ کرنل لکھتا ہے۔

"1916ء میں شاہ حجاز کو ہم نے اتحادیوں کا ساتھ دینے پر آمادہ کیا"(30)

لندن ٹائم لکھتا ہے۔

"جدہ کے ساحل پر انگریزی جہازوں نے گولہ باری کی۔ نیز ٹائمز کا نامہ نگار لکھتا ہے۔

اس کاروائی نے مرتدین کی مدد کی۔ اگرچہ برطانوی فوج 3 ہزار فٹ یا

> زیادہ سے زیادہ تین ہزار گز کے فاصلے سے آگے نہیں بڑھ سکی اور بہت سی رکاوٹوں سے جن کا کوئی علاج نہ تھا گولہ باری کرنا سخت مشکل ہو گیا تھا۔ "

مگر اس تمام کاروائی کو ہندوستان سے بالکل چھپایا گیا۔ جب ہندوستان میں ایک عرصہ کے بعد خبریں پہنچیں تو چاروں طرف آگ بھڑک اٹھی۔ جو کہ سب کو معلوم ہے بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ افسوس کہ ان کھلی کھلی عہد شکنیوں اور غداریوں کے ہوتے ہوئے بھی تحریکات آزادی کی مخالفتیں عمل میں لائی گئیں۔

فالی اللہ المشتکی

حوالہ جات باب چہارم

1۔ ہندوستان کی سیاسی ترقی ص 5

2۔ ہندوستان اور عہد کمپنی کی صحیح تاریخ وائز آف دی کرسچیں پاور ان انڈیا مولفہ میجر بی۔ ڈی باسو جلد اول

3۔ ہسٹنگز اینڈ دی روہیلہ وار از حیات حافظ رحمت خاں ص 118

4۔ حکومت خود اختیاری ص 44

5۔ ایضاً ص 45

6۔ ہندوستان کی معاشی تاریخ جلد دوم ص 402

7۔ اخبار فتح مورخہ 15 اپریل 1921ء

8۔ حکومت خود اختیاری ص 61

9۔ مسلمانوں کا روشن مستقبل ص 369

10۔ ایضاً باب نہم ص 373

11۔ فوجی بغاوت از لفٹنٹ جنرل میک لوڈا مینس ص 37

12۔ مدینہ بجنور جلد 19 شمارہ نمبر 22 مورخہ 25 مارچ 1930ء

13۔ مدینہ بجنور مورخہ 28 اکتوبر 1941ء جلد 30 شمارہ نمبر 77

14۔ ایضاً

15۔ تقاریر و تحریرات سر ولیم ودربرن مطبوعہ نیشن پریس ص 120 از مسلمانوں کے افلاس کا علاج ص 14

16۔ ہندوستان کی معاشی تاریخ جلد دوم ص 288

17۔ ایضاً ص 299

18۔ حکومت خود اختیاری ص 38

19- ایضاً ص 37

20- حیات حافظ رحمت خان ص 199

21- ہمارے ہندوستانی مسلمان ص 195 - 194 - 193

22- ہمارے ہندوستان مسلمان ص 226

23- مسلمانوں کا روشن مستقبل ص 16

24- ماخوذ از سوانح لارڈ کلایو حکومت خود اختیاری ص 8

25- حکومت خود اختیاری ص 26

26- ایضاً ص 32

27- ایضاً

28- دادا بھائی ص 46

29- ان پیپی انڈیا ص 334

30- ڈیلی ایکسپریس لندن مورخہ 28 مئی 1920ء

پانچواں باب

سامراج کی توسیع پسندی اور سلطنت عثمانیہ کی بربادی

- کوئن وکٹوریہ کے اعلان 1858ء کی کھلی مخالفت
- انگریزوں کا انگلستان کے بحری راستہ کو اپنے لیے صاف کرنا
- ایشیائی و افریقی قوموں اور بادشاہوں کے خلاف سازشیں
- عہد نامہ پیرس کی خلاف ورزی
- مقدونیہ کی تقسیم و بدامنی اور مرزنگ پروگرام
- ترکوں کے انقلاب پر یورپ کا چراغ پا ہونا
- انقلاب کے بعد یورپ کا ترکوں پر پہلا وار
- ترکوں کی شکست کے اسباب
- حوالہ جات

پانچواں باب

سامراج کی توسیع پسندی اور سلطنت عثمانیہ کی بربادی

اس کی مختصر تفصیل یہ ہے کہ 1857ء کے اسباب انقلاب و جدوجہد آزادی میں سے ایک امر یہ بھی تھا کہ کمپنی نے مختلف ریاستوں پر خلاف معاہدہ قبضہ کر لیا تھا اور ہمیشہ توسیع مملکت اور فارورڈ پالیسی اس کے زیر نظر رہتی تھی جس کے ماتحت جنگ و جدل اور الحاق ممالک ہند شرمناک طریقوں اور حیلوں سے جاری رہتا تھا باوجود بہت سے اولیان ریاست کے انتہائی وفاداری امداد اور اطاعت کے پھر بھی الحاق کی پالیسی میں لائی جاتی تھی جیسا کہ اودھ اور اس کے والی نواب واجد علی شاہ اور جھانسی کی رانی وغیرہ کے ساتھ کیا گیا تھا اس لیے ہندوستانیوں کی بے چینی دور کرنے اور آئندہ کے خطرات کو مٹانے کی غرض سے یہ اعلان ضروری سمجھا گیا تھا جس کی بناء پر تمام والیان ریاست ہائے ہند مطمئن ہو گئے اور بیرون حدود برطانوی ہند کے رہنے والے باشندوں کو بھی یقین ہو گیا کہ انگریز آئندہ امن و امان سے رہیں گے اور ہماری مملکتیں محفوظ رہیں گی۔ مگر جوں ہی ذمہ داران برطانیہ کو اس اعلان کے بعد محسوس ہونے لگا کہ اب ہندوستانیوں کی بے چینی ہماری طرف سے دور ہو گئی ہے اور ہماری قوت اگر گرفت بھی مکمل ہو گئی ہے اسی وقت سے آنکھیں بدل لیں اور اس عہد نامہ کو ردی کی ٹوکری میں ڈالنا اور فارورڈ پالیسی کو زندہ کرنا ضروری معلوم ہونے لگا۔ سر بارتھ فیسر اور ان کی پارٹی نے فارورڈ پالیسی کے لیے پارلیمنٹ میں آوازیں بار بار اٹھائیں اور اپنے ہم خیال بنانے شروع کیے تاآنکہ اپنی اکثریت انہوں نے اس کی مخالفت کی اور اس کے خطرات اور مضرات کو ظاہر کیا۔ مگر ایک نہ سنی گئی اور برابر زور پڑتا رہا۔ چونکہ وہ اس پالیسی کو ہندوستان اور انگلستان کے لیے بہت مضر سمجھتے تھے اس لیے 1876ء میں استعفا دے کر انگلستان واپس چلے گئے اور ان کی جگہ پر لارڈ لٹن آئے وہ اس پالیسی کے موافق تھے چنانچہ انہوں نے آتے ہی کابل کو مشن بھیجا اور بالآخر 1880ء کی

کابل کی چڑھائی عمل میں آئی جس میں برطانیہ اور گورنمنٹ ہندوستان کو بہت زیادہ جانی اور مالی نقصان برداشت کرنا پڑا دو کروڑ پونڈ اس مہم میں خرچ ہوا جس میں سے برطانیہ نے اپنے انگلینڈ کے خزانہ سے صرف پچاس لاکھ پونڈ اور باقی ڈیڑھ کروڑ پونڈ ہندوستان کے سر ڈالا گیا۔ پھر بھی کامیابی کا منہ دیکھنا نصیب نہ ہوا۔

باوجودیکہ 1858ء میں کوئن وکٹوریہ اور دارالعوام اور دارالخواص اور انگلستان کی مذہبی جماعت کے سربرآوردہ لوگوں کے اتفاق سے منجملہ دیگر وعدوں کے یہ وعدہ پختہ طور پر کیا گیا تھا کہ ہم آئندہ کسی دوسرے ملک پر قبضہ اور دست درازی نہ کریں گے۔ مترجم کے الفاظ حسب ذیل تھے۔

> "جو ملک بالفعل ہمارے قبضہ میں ہے اسے زیادہ کرنا نہیں چاہتے اور جب ہم کو یہ گوارا نہیں ہے کہ کوئی شخص ہماری مملکت یا حقوق میں دست اندازی کرے تو ہم بھی پیش قدمی کی اپنی طرف سے بہ نسبت ملکیت یا حقوق اوروں کے اجازت نہ دیں گے اور والیان ہند کے حقوق و منزلت اور عزت مثل اپنے حقوق و منزلت اور عزت کے عزیز سمجھیں گے۔"

مگر کیا اس پر عمل کیا گیا۔ واقعات مندرجہ ذیل اس پر روشنی ڈالیں گے۔

(1) 1865ء میں دوار آف بھوٹان پر قبضہ کرکے برطانوی ہند سے الحاق کیا گیا۔

(2) 1885ء میں برہما کا شمالی حصہ فتح کرکے سلطنت میں شامل کیا گیا۔

(3) 1890ء میں منی پور انگریزی انتظام میں لیا گیا۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد پھر ہندوستانی ریاست زیر سایہ برطانیہ بنا دیا گیا۔

(4) 1895ء میں چترال پر چڑھائی کی گئی اور تمام علاقہ سلطنت میں شامل کیا گیا۔

(5) تیرہ کی سرحدی مہم بھی اسی سال میں واقع ہوئی۔

(6) 1880ء میں کابل کی دوسری لڑائی کی گئی جس میں چالیس لاکھ پونڈ خرچ ہوا۔

(7) 1897ء میں پھر جنگ سرحد کی گئی جس میں بیالیس لاکھ پونڈ خرچ ہوا۔

(8) 1898ء میں تبت اور چین پر حملہ کیا گیا جس میں ایک لاکھ بیس ہزار پونڈ خرچ ہوئے۔

(9) 1863ء سے 1868ء اور ستھانہ اور ان مقامات پر حملوں کا ذکر کر چکے ہیں جہاں آزادی ہند کے متوالے حضرت سید احمد صاحب شہید رحمتہ اللہ علیہ کے تابعداروں کا

قیام رہتا تھا۔

غرضیکہ ہندوستان کی بیرونی حدود پر رہنے والے قبائل اور ممالک جو کہ 1857ء تک کے مقبوضہ ممالک سے باہر تھے۔ حملہ کرنے اور ان کے برباد اور کمزور کرنے کے بے شمار واقعات جاری کئے گئے۔ بلوچستان، یاغستان، (آزاد قبائل کا ملک) افغانستان تبت، چین، برہما وغیرہ پر برابر فوج کشی جاری رہی جس سے ہمیشہ ہندوستانی فوجیں، ہندوستانی خزانے، ہندوستان رسد وغیرہ موت کے گھاٹ اترتے رہے اور پڑوس کے ممالک اور قوموں کی بربادی ہوتی رہی ان کو ہندوستان اور باشندگان ہند سے بغض و عداوت بڑھتی رہی۔ اور اس طرح انگریزوں کی غلامی ہندوستانیوں کے لیے مضبوط ہوتی گئی۔ مندرجہ بالا واقعات تو بڑی بڑی جنگوں کے ہیں جن میں اس قدر مصارف واقع ہوئے کہ ہندوستانی قومی قرضہ کی نوبت آئی ورنہ ایسی مہمات جن میں قرض لینا، نہیں پڑا وہ تو بے شمار ہیں۔ آفریدیوں، مسعودیوں، مہمندیوں، وزیریوں اور دیگر قبائل سے آئے دن فارورڈ پالیسی کی بناء پر چھیڑ چھاڑ عمل میں لائی جاتی اور پھر ان پر فوج کشی عمل میں لائی جاتی تھی۔ جس سے ان بہادر قوموں کو فنا کرنا، ہندوستان پر اپنے تسلط اور اقتدار کو مضبوط بنانا۔ باہر سے آنے والے خطرات کے لیے تحفظ اور سد راہ کی صورتیں پیدا کرنا اصلی مقصد تھا۔ ورنہ یہ ممالک ایسے زرخیز نہ تھے جن کے لیے اس قدر مصارف برداشت کئے جائیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ تمام کاروائیاں شہنشاہیت (برٹش ایمپائر) کے لیے عمل میں لائی جاتی رہتی تھیں اور برطانوی قوم اور ملک کا کوئی نقصان جانی یا مالی نہیں ہوتا تھا۔ آدمی ہندوستان کے مرتے تھے خزانہ ہندوستان کا کھپتا تھا۔ دوسرے نقصانات بھی ہندوستان کے ہوتے تھے اور برٹش اقتدار روز افزوں ہوتا رہتا تھا۔ ہندوستان پر آہنی پنجہ اور اس کی گرفت روز افزوں زیادہ ہوتی رہتی تھی۔ اس لیے کانگریس اور بیدار مغز ہندوستانی اس عملدرآمد کو ملک کے لیے انتہائی خطرناک سمجھتے تھے۔ فوجی مصارف کے بارگراں کی بناء پر ہندوستانیوں پر ٹیکس آئے دن بڑھائے جاتے تھے۔ اندرون ملک کی ضروریات کے لیے بجٹ میں روپیہ نہ ہونے کا بہانہ کرکے رعایا کی ضرورت داخلیہ کی انجام دہی سے معذوری ظاہر کی جاتی تھی۔ 1885ء میں جبکہ کانگریس کا پہلا اجلاس ہوا تو ایک ریزولیشن میں فوجی مصارف کی تخفیف کا مطالبہ کیا گیا۔ اور اس کے بعد کے اجلاس میں مندرجہ ذیل تجویز پاس کی گئی۔

"سرحد کی پیش قدمی کی پالیسی سلطنت برطانیہ کے لیے اور بالخصوص

> ملک ہندوستان کے مفاد کے لیے مضرت رساں ہے کیونکہ اس کی وجہ سے ہندوستان کی حدود کے باہر فوجی مہمات بھیجنی پڑتی ہیں جس سے قیمتی جانیں تلف ہوتی ہیں اور رعایا کا روپیہ ضائع ہوتا ہے۔ اس لیے کانگریس مستدعی ہے کہ اس جارحانہ کاروائی کو بند کیا جائے۔ اور یہ امر قرار دیا جائے کہ درآں حالیکہ یہ مہمات شاہی اغراض کے لیے ضروری سمجھی جائیں تو ان کے صرف کا بڑا حصہ سلطنت برطانیہ کے خزانہ سے ادا کیا جائے۔"

نیز اس قرارداد کے بعد دوسری قرار داد میں کانگریس نے گورنمنٹ کی پیش قدمی کی پالیسی پر اظہار افسوس کرتے ہوئے کہا کہ

> سرحدیوں کے ساتھ پرانی دوستانہ پالیسی کی طرف رجوع کیا جائے اور وادی سوات میں جو کثیر اخراجات کئے جاتے ہیں انہیں بند کیا جائے۔

چونکہ کانگریس کے سمجھ دار ممبر اور بیدار مغز لوگ سمجھ رہے تھے کہ یہ کاروائی ہندوستانیوں کی غلامی کو بڑھانے اور مضبوط کرنے اور ان کی آزادی کو زیادہ سے زیادہ دور بلکہ مستحیل بنانے کے لیے کی جا رہی ہے۔ اور اس سے ہندوستان روز بروز کمزور ناتواں اور غریب ہوتا جا رہا ہے للہٰذا اس کی مخالفت کرنا ضروری ہے مگر سادہ لوح مسلم افراد جو کہ سرسید کے تابعدار اور مسٹر بیگ کے جادو میں پھنسے ہوئے تھے وہ اس قسم کی تجویزوں کے مخالف رہے۔ یہ بھی نظر اٹھا کر نہ دیکھا کہ اس فارورڈ پالیسی کے عمل میں آنے سے کیا مسلمانوں ہی کی بربادی نہیں ہو رہی ہے؟ ہندوستان کی مغربی و شمالی سرحد پر تو صرف مسلمان ہی آباد تھے اس پیش قدمی سے ہر روز انہیں موت کے گھاٹ اتارا جاتا ہے انہیں کے مال اور گھروں کو نیست و نابود کیا جا رہا ہے نیز زمانہ سابقہ میں آزادی کے لیے اس راستہ ہی سے ہمیشہ کامیابی ہوتی رہتی تھی۔

مگر افسوس کہ ان مسحورین برطانیہ کی آنکھیں اس وقت نہ کھلیں۔ افغانستان پر انگریزوں نے چار مرتبہ چڑھائی کی۔ اگر علاقہ پہاڑی اور وہاں کے باشندے بہادر اور جنگجو نہ ہوتے اور انگریز کو یہ خطرہ نہ ہوتا کہ روس سے بلاواسطہ اور آمنے سامنے لڑائی کہیں نہ کرنا پڑ جائے تو بہت ممکن تھا کہ مثل ہندوستان افغانستان بھی غلامی کی ہولناک دلدل میں پھنس جاتا انگریز چاہتا تھا کہ میرے اور روس کے درمیان میں افغانستان لوہے کی دیوار بنا

رہے چنانچہ ہندوستان کے خزانہ سے عرصہ دراز تک ایک معقول رقم امیر افغانستان کے لیے جاری رہی جس کو امیر عبدالرحمن خاں مرحوم جزیہ سے تعبیر کیا کرتے تھے۔ بہرحال انگریزوں نے اپنی ان حدود سے جو کہ 1857ء میں تھیں ہر طرف آگے بڑھ کر وہاں کے باشندوں کو غلام اور ان کے ملکوں کو اپنے اقتدار اور تسلط کی آماجگاہ بنالیا۔ صرف افغانستان میں مذکورہ بالا وجوہ سے پوری کامیابی نہ ہو سکی۔ تاہم اس کو ہندوستان کی تمام حدود کی طرف سے اطمینان ہو گیا۔

انگریز کا انگلستان کے بحری راستہ کو اپنے لیے صاف کرنا

چونکہ انگلینڈ سے ہندوستان آنے کے لیے اس زمانہ میں بجز بحری راستے کے اور کوئی راستہ نہیں تھا اور قدیمی راستہ ساؤتھ افریقہ کا بہت دور پڑتا تھا اس لیے انگریزوں نے جبرالٹر سے بمبئی تک کے لیے اپنے تسلط کی ہمیشہ انتہائی کوششیں جاری رکھیں۔ سلطان عبدالمجید خاں مرحوم 1839ء میں تخت نشین ہوئے۔ محمد علی پاشا اس سے پہلے بغاوت کر کے فلسطین اور شام کے علاقوں پر قابض ہو چکے تھے اور ترکی بیڑہ فوضی پاشا کی خیانت کی بناء پر محمد علی کے قبضہ میں آچکا تھا اس لیے سلطان کے لیے نہایت سخت دقتوں کا سامنا تھا انگریزوں اور ان کے حلفاء کی امداد سے ترکوں کو کامیابی اور محمد علی پاشا کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تھا اور اس بناء پر سلطان عبدالمجید سے دوستانہ تعلقات قائم ہو گئے تھے(حالانکہ یہ انگریزوں کی امداد اپنے مقاصد ہی کے لیے تھی اور حالانکہ انگریزوں نے صرف جہازوں سے مدد کی تھی تمام جنگی کاروائیاں ترکی فوجیں ہی کر رہی تھیں۔ مگر انگریزوں نے اس دوستی سے بہت سے عظیم الشان فوائد حاصل کیے۔

منجملہ فوائد ایک فائدہ عدن پر قبضہ تھا جو کہ محض کوئلہ کے مخزن کے نام سے طلب کیا گیا تھا۔ سلطان مرحوم نے ظاہر کیا کہ ہمارے جہازوں کی آمدو رفت کے لیے عدن میں کوئلہ کا مخزن ضروری ہے وہاں سے ہندوستان کی بندر گاہیں بہت دور پڑتی ہیں۔ جہازوں کے آتے وقت اور اسی طرح جاتے وقت جہازوں میں کوئلہ اور پانی کا ذخیرہ ختم ہو جاتا ہے نیز وہ ایک ایسا مرکزی مقام ہے جہاں سے ہر طرف کی آمدورفت اور تجارتی تعلقات اور کاروبار ہو سکتے ہیں اس کے لیے عدن میں ایسے مخزن کے لیے زمین اور اجازت دیجائے چنانچہ فرمان شاہی ہو گیا۔ مگر انگریزوں نے بجائے مخزن کے تمام شہر اور اس کے گرد ونواح کے علاقوں پر رفتہ رفتہ قبضہ کر لیا عدن ایک عظیم الشان بندر گاہ اور جنگی مرکز ہو گیا۔ اس کے بعد باب المندب پر بھی قبضہ کیا گیا جس کے لیے سومالی لینڈ اور سوڈان اور مصر تک کی کوششیں کی گئیں اور 1885ء میں اس لڑائی کا خاتمہ ہوا جس کی تفصیل تو بہت زیادہ طویل ہے جو کہ مختلف تاریخی کتابوں میں درج ہے۔ مگر ہم نہایت اختصار کے ساتھ یہ عرض کرتے ہیں کہ پہلے پہل انگریز "راس امید" کے راستے سے جو کہ جنوبی افریقہ کا چکر کاٹ کر ہندوستان پہنچتا ہے آمدورفت رکھتے تھے اس راستہ کی مسافت بہت طویل ہے اس

لیے جبکہ 1869ء میں نہر سوئز کو اسماعیل پاشا خدیو مصر نے کھدوا کر اس کا افتتاح کیا۔ تو انگریزوں کی آنکھیں کھلیں۔ انگریز مدبرین اس کی تعمیر کو ناممکن خیال کرتے تھے اس لیے انہوں نے ابتداء سے اس میں کسی قسم کی دلچسپی نہیں لی مگر جب یہ تیار ہو گئی تب اس کی اہمیت سمجھی گئی اور اس پر قبضہ کرنے کی کوشش طرح طرح سے عمل میں آنی شروع ہوئیں۔

انگریزوں نے اسماعیل پاشا سے خفیہ معاوہ کرکے اسماعیل کے تمام حصے اونتالیس لاکھ چھہتر ہزار پانچسو بیاسی (39,76,582) پونڈ میں خرید لیے اور اس کے بعد مختلف طریقوں سے مصر میں مداخلت کرنے لگے جس کی تفصیل (تاریخ دولت عثمانیہ مصنفہ مسٹر محمد عزیز صاحب ایم' اے علیگ جلد ثانی صفحہ 212 تا 243 پر درج ہے۔ بالآخر انگریزوں نے 11 جولائی 1882ء میں اسکندریہ پر بمباری کی اور انتہائی خفیہ اور علانیہ سازشوں اور غداریوں کے ساتھ اس جنگ کو دو برس تک جاری کرکے عرابی پاشا کو قید اور توفیق پاشا کو برسر اقتدار اس طرح لائے کہ وہ ان کے ہاتھ میں بالکل کٹھ پتلی تھا۔ مورخ مذکور مسٹر عزیز مندرجہ ذیل الفاظ اس جنگ کے نتیجہ کے متعلق لکھتے ہیں۔

توفیق برٹش سنگینوں کے سایہ میں اسکندریہ سے قاہرہ آیا اور برطانیہ کی سرپرستی میں عنان حکومت ہاتھ میں لی۔ شریف پاشا نے وزارت قائم کی۔ نئے دور کا افتتاح یوں ہوا کہ وطنی تحریک کے علم بردار باغیوں کی حیثیت سے عدالت میں لائے گئے۔ عرابی پاشا کے لیے سزائے موت تجویز ہوئی لیکن مسٹر بلنٹ نے ایک کثیر رقم اپنی جیب سے خرچ کرکے اس مقدمہ کی پیروی جس انگریز بیرسٹر کے سپرد کی تھی اس نے صفائی میں ایسی شہادتیں پیش کیں کہ خدیو کو موت کی سزا منسوخ کردینی پڑی تاہم عرابی پاشا تمام عمر کے لیے جلاوطن کرکے سیلون بھیج دیئے گئے۔ انگریز نے جس آسانی کے ساتھ مصر پر قبضہ پالیا تھا اس کے لحاظ سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی تھی کہ وہ ملک کی حکومت توفیق کے حوالہ کرکے خود واپس چلے جائیں گے۔ تل الکبیر کے بعد ہی انہوں نے مصر پر اپنا تسلط قائم کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور اب وہ مالیاتی امور کے انتظام میں بھی فرانس کو شریک کرنے پر تیار نہ تھے۔ توفیق ان کے ہاتھ میں کٹھ پتلی کی طرح کام کر رہا تھا اس نے ایک ”انگریز کالوین“ کو اپنی حکومت کا تنہا مشیر مال مقرر کیا لارڈ ڈفرن جو اس وقت قسطنطنیہ میں برطانوی سفیر تھا بحیثیت ہائی کمشنر کے مصر آیا اور حکومت کے آئندہ انتظام کا خاکہ مرتب کر گیا۔ اس خاکہ کی تفصیلی

خانہ پری سر ایولین بیرنگ" کے سپرد ہوئی جس نے جنوری 1884ء میں بحیثیت قونصل جنرل کے چارج لیا یہی شخص ہے جو بعد میں لارڈ کرومر کے نام سے مشہور ہوا اس کے آنے کے بعد مصر گویا سلطنت برطانیہ کا ایک صوبہ بن گیا۔ ملک کے ہر معاملہ میں برٹش جنرل قونصل کی رائے فیصلہ کن تھی۔ مصری فوجیں انگریزی افسروں کے زیر کمان کر دی گئیں۔ انگریزی فوجیں جن کی تعداد چھ ہزار تھی پورے ملک پر اپنا تسلط قائم کر چکی تھیں۔ برطانیہ نے اعلان کیا کہ مصر کی مالی حالت کے درست ہو جانے کے بعد انگریزی فوجیں واپس بلائی جائیں گی۔ لیکن مالی حالت روز بروز خراب ہوتی چلی گئی اور حکومت برطانیہ کی فرض شناسی نے کس طرح گوارا نہ کیا کہ غریب مصریوں کو اپنے سایہ عاطفت سے محروم کر دے۔"(1)

بہرحال اس جنگ مصر اور سوڈان میں جو کچھ خرچ ہوا چونکہ ہندوستان اور انگلستان کے درمیانی راستہ کے تحفظ کا ذریعہ تھا اس لیے وہ سب ہندوستان کے سر منڈھا گیا اور مبلغ ایک کروڑ پچاس لاکھ پونڈ ہندوستان کے انڈین نیشنل ڈیٹسٹ (ہندوستانی قومی قرضہ) میں ڈالا گیا۔ جس کا سود ہمیشہ ہندوستان ادا کرتا رہا۔ اس جنگ میں ہندوستانی فوج کے بے شمار آدمی جو کہ قتل کیئے گئے یا زخمی ہوئے اور جو بے شمار سامان رسد و ہتھیار وغیرہ خرچ ہوا وہ سب اس نقد کے علاوہ ہے۔

اور چونکہ جنوبی افریقہ کے ممالک ٹرانسوال وغیرہ بھی ہندوستان اور انگلستان کے راستہ میں واقع ہیں قدیمی راستہ راس امید کا انہیں ممالک سے گزرتا ہے۔ انگریز اسی راستہ سے ہندوستان آئے تھے اور نہر سوئز سے پہلے یعنی 1869ء سے قبل انہیں ملکوں پر ہوتے ہوئے آمدورفت ہوا کرتی تھی اس لیے ان ملکوں کا تحفظ بھی ہندوستان ہی کے ذمہ قرار دیا گیا۔ چنانچہ 1900ء میں جبکہ ساؤتھ افریقہ میں بغاوت ہوئی اور بویر کی لڑائی ظہور پزیر ہوئی تو اس کا خرچہ جو کہ دو کروڑ ساٹھ لاکھ (2,60,000,00) پونڈ تھا وہ بھی ہندوستان ہی ڈالا گیا اور ہندوستان کے قومی قرضہ میں محسوب ہوا۔ جس کا سود در سود ہندوستان برابر ادا کرتا رہا۔ جانی اور مالی مصارف اس کے علاوہ تھے۔

یہ قومی قرضہ (انڈین نیشنل ڈیٹس) 1857ء تک 5 کروڑ دس لاکھ پونڈ تھا۔ 1862ء میں 9 کروڑ ستر لاکھ پونڈ تک اور پھر 1901ء میں بیس کروڑ پونڈ تک پہنچ گیا۔ (2)

اسی قومی قرضہ کی بنیاد جنگ پلاسی 1757ء میں رکھی گئی تھی ہندوستان کے لیے

(انگریزوں کے دعووں پر) جہاں بھی لڑائیاں ہوئیں خواہ ہندوستان کے اندر یا باہر وہ سب ہندوستان کے سر تھوپی گئیں تھیں۔ اور ان کا صرفہ ہندوستان سے وصول کیا جاتا رہا۔ اور جو کچھ لوٹ میں وصول ہوتا تھا خواہ وہ کتنا بھی قیمتی ہوتا تھا وہ سب غنیمت شمار ہوتا رہا اس کی کوئی گنتی نہیں ہوئی چنانچہ

1757ء میں جنگ پلاسی میں	30 لاکھ 25 ہزار پونڈ
1782ء میں جنگ میر قاسم نواب بنگالہ میں	52 لاکھ پونڈ
1807ء میں جنگ مرہٹہ میں	2 کروڑ 10 لاکھ پونڈ
1829ء میں جنگ کابل اول میں	38 لاکھ پونڈ
1842ء میں جنگ نیپال میں	10 لاکھ پونڈ
1857ء جنگ آزادی ہند میں معہ جملہ مصارف و حصص کمپنی	4 کروڑ ساٹھ لاکھ پونڈ

یہ سب اسی قرضہ میں شمار کئے گئے اور ہندوستان کے سر مڑھے گئے۔ ہندوستان ہمیشہ مقروض رہ کر سود ادا کرتا رہا۔" اس قرضہ عامہ کی مقدار 1912ء میں ہندوستان پر چودہ ارب چودہ کروڑ تھی۔ ہندوستان کے قرضہ عامہ کا جزو اعظم انگریزوں سے انگلینڈ میں لے کر حکومت ہند کو دیا گیا اور سالانہ سود ہندوستان سے وصول کر کے اہل انگلینڈ کو دیا جاتا رہا چنانچہ سولہ کروڑ پندرہ لاکھ سے زائد روپیہ صرف ایک سال سنہ 12 - 1911ء میں ہندوستان نے انگلستان کو محض بطور سود قرض عامہ ادا کیا۔" (3)

> "ہندوستانی قرض عامہ کی بنیاد 1857ء سے پڑی جبکہ کمپنی سے ہندوستان خریدنے کی قیمت اور غدر فرد کرنے کے کل مصارف (4 کروڑ ساٹھ لاکھ پونڈ ہندوستان سے وصول کرنے قرار پائے (مگر دت لکھتا ہے کہ اس کی بنیاد 1757ء یعنی جنگ پلاسی سے پڑی) یہ کل رقم بطور قرض عامہ انگلستان میں لے کر ہندوستان کے نام لکھ دی گئی اور اس روز سے آج کے دن تک ایک رقم بطور سود ہندوستان سے انگلستان وصول کرتا رہا ہے۔ ذرا خیال تو کرو کہ گزشتہ نصف صدی (بقول دت ڈیڑھ صدی سے زائد) میں ہندوستان کتنی رقم بطور سود انگلستان کو ادا کر چکا ہو گا۔" (4)

ہندوستان سے وہ بے شمار دولت جو لوٹ کر انگلستان پہنچائی گئی تھی جس کا تذکرہ ہم پہلے کر چکے ہیں اور جس کو پراسپرس برٹش انڈیا میں مسٹر ڈگبی نے اور بروکس وغیرہ نے ”مال خزانوں‘ کروڑوں آدمیوں کی صدیوں کی کمائی اور تمام دولت یورپ کے مجموعی خزانوں سے زیادہ لکھا ہے وہ کسی حساب میں نہیں لائے گئے۔)

اسی حفاظت راہ ہندوستان کے سلسلہ میں بحر ابیض (بحر روم) کو زیر تسلط اور اقتدار رکھنے کی غرض سے جزیرہ سائپرس (قبرص) پر قبضہ کرنا اور اپنی بحری قوت کا مرکز بنانا ضروری سمجھا گیا۔ چنانچہ باب عالی (سلطان عبدالحمید خاں مرحوم) سے 1778ء میں ایک خفیہ معاہدہ کے ذریعہ حاصل کیا گیا۔ جو کہ معاہدہ سان اسٹیفانو کی تنسیخ اور معاہدہ برلن کے انعقاد کے وقت بصورت امداد و دولت علیہ واقع ہوا تھا۔ یہ جزیرہ معاہدہ برلن میں اس وقت تک کے لیے حوالہ برطانیہ کیا گیا جب تک روس گزشتہ جنگ کی ایشیائی فتوحات سے اپنا قبضہ نہ اٹھا لے نیز یہ جزیرہ برطانیہ کو اس غرض سے دیا گیا تاکہ وہ روس کے مقابلہ کے لیے وہاں سامان جنگ تیار رکھ سکے۔ سلطان کی فرمانروائی کا حق قائم رکھنے کے لیے سالانہ خراج کی ادائیگی ضروری قرار دی گئی۔(5)

بالآخر یہ جزیرہ جو کہ تین سو برس سے ترکی سلطنت میں چلا آتا تھا اور زرخیز تھا اور بحیرہ روم میں بحری قوت کی مرکزیت کی شان رکھتا تھا انگریز ڈپلومیسی کی نذر بن گیا۔ اس کے علاوہ جبرالٹر اسپین سے اور مالٹا جمہوریہ وینس سے حاصل کیا گیا جس کی تفصیل کتب تاریخ میں موجود ہے۔ بہر حال بحیرہ روم پر برطانیہ نے مغربی کنارہ سے مشرقی کنارہ اور وسط پر پورا قبضہ کر لیا۔ واضح ہو کہ جبرالٹر اس بحیرہ کے مغربی سرے پر ہے اور سائپرس (قبرص) مشرقی سرے پر ہے۔ اور مالٹا وسط میں واقع ہے۔ مالٹا کو شہنشاہی برطانوی بیڑہ کا مرکز بنایا گیا جس کے بڑے مصارف کا بوجھ ہندوستان پر رکھا گیا اور یہ ہی کہا گیا کہ یہ بیڑہ ہندوستان کا ہے اور اسی کے لیے ہم نے رکھ رکھا ہے۔ ہندوستان کے لیے بحیرہ روم میں حفاظت اور راستہ کا امن و امان فوجوں اور تجارتی جہازوں کی حفاظت یہی کرتا ہے۔ کچھ بحری قوت سائپرس میں اور کچھ جبرالٹر میں بھی ہمیشہ رکھی گئی۔ مگر اس پر کفایت نہیں کی گئی بلکہ ہمیشہ اس کی کوشش جاری رہی کہ بحر ابیض کے سواحل پر ہمارا یا ہمارے یورپین حلیفوں کا قبضہ ہو جس کی کچھ تفصیل ہم عنقریب ذکر کریں گے۔

ایشیائی و افریقی قوموں اور بادشاہوں کے خلاف سازشیں

انگریزوں نے قوت پاتے ہی تمام ایشیائی اور افریقی ممالک کو غلام بنانے اور اپنے جبروت و اقتدار کے ماتحت کچلنے اور ان کو لوٹ کر اپنے ملک اور قوم کو تنومند اور موٹا بنانے اور تمام باشندگان ایشیاء و افریقہ کا خون ہمیشہ چوستے رہنے کی کوششیں شروع کر دیں- بالخصوص جبکہ 1857ء میں اپنے جبرو استبداد کا وحشیانہ مظاہرہ کرنے کے بعد انہوں نے تمام ہندوستان کو اپنے گمان میں فنا کر دیا تھا تو دوسرے ممالک پر انتہائی چالاکی اور عیاری کے ساتھ چل پڑے سب سے زیادہ انہوں نے حکومت عثمانیہ (ترک) کو اپنے تیرو نشتر کا نشانہ بنایا اور اسی طرح ایران، چین، ہند چینی، جاوا، برہما، سماٹرا، وغیرہ اور افریقہ کے سواحل اور ممالک پر چیرہ دستی شروع کی- مگر اس کی تفصیل کے لیے ضخیم ضخیم مجلدات درکار ہیں ہماری مختصر تالیف اس کی متحمل نہیں ہے- تاہم ہم مختصر نوٹ سلطنت عثمانیہ وغیرہ کے بارے میں پیش کرتے ہیں تاکہ ناظرین اس سے برطانیہ کی نیت اور طرز عمل سے وہ امور اندازہ کرلیں جن کا حضرت شیخ الہند رحمتہ اللہ علیہ نے اندازہ کیا تھا-

اس مقام پر ہم اقوام یورپ اور ترکی کی پرانی تاریخ کو پیش کرنے سے اعراض کرتے ہوئے صرف 1856ء سے واقعات کو اجمالاً شروع کرتے ہیں جبکہ برطانیہ کو کافی اقتدار اور قوت حاصل ہو گئی تھی- 25 فروری 1856ء کو پیرس میں ایک معاہدہ کی مجلس منعقد ہوئی جس میں دولت عثمانیہ، فرانس، انگلستان، روس، آسٹریا، سارڈینیا کے نمائندے شریک ہوئے آخر میں پرشیا کو بھی شریک کر لیا گیا تھا- ایک ماہ کے بحث و مباحثہ کے بعد 30 مارچ 1856ء کو صلح نامہ پیرس مرتب ہو اور مذکورہ بالا سات حکومتوں کے نمائندوں نے اس پر دستخط کئے- اس کی خاص دفعات حسب ذیل تھیں-

(1) ان حکومتوں نے دولت عثمانیہ کو باضابطہ طور پر مجلس دول یورپ کا رکن بنا لیا اور اس کی آزادی اور اس کے مقبوضات کی سالمیت کے لیے متحدہ طور پر ضمانت دی-

(2) سلطان نے بلا امتیاز نسل و مذہب تمام رعایا کی اصلاح حال کا وعدہ کیا اور یورپین حکومتوں نے صراحت کے ساتھ اعلان کیا کہ سلطنت عثمانیہ کے اندرونی معاملات میں دخل

پیرس کے کسی جزو کی خلاف ورزی جنگ کا سبب قرار دیجائے گی۔

دینے کا مجموعی یا انفرادی طور پر انھیں کوئی حق حاصل نہ ہوگا۔

(3) بحر اسود تمام قوموں کے تجارتی جہازوں کے لیے کھول دیا گیا لیکن جنگی جہازوں کا داخلہ ممنوع قرار پایا۔ روس اور دولت علیہ کو اس کے ساحلوں پر اسلحہ خانہ قائم کرنے کی بھی ممانعت کر دی گئی۔

(4) وہ تمام علاقے جو دوران جنگ میں فریقین نے فتح کر لیے تھے واپس کر دیئے گئے چنانچہ قارص دولت علیہ کے حوالہ کر دیا گیا۔ اور کریمیا روس کے۔

(5) ایک بین الاقوامی کمیشن کی نگرانی میں دریائے ڈینیوب بھی تمام قوموں کے جہازوں کے لیے کھول دیا گیا۔

(6) جنوبی بسرابیا کا علاقہ جس پر روس نے قبضہ کر لیا تھا مولڈیویا میں شامل کر دیا گیا مولڈیویا اور ولاچیا کی ریاستوں پر باب عالی کی فرمانروائی بدستور رکھی گئی۔ روس ان ریاستوں کے حق سے جس کا وہ بلا شرکت غیرے دعوے دار تھا دست بردار ہو گیا۔ اور ان کے حقوق کا تحفظ مذکورہ حکومتوں نے مجموعی طور پر اپنے ذمہ لے لیا۔ ان ریاستوں کو حکومت خود اختیاری کے حقوق عطاء کئے گئے۔ انھیں مذہب قانون سازی اور تجارت کی پوری آزادی اور ایک قومی مسلح فوج رکھنے کی اجازت دی گئی۔

(7) سرویا کو بھی یہی حقوق دیئے گئے۔ البتہ قومی فوج رکھنے کی اجازت اسے نہ ملی۔ اس کے اندرونی معاملات میں باب عالی کی فوجی مداخلت دول یورپ کی اجازت کے بغیر ممنوع قرار دی گئی۔

ضمنی معاہدے

صلحنامہ پیرس کے تکملہ کے بعد اسی روز دو معاہدے اور مرتب ہوئے۔ ایک کی رو سے سن 1814ء کے معاہدہ کی تجدید کی گئی اور دردانیال اور آبنائے باسفورس میں غیر حکومتوں کے جنگی جہازوں کا داخلہ بند کر دیا گیا۔ دوسرا صرف زار اور سلطان کے درمیان ہوا جس کی بناء پر ہر فریق کو چھ چھوٹے اسٹیمر اور چار ہلکی کشتیاں بحر اسود کی ساحلی ضروریات کے لئے رکھنے کی اجازت دی گئی۔

15 اپریل کو ایک عہد نامہ اور ہوا۔ جس میں برطانیہ' آسٹریا' فرانس نے مجموعی اور انفرادی طور پر دولت عثمانیہ کی آزادی اور سالمیت کو قائم رکھنے کی ضمانت لی اور عہد کیا کہ صلحنامہ

عہد نامہ پیرس کی خلاف ورزی

(1) 1870ء میں روس نے صلحنامہ پیرس کی خلاف ورزی کی اور اعلان کرتے ہوئے بحرا سود میں جنگی جہازوں کے ذریعہ اپنا تسلط پھر قائم کر لیا۔

(2) اور سن 1878ء میں بسرا بیا کا وہ علاقہ جو 1856ء میں اس سے لے کر مولڈیویا میں شامل کر لیا گیا تھا واپس لے لیا اس وقت دول عظمیٰ میں سے کسی نے بھی صلحنامہ پیرس کی پرواہ نہ کی جس کی رو سے متفقہ طور پر انہوں نے سلطنت عثمانیہ کی سالمیت کی ضمانت دی تھی۔

(3) مالڈیویا اور ولاچیا کی ریاستوں میں اتحاد و استقلال کی تحریک پیدا کی گئی اور 1858ء میں دول یورپ کی زیر حمایت انگزنڈر کوزا کو ان متحدہ ریاستوں کا پہلا امیر منتخب کیا گیا۔

(4) اس کے بعد کریٹ، سرویا، مونٹی نگرو، بوسینا، ہرزی گونیا، بلغاریا میں بغاوت کی شورشیں برپا کرائی گئیں۔ معاہدہ پیرس پر دستخط کرنے والی حکومتوں میں سے کسی نہ کسی کی ہر ایک کو حمایت حاصل تھی۔ دولت علیہ کے مقبوضات کی حفاظت کا عہد ان شورشوں کے ساتھ پورا کیا گیا اور جب ان بغاوتوں کے فرو کرنے کے لیے عثمانی فوجیں روانہ کی جانے لگیں تو یورپین حکومتوں نے انہیں روکنے کی کوششیں کیں۔ چنانچہ فرانس اور روس نے 1858ء میں اپنے جہاز مانٹی نگرو کے ساحل پر اس لیے بھیجے تاکہ عثمانیہ فوجوں کو اس علاقہ میں داخل ہونے سے روکیں۔

(5) 1858ء میں کریٹ کے یونانیوں نے علم بغاوت بلند کیا۔ یہ فتنہ وقتی طور پر دفع کر دیا گیا۔ لیکن 1896ء میں سلطان عبدالعزیز خان کے دور حکومت میں زیادہ قوت کے ساتھ پھر ابھرا اور اب کی مرتبہ حکومت خود اختیاری کے مزید حقوق دے کر باغیوں کو راضی کرنا پڑا

(6) جولائی 1858ء میں جدہ کے عیسائیوں اور مسلمانوں میں جھگڑا ہوا۔ چند مسلمانوں نے فرانسیسی قونصل اور اس کے اسٹاف پر حملہ کر دیا۔ جس میں قونصل اور اس کا سکریٹری مجروح ہوا اور قونصل کی بیوی ماری گئی۔ فورا ہی انگریزی اور فرانسیسی بیڑے قسطنطنیہ پہنچے۔ باب عالی نے اطمینان دلایا کہ مجرموں کو کافی سزا دیجائے گی لیکن چونکہ سزا میں کچھ تاخیر ہوئی اس لیے انگریزی بیڑے نے جدہ پہنچ کر نامق پاشا والی مکہ سے جو جدہ آ گئے تھے اور انہوں نے مجرموں کو گرفتار کر لیا تھا مطالبہ کیا کہ مجرموں کو فورا پھانسی دے دی جائے۔

ورنہ چوبیس گھنٹوں کے بعد گولہ باری شروع کر دی جائے۔ نامق پاشا کو باب عالی کے حکم کا انتظار تھا۔ اس لیے انہوں نے فورا پھانسی دینے میں تامل کیا۔ اس پر انگریزی بیڑے نے گولہ باری شروع کر دی۔ اسی اثناء میں اسماعیل پاشا عثمانی بیڑے کے ساتھ جدہ پہنچ گئے انہوں نے گولہ باری بند کرا کے مجرموں کو پھانسی کا حکم سنایا۔ اگر اسماعیل پاشا کا بیڑہ وقت پر نہ پہنچ گیا ہوتا تو جدہ تباہ ہو جاتا اور برطانیہ سے باقاعدہ جنگ چھڑ جاتی۔

(7) 1860ء میں شام میں دروزیوں اور مارونیوں میں جھگڑا ہوا۔ دروزی مسلمان تھے اور مارونی کیتھولک عیسائی تھے۔ کشت و خون کی نوبت آئی۔ کسان مارونیوں نے ابتداء کی اور چونکہ یہ ہنگامہ نظام جاگیرداری کی بنا پر ہوا تھا اس لیے انہوں نے اپنے ہم مذہب جاگیرداروں پر پہلے حملہ کیا۔ دروزی شیوخ نے بھی مارونی جاگیرداروں کا ساتھ دیا۔ مگر چند دنوں کے بعد پادریوں کے بھڑکانے سے اس شورش نے مذہبی رنگ اختیار کر لیا۔ اور نہایت تیزی سے شام کے اکثر حصوں میں پھیل گئی۔ خصوصا لبنان میں اس کے شعلے ہر طرف پھیل گئے مارونیوں نے قتل و غارت کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا لیکن چونکہ دروزی نسبتاً زیادہ طاقتور تھے اس لیے بالآخر غلبہ انہیں کو حاصل ہوا۔ اور انتقام کے جوش میں انہوں نے ہزاروں عیسائیوں کو قتل کر ڈالا دمشق میں عیسائیوں کا قتل زیادہ ہوا۔ فرانسیسی مورخ دلاژون کیر کہتا ہے کہ

> دمشق میں اگر امیر عبدالقادر الجزائری نہ ہوتا تو ایک عیسائی کی بھی صورت دکھائی نہ دیتی۔ یہ عرب بہادر جس نے سولہ سال تک فرانسیسیوں سے نہایت بیدردی سے جنگ کی تھی دمشق میں تنہائی کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ آگ کے شعلے پہلے ہی دفعہ بھڑکے تھے اور درماندوں کی صدا پہلی ہی دفعہ بلند ہوئی تھی اس نے بلا کسی پس و پیش کے عیسائیوں اور ان کے قاتلوں کے درمیان اپنے آپ کو ڈال دیا۔ ایک چھوٹی سی فوج کے ساتھ اس نے عیسائیوں کو عوام الناس سے چھڑایا اور اپنا محل انہیں رہنے کو دیا جو ہزاروں سے آگے پناہ لینے لگے۔ اور عیسائیوں کے سکونتی مقام پر عرب سواروں کی پہرہ بندی کر دی۔ اس شخص نے جو مسلمان اور اولاد پیغمبر اسلام تھا اور فرانس کا قدیم دشمن تھا ایک سے زیادہ مرتبہ اپنی جان کو خطرہ میں ڈال کر ان خونخوار ٹولیوں کو

> پسپا کیا جو اسلام اور ترکی کے لیے باعث ننگ تھیں اس نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ان بدقسمتوں پر پوشاک کے لیے بے دریغ روپیہ خرچ کیا جنہیں اس نے موت کے پنجہ سے رہائی دلائی تھی۔ اس نے خود اپنی نگرانی میں عیسائی محافظین کو بیروت پہنچایا جہاں انہیں کسی قسم کا خطرہ نہ تھا۔ اس کا یہ ایثار اس کی یہ شرافت اور اس کی یہ شریفانہ بہادری ایک لمحہ کے لیے بھی کم نہ ہوئی۔ اس کی زندگی کا یہ صفحہ ایسا شاندار ہے جس کے آگے ایک صدی کا کارنامہ بھی مدہم پڑ جاتا ہے۔ (7)

یہ واقعات سن کر مسیحی یورپ کے ہر گوشہ سے صدائے احتجاج بلند ہونے لگی۔ فرانس کیتھولک مارونیوں کا خاص حامی تھا اس نے ان کی مدد کے لیے ایک فوج شام میں بھیجنی چاہی مگر اس اندیشہ سے کہ مبادا فرانس شام میں اپنا تسلط قائم کر لے پہلے تو برطانیہ اور دوسری حکومتوں نے یہ تجویز منظور نہ کی مگر آخر کار 3 اگست 1860ء کو سارڈینا کے علاوہ ان تمام مغربی حکومتوں نے جنہوں نے صلحنامہ پیرس پر دستخط کئے تھے پیرس ہی میں یہ طے کیا کہ بارہ ہزار یورپین فوج شام میں امن قائم کرنے کی غرض سے روانہ کی جائے۔ چنانچہ فرانس نے فوراً چھ ہزار فوج روانہ کی۔ لیکن اس فوج کے شام پہنچنے سے قبل فواد پاشا وزیر خارجہ سلطان کے حکم سے وہاں پہنچ کر اس شورش کو رفع کر چکے تھے۔ ان کے حکم سے عثمانی فوج کے ایک سو گیارہ سپاہی گولی سے مارے گئے۔ ستاون بڑے بڑے دروزی پھانسی پر لٹکائے اور خود احمد پاشا والی دمشق کو قتل کی سزا دی گئی۔ اس کے بعد بیروت میں ایک بین الاقوامی کمیشن بیٹھا جس کے فیصلہ کے مطابق سینکڑوں دروزی جلا وطن کر کے طرابلس (افریقہ) بلغراد اور دوین بھیج دیے گئے۔ خورشید پاشا حاکم بیروت کو موت کی سزا تجویز ہوئی لیکن بعد میں ان کو معزول کر کے قسطنطنیہ بلا لیا گیا۔ عیسائیوں کے نقصانات کی تلافی کے لیے سات کروڑ پچاس لاکھ قرش کی رقم باب عالی کی طرف سے منظور ہوئی جو بالاقساط ادا کر دی گئی۔ لبنان کی آئندہ حکومت کے متعلق کمیشن نے یہ فیصلہ کیا کہ اسے دولت عثمانیہ کے زیرِ سیادت خود مختار کر دیا جائے اور اس کے والی کا تقرر سلطان کی عیسائی رعایا میں سے باب عالی کی طرف سے ہوا کرے۔ وہ فوج جو فرانس نے بھیجی تھی نو مہینہ تک شام میں مقیم رہی حالانکہ جس غرض سے یہ فوج بھیجی گئی تھی وہ فواد پاشا کے دمشق پہنچنے کے بعد ہی پوری ہو چکی تھی نو ماہ تک قیام کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ لیکن دول عظمیٰ نے

دولت عثمانیہ کی حمایت کا جو پیمان صلح نامہ پیرس میں باندھا تھا اس کا تقاضا یہی تھا کہ اس کے ملکی انتظامات میں مداخلت کرنے کے لیے محض نیک مشوروں پر قناعت نہ کی جائے بلکہ حسب ضرورت فوجی مدد بھی بہم پہنچائی جائے۔ بالآخر 5 جون 1861ء کو یہ فوج شام سے روانہ ہوئی۔ (8)

(8) 1876ء میں ولاچیا اور مولڈیویا کی ولایتوں نے باضابطہ متحد ہو کر رومانیہ کی ریاست قائم کرلی اور 1868ء میں جرمن شاہزادہ چارلس کو اس نئی ریاست کا فرماں روا منتخب کیا۔ یہ کاروائی صلح نامہ پیرس کی مخالف تھی لارڈ ایورسلے لکھتا ہے کہ

> دول عظمیٰ کو اس بات کی فکر تھی کہ حتی الامکان باب عالی کو آویزش سے بچایا جائے اس لیے ان کے سفیروں نے سلطان پر دباؤ ڈال کر شہزادہ چارلس کو اس نئی ریاست کا موروثی فرمانروا تسلیم کرالیا دول عظمیٰ کی یہ خیراندیشی کوئی نئی چیز نہ تھی۔ باب عالی کو اس کا تجربہ اس وقت سے ہوتا آیا ہے جس سے دولت علیہ کا زوال شروع ہوتا گیا) رومانیہ پر اگر سلطان کی فرمانروائی نام کے لیے باقی رہی تاہم عملاً وہ گویا آزاد ہو گیا۔ (9)

(9) سلطنت عثمانیہ کے متعلق دول عظمیٰ کی یہی خیر اندیشی سرویا کے معاملہ میں بھی ظاہر ہوئی صلحنامہ پیرس کی رو سے دولت علیہ کو بلغراد اور سرویا کے تین دوسرے قلعوں میں فوجی دستے رکھنے کا حق حاصل تھا۔ ترکوں کی گزشتہ حکومت کا اتنا ہی نشان باقی رہ گیا تھا۔ لیکن دول عظمیٰ کی سرپرستی میں اہل سرویا نے اس نشان کو بھی مٹا دینے کا فیصلہ کر لیا اور باب عالی سے مطالبہ کیا کہ وہ اپنی فوجیں ان قلعوں سے نکال لے۔ باب عالی نے معاہدہ پیرس کی بنا پر انکار کیا اور سرویا کو جنگ کی دھمکی دی۔ لیکن چونکہ اسی زمانہ میں جزیرہ کریٹ میں بغاوت برپا تھی اور باب عالی کی ساری توجہ اس کی طرف مبذول تھی اس لیے دول عظمیٰ کے سفیروں کا دوستانہ مشورہ قبول ہی کرنا پڑا۔ اور مارچ 1867ء میں ترکی فوجیں بلغراد اور دوسرے سروی قلعوں سے واپس بلالی گئیں۔ اب سرویا کا استقلال مکمل ہو گیا اور اس کے امیر نے بادشاہ کا لقب اختیار کر لیا۔ (10)

(10) کریٹ کی بغاوت یونانیوں کی ریشہ دوانیوں کا نتیجہ تھی۔ یونان اس جزیرہ کو اپنے میں شامل کرلینا چاہتا تھا اور اس غرض سے وہاں کے عیسائیوں کو جو کہ زیادہ تر یونانی نسل کے تھے دولت عثمانیہ کے خلاف برابر ابھارتا رہتا تھا۔ بغاوت کی شورش زیادہ ہوئی تو اسمعیل

پاشا خدیو مصر نے بھی اپنی فوجیں دولت علیہ کی مدد کے لیے کریٹ میں بھیجیں اور دولت علیہ نے بھی یکے بعد دیگرے افسر اور فوجیں بھیجیں۔ اخیر میں عمر پاشا بطل کریمیا کو وہاں کا حاکم اور سر عسکر بنا کر بھیجا۔ عمر پاشا کو بغاوت کے فرو کرنے میں بڑی حد تک کامیابی ہوئی۔ قریب تھا کہ وہ اس فتنہ کو پوری طرح دبا دیتے لیکن عین اسی وقت دول عظمیٰ نے مداخلت کی اور عمر پاشا کو اپنا ہاتھ روک لینا پڑا آخر کار 1869ء میں دول عظمیٰ کی تجویز سے ایک کانفرس پیرس میں منعقد کی گئی۔

جس کا نتیجہ حسب سابق یہ ہوا کہ سلطان کی طرف سے ایک فرمان جاری کیا گیا جس کی رو سے کریٹ کو حکومت خود اختیاری کے بعض حقوق دیئے گئے اور دو سال کا اخراج جو واجب الادا تھا معاف کر دیا گیا۔ نیز اہل جزیرہ فوجی خدمت سے بری کر دیئے گئے۔ اس طرح یہ بغاوت کچھ دنوں کے لیے فرو ہو گئی۔ (11)

(11) 1870ء میں باب عالی کو دول عظمیٰ کی دوستی کا ایک اور تجربہ ہوا۔ صلحنامہ پیرس کی ایک دفعہ کی رو سے بحر اسود میں روس اور ترکی کے جہازوں کا داخلہ ممنوع قرار دیا گیا تھا اور ان دونوں حکومتوں کو اس کے ساحلوں پر بحری اسلحہ خانہ قائم کرنے کی ممانعت کر دی گئی تھی لیکن جب 1870ء میں فرانس اور جرمنی کی جنگ شروع ہوئی تو روس نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر یہ پابندی توڑ دینی چاہی اور 31 اکتوبر 1870ء کو مذکورہ بالا دفعہ کی شکست کا اعلان کر دیا۔ جرمنی کے وزیر اعظم پرنس بسمارک نے اس جنگ میں روس کی غیر جانبداری اسی قیمت پر حاصل کی تھی کہ "معاہدہ پیرس کی اس خلاف ورزی میں جرمنی روس کی تائید کریگا۔" فرانس اپنی مصیبت میں مبتلا تھا وہ روس کو برانگیختہ کرنے کے لیے کسی طرح تیار نہ تھا۔ برطانیہ کی عنان حکومت مسٹر گلیڈ سٹون کے ہاتھ میں تھی جنہوں نے اپنی زندگی کا مقصد ہی یہ قرار دے رکھا تھا کہ ترکوں کو یورپ سے نکال کر سلطنت عثمانیہ کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے جائیں چنانچہ برطانیہ نے بھی روس کے اس فعل کے خلاف مطلق احتجاج نہیں کیا اور روس نے بحر اسود پر اپنا تسلط پھر قائم کر لیا۔ (12)

(12) 1875ء میں بوسینا اور ہرزیگونیا کے باشندوں سے بغاوت کرائی گئی۔ اس میں روس' آسٹریا جرمنی کا بہت زیادہ ہاتھ تھا۔ باب عالی نے بار بار مراعاتیں دیں۔ مگر چونکہ ابھارنے والوں کے مقاصد پورے نہیں ہوتے تھے۔ اس لیے بغاوت فرو نہ ہوئی۔ بالآخر دول عظمیٰ نے ظاہری مداخلت کا موقعہ پایا چنانچہ روس آسٹریا اور جرمنی کے فرمانرواؤں نے باہم

مشورہ کیا اور آسٹریا کے چانسلر کاونٹ اندراسی نے بوڈاپسٹ سے وہ نوٹ جاری کیا جو اس کے نام سے مشہور ہے۔ اس نوٹ میں اولاً یہ درج ہے کہ دول عظمیٰ بغاوت کے فرو کرنے اور یورپ میں امن قائم کرنے کے لیے سخت بے چین ہیں اور باب عالی ان اصلاحات کے نافذ کرنے سے جو کہ مدت سے واجب ہو چکی تھیں۔ نہایت قاصر رہا ہے۔ پھر درج ہے کہ سلطان پر دباؤ ڈال کر مندرجہ ذیل مطالبات پورے کرائے جائیں۔

30 جنوری 1876ء کو دول عظمیٰ کی طرف سے یہ اندراسی نوٹ باب عالی میں پیش کیا گیا۔

11 فروری 1876ء کو سلطان نے تمام دفعات باستثناء ایک دفعہ کے جس میں ٹیکسوں کو صرف مقامی ضروریات میں صرف کرنے پر زور دیا گیا تھا منظور کر لیں لیکن اس کے بعد بھی باغیوں نے ہتھیار نہیں رکھے اور اس بات کا مطالبہ کرتے رہے کہ پہلے اصلاحات جاری کر دی جائیں۔ باب عالی کی طرف سے یہ جواب دیا گیا کہ بغاوت جب تک قائم ہے اصلاحات کی اسکیم نافذ کرنا ممکن نہیں۔ اس درمیان میں شورش برابر بڑھتی چلی گئی۔ بوسینا بھی ہرزیگوینا کے ساتھ شریک ہو گیا۔ دوسری طرف سرویا، مونٹی نگرو اور بلغاریہ بھی علم بغاوت بلند کرنے کے لیے آمادہ نظر آتے تھے۔ (13)

(13) باب عالی کی صلح جوئی اور انتہائی مراعات کے باوجود بلقان کے عیسائیوں میں سرکشی کا جذبہ یورپین حکومتوں کی حوصلہ افزائی سے روز بروز مشتعل ہوتا جا رہا تھا۔ کہ 5 مئی 1876ء کو سالونیکا میں جرمن اور فرانسیسی قونصلوں کے قتل کا واقعہ پیش آیا۔ جس نے سارے یورپ کو ترکوں کے خلاف دفعتاً برانگیختہ کر دیا۔ سبب یہ ہوا کہ ایک بلغاری لڑکی اسلام قبول کرکے اپنے گاؤں سے سالونیکا آئی تاکہ وہاں کی مجلس عالیہ کے سامنے اس کا اعلان کرکے اپنے ایک ہم وطن نوجوان مسلمان سے شادی کی اجازت حاصل کرے۔ جب وہ سالونیکا کے اسٹیشن پر پہنچی تو یونانیوں اور بلغاریوں کا ایک کثیر مجمع پہلے سے موجود تھا ان لوگوں نے لڑکی کے نقاب اور فرغل کو نوچ کر پھینک دیا اور زبردستی ایک گاڑی میں بٹھا کر فوراً امریکن قونصل خانہ میں پہنچا دیا۔ جہاں نائب قونصل نے جو ایک بلغاری عیسائی تھا اور اسی نے یہ تمام انتظامات کئے تھے لڑکی کو رات بھر چھپائے رکھا اور دوسرے دن اسے اپنے ایک دوست کے گھر بھیج دیا کہ سراغ نہ مل سکے۔ علی الصبح مسلمانوں کا ایک گروہ جس میں زیادہ تر ادنیٰ طبقہ کے لوگ تھے، قونصل خانہ کے پاس جمع ہوا اور لڑکی کی

واپسی کا مطالبہ کیا۔ ادھر سے جواب ملا کہ لڑکی یہاں نہیں ہے۔ اس کے بعد یہ لوگ برہم ہو کر قریب کی ایک مسجد میں اکٹھے ہوئے۔ اور آئندہ تدبیروں پر غور کرنے لگے۔ بدقسمتی سے مسلمانوں کے اس جوش کی حالت میں جرمن اور فرانسیسی قونصل مسجد میں داخل ہوئے۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ مجمع کو سمجھانے کے لیے مسجد میں گئے یا مسجد کے دروازے کے قریب تھے اور بھیڑ کے دھکے میں بلا ارادہ اندر پہنچ گئے تھے۔ بہرحال جس صورت سے بھی وہ گئے ہوں مجمع انہیں مسجد کے اندر دیکھتے ہی بے قابو ہو گیا اور چند آدمی کھڑکیوں کی آہنی سلاخیں کھینچ کر ان پر ٹوٹ پڑے اور دونوں کو وہیں ختم کر دیا انگریزی قونصل مسٹر بلنٹ نے شروع ہی میں مجمع کا رنگ دیکھ کر امریکن نائب قونصل لزارو کے یہاں جو اس ہنگامہ کا اصلی باعث تھا بہت اصرار کے ساتھ کہلا بھیجا کہ لڑکی فورا واپس کر دی جائے۔ ورنہ جرمن اور فرانسیسی قونصلوں کی جان خطرہ میں ہے۔ لیکن لزارو نے پہلے تو یہ عذر کیا کہ معلوم نہیں لڑکی کہاں ہے اور جب بلنٹ کے مزید اصرار پر اس نے لڑکی واپس کی تو وقت گزر چکا تھا اور دونوں قونصل مارے جا چکے تھے اگرچہ باب عالی نے مجرموں کی سزا کے لیے فورا احکام صادر کیئے اور چھ آدمیوں کو پھانسی دے دی گئی۔ اور بہتوں کو قید کی سزائیں دی گئیں۔ تاہم یورپ کا جوش انتقام اس کے بعد بھی ٹھنڈا نہ ہوا۔ یورپین پریس نے اس آگ کو خوب بھڑکایا اور ہر طرف سے یہ صدا بلند ہونے لگی کہ سلطنت عثمانیہ کے تمام عیسائیوں کی جانیں خطرہ میں ہیں اور وہاں کی پوری مسلمان آبادی عیسائیوں کے قتل عام پر آمادہ ہو گئی ہے۔ عیسائیوں کے تحفظ کے لیے جو تجویزیں پیش کی گئیں ان میں ایک یہ بھی تھی کہ ترکوں کے مقابلہ میں صلیبی اتحاد قائم کیا جائے۔ (14)

(14) 23 دسمبر 1876ء میں دستور اساسی کا اعلان کیا گیا۔ اس کے اعلان پر ملک کے ہر طبقہ نے مسرت کا اظہار کیا۔ علماء شیخ الاسلام خیر اللہ آفندی کی قیادت میں، عیسائی پادری اپنے بطریقوں کے ساتھ، شاکر افندی جو قسطنطنیہ کے کبار علماء میں سے تھے ننھے طلبا کی جماعت لے کر اور دارالسلطنت کے عام باشندے جھنڈے لئے ہوئے جن پر آزادی کا لفظ منقوش تھا مدحت پاشا کے مکان پر مبارک باد دینے کے لیے آئے۔ شام کے وقت تمام مسجدوں میں چراغاں کیا گیا۔ لوگ مشعلیں لیے ہوئے سڑکوں پر گشت کرتے تھے اور سلطان زندہ باد اور مدحت پاشا زندہ باد کے نعرے لگاتے تھے۔ سلطنت کے تمام صوبوں سے مبارک باد کے تار آئے جن میں مسرت کا اظہار کیا گیا تھا۔ عیسائی رعایا کے لیے دستور اساسی کا اعلان خواہ کتنا

ہی مسرت کا باعث ہوا ہو لیکن یورپین حکومتوں خصوصاً برطانیہ کو یہ چیز پسند نہ آئی کیونکہ اس سے دولت علیہ کے اندرونی معاملات میں ان کی مداخلت کا بہت کچھ سد باب ہو رہا تھا- سب سے پہلا اعتراض یہ کیا گیا کہ اس دستور کا مقصد محض دول یورپ کی اس کانفرس کو شکست دینا تھا جو عیسائیوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے منعقد ہونے والی تھی- یہ صحیح ہے کہ دستور کا اعلان اسی روز ہوا جس روز کانفرس منعقد ہوئی- لیکن اس کے لیے مدحت پاشا اور ان کے ساتھی ایک سال سے کوشش کر رہے تھے- جیسا کہ سر ہنری ایلیٹ سفیر برطانیہ کے ایک خط سے صاف معلوم ہوتا ہے جو رسالہ نائنٹینتھ سنچری باب فروری 1888ء میں شائع ہوا تھا-(15)

(15) 23 دسمبر 1876ء کو جس روز قانون اساسی کا اعلان ہوا قسطنطنیہ میں دول عظمیٰ کے نمائندوں کی کانفرس منعقد ہوئی- ابتدائی کاروائی مشکل سے ختم ہوئی تھی کہ باسفورس کے دوسرے کنارہ سے توپوں کی آواز آنے لگی- صفوت پاشا وزیر خارجہ دولت عثمانی نے کھڑے ہو کر ارکان مجلس کو مخاطب کیا اور کہا کہ ان توپوں کی آواز جو آپ سن رہے ہیں وہ سلطان المعظم کی طرف سے اعلان قانون اساسی کی دلیل ہے اور جو یہ قانون بلا استثناء سلطنت کی تمام رعایا کے حقوق و حریت کا کفیل ہے کانفرس کا جو مقصد تھا وہ حاصل ہو گیا اب اس کی کاروائیاں فضول ہیں- صفوت پاشا کی تقریر سے مجلس پر سناٹا چھا گیا- چند لمحوں کے بعد اگناتیف (سفیر روس) نے مہر خاموشی توڑی اور یہ تجویز پیش کی کہ کانفرس کو اپنا کام شروع کرنا چاہیے- دول عظمیٰ کے وکلا ایک مہینہ سے قسطنطنیہ میں مقیم تھے اور باہم جلسے کر رہے تھے- ان جلسوں میں ترک مندوبین عمدا شریک نہیں کیے گئے تھے- 23 دسمبر کے باضابطہ اجلاس سے پہلے وہ لائحہ عمل جو دولت علیہ کے سامنے پیش کیا جانیوالا تھا طے کر لیا گیا تھا- اس غیر معمولی کاروائی کا مقصد باب عالی کو یہ یقین دلانا تھا کہ کانفرس جو فیصلہ کرے گی وہ دول یورپ کا متفقہ فیصلہ ہو گا- اور باب عالی کو یہ توقع نہ رکھنی چاہیے کہ وہ دول عظمیٰ کی رقابتوں سے کچھ فائدہ اٹھا سکے گا چونکہ تمام معاملات حقیقتاً پہلے ہی طے کر لیے گئے تھے اس لیے کانفرنس کا کام صرف اتنا رہ گیا تھا کہ اپنے فیصلوں کو باضابطہ طور پر مرتب کر دے- چنانچہ کانفرنس کی کاروائی روسی سفیر کی اس تجویز سے شروع ہوئی کہ صوبہ بلغاریہ کو حکومت خود اختیاری دے دی جائے- وہاں ایک عیسائی والی مقرر کیا جائے اور ایک قومی رویف قائم کی جائے اور ترکی فوجیں صرف چند متعین قلعوں میں باقی رکھی

جائیں ترک مندوبین کے اس جواب پر کہ یہ امور دائرہ بحث سے بالکل خارج اور قطعاً ناقابل قبول ہیں۔ یہ تجویز یوں ترمیم کر دی گئی کہ بلغاریہ کو ایک خاص گورنمنٹ دے دی جائے۔ ایک بین الاقوامی کمیشن اس کے انتظامات کی نگرانی کے لیے مقرر کر دیا جائے اور اس کے گورنر کا تقرر دول عظمیٰ کی منظوری سے ہوا کرے۔ اگناتیف (سفیر روس) نے یہ تجویز کم سے کم مطالبہ کے طور پر پیش کی تھی۔ ترک مندوبین نے اس پر بھی اعتراض کیا اور کہا کہ سرویا اور رومانیا کی مثالیں سامنے ہیں جن کو مخصوص رعایتی حکومتیں دی گئی تھیں اور وہی خاص انتظامات ان کے لیے بھی کئے گئے تھے جو بلغاریہ کے لیے تجویز ہو رہے ہیں۔ لیکن نتیجہ کہ دیکھتے ہوئے اس تجربہ کو بلغاریہ میں دہرانا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ انہوں نے بتایا کہ سرویا اور رومانیا کی مسلمان آبادی کے ساتھ رواداری اور مساوات کا وہ سلوک نہیں کیا گیا جس کا وعدہ کیا گیا تھا اور جو بطور شرط کے منظور کیا گیا تھا۔ برخلاف اس کے وہاں کے مسلمان باشندے ترک وطن کے بعد بھی جب کہ انہیں کسی قسم کی شکایت کا موقع باقی نہ رہ گیا۔ سلطنت عثمانیہ کے دشمنوں سے اتحاد کرنے یا اس کے خلاف سازش کرنے سے کبھی باز نہ آئیں۔ بالآخر طویل بحث و مباحثہ کے بعد دول عظمیٰ کے نمائندوں کی طرف سے کم سے کم مطالبہ یہ پیش کیا گیا جس میں اب کسی تخفیف کی گنجائش نہ تھی کہ مقامی حکام کی مدد کے لیے ایک قونصل کمیشن مقرر کر دیا جائے اور بلغاریہ' ہرزیگونیا اور بوسینیا کے صوبوں کے والی پہلے پانچ سال تک دول عظمیٰ کی منظوری سے مقرر کئے جائیں۔ ترک مندوبین اس تجویز سے بھی اتفاق نہ کر سکے انہوں نے کہا قونصل کمیشن کا تقرر قوم کے حقوق خاص میں رخنہ اندازی کا باعث ہو گا جسے منظور کرنا ہمارے اختیار سے باہر ہے۔ اس کے علاوہ ایک عملی دشواری یہ بھی ہے کہ ان صوبوں کے لیے کوئی مخصوص انتظام کر دینے سے سلطنت کے دوسرے صوبوں میں بے اطمینانی پیدا ہو جائے گی اور غالب ہے کہ بعض میں شورش بھی رونما ہو جائے۔ انہوں نے اس بات پر خاص طور سے زور دیا کہ یہ موقع سلطنت کے کسی ایک حصہ کے لیے مخصوص مراعات حاصل کرنے کا نہیں ہے جبکہ سلطان کی طرف سے ایک ایسے دستور کا اعلان کر دیا گیا ہے جس میں بلا امتیاز تمام رعایا کو سلطنت کے ہر حصہ میں زیادہ سے زیادہ امکانی آزادی اور مساوی حقوق دیئے گئے ہیں۔ اس پر جنرل اگناتیف نے ایک نہایت تخت تقریر کی جس کے بعد جلسہ برخاست ہو گیا۔ اور ارکان نے ترک مندوبوں کی اس احتجاج تقریر کے سننے کا بھی

انتظار نہیں کیا جو اگناتیف کی تقریر کے جواب میں وہ کرنا چاہتے تھے۔ بہرحال یہ آخری ترمیم شدہ تجویز دول عظمیٰ کے نمائندوں نے ایک الٹی میٹم کی شکل میں باب عالی میں بھیجی اور یہ دھمکی دی کہ اگر ایک ہفتہ کے اندر اس کا جواب قابل اطمینان نہ آیا تو ہم قسطنطنیہ سے روانہ ہو جائیں گے۔ مدحت پاشا نے سلطان کے حکم سے ایک مجلس عالیہ منعقد کی جس میں سلطنت کی تمام قوموں کے نمائندے شریک کئے گئے اور ان کے سامنے کانفرنس کی یہ آخری تجویز پیش کی گئی۔ مدحت پاشا نے اپنی تقریر میں صاف صاف بتا دیا کہ اگر یہ تجویز مسترد کر دی گئی تو جنگ کے سوا کوئی چارہ نہیں اس کے بعد حاضرین نے پوری آزادی کے ساتھ اپنی رائے کا اظہار کیا۔ رؤف بے بن رفعت پاشا نے کہا کہ لڑائی مثل بخار کی بیماری کے ہے جس سے بچنا ممکن ہے لیکن کانفرنس کی تجویز مثل پھیپھڑوں کی دق کے ہے جس کا لازمی نتیجہ قبر ہے۔ صادر پاشا نے ایک طویل خطبہ میں کہا کہ ہم اپنی عزت کی اہانت پر موت کو ترجیح دیتے ہیں۔ وکیل بطریق ارمنی نے بھی ایک لمبی تقریر کی جس میں کانفرنس کے مطالبات کے مسترد کرنے پر زور دیا۔ غرض مجلس نے متفقہ طور پر دول عظمیٰ کے مطالبات منظور کرنے سے انکار کر دیا۔ دول عظمیٰ کے الٹی میٹم کے خلاف مجلس عالیہ کا یہ فیصلہ یقیناً تعجب خیز تھا۔ لیکن اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز وہ اتفاق و اتحاد تھا جو اس نازک موقعہ پر وطن کی محبت اور عزت کے لیے مجلس کے مسلمان، عیسائی اور یہودی ممبروں میں ظاہر ہو رہا تھا یونانی اور کیتھولک، آرمینی ممبروں کا جوش خصوصیت کے ساتھ بہت نمایاں تھا۔ باب عالی نے اس فیصلہ کی اطلاع دول عظمیٰ کے نمائندوں کو دے دی۔ چنانچہ 20 جنوری 1877ء کو وہ قسطنطنیہ سے روانہ ہو گئے اور کانفرنس برخاست ہو گئی۔
(16)

(16) 24 اپریل 1877ء کو روس نے اعلان جنگ باضابطہ کرکے عثمانی سرحدوں کو عبور کرنے کا حکم دے دیا رومانیہ کو جو کہ دولت علیہ کا باجگزار تھا روس سے مل گیا۔ شرط یہ کی کہ اس کی آزادی اور خود مختاری تسلیم کرلی جائے۔ اور روسی فوجوں کو رومانیہ کے علاقے سے گزرنے کی اجازت دے دی اور پھر باضابطہ طور پر اعلان جنگ کرکے اپنی آزادی اور خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ مونٹی نگرو نے بھی صلح توڑ کر از سرنو جنگ شروع کر دی۔ زار روس نے رائشٹاٹ میں شہنشاہ آسٹریا سے ملاقات کرکے اسے مطمئن کر دیا تھا کہ وہ قسطنطنیہ پر قبضہ کرنے کا مطلقاً ارادہ نہیں رکھتا اور یہ معاہدہ کرلیا تھا کہ اگر اس جنگ میں آسٹریا غیر جانبدار رہا تو بصورت فتح بوسنیا اور ہرزیگونیا کے صوبے اس کے حوالے کر دیئے جائیں گے۔ 8 جون 1877ء میں روس نے انگلستان کی غیر جانبداری بھی اسی قسم کے ایک معاہدہ

سے حاصل کرلی اور وعدہ کیا کہ مصر اور نہر سویز سے کوئی تعرض نہ کیا جائے گا اور نہ قسطنطنیہ یا آبنائے باسفورس پر حملہ ہو گا۔ اس جنگ کے زمانہ میں سرویا نے بھی اعلان جنگ کرکے نیش پر قبضہ کرلیا۔ ترکی فوجوں نے نہایت بہادری کے ساتھ روسیوں کو شکست پر شکست دی۔ پہلے پہل جبکہ روسی کمانڈر جنرل گور کو کوہ بلقان طے کرتا ہوا ذرہ شبکہ پر حملہ آور ہوا اور اسے ترکوں سے لے لیا تو روس کے لیے اب اورنہ (ایڈریانوپل) اور وہاں سے قسطنطنیہ کا راستہ کھلا ہوا تھا اس نازک موقع پر سلطان نے فرانسیسی نو مسلم محمد علی کو جو کریٹ کا گورنر جنرل تھا تمام عثمانی افواج کا سپہ سالار اعظم مقرر کرکے روسیوں کے مقابلہ میں روانہ کیا۔ محمد علی کے پہنچتے ہی جنگ کا نقشہ بدل گیا۔ روسی کمانڈر جنرل گورکو اپنے بلغاروی حلیفوں کی مدد کے باوجود "سٹارازگورا" میں شکست کھا کر کوہ بلقان کی طرف بھاگا۔ اسی اثناء میں عثمان پاشا "ودین" سے نکل کر "پلونا" میں آگئے تھے۔ جو دریائے ڈینوب کے جنوب میں بیس میل کے فاصلہ پر ہے جنرل شلڈر (روسی کمانڈر) نے حملہ کرنے میں عجلت کی مگر اس کی فوج کو نہایت بے ترتیبی کے ساتھ پسپا ہو کر "نائیکو پولیس" میں پناہ لینی پڑی اس کے بعد ایک دوسری روسی فوج جنرل کرودنر کی قیادت میں آگے بڑھی لیکن اسے بھی اپنے آٹھ ہزار مقتول میدان جنگ میں چھوڑ کر بھاگنا پڑا۔ پلونا کا چھوٹا سا شہر روسی فتوحات کے لیے سب سے بڑا سنگ راہ ثابت ہوا۔ مسٹر ایلین فلپس اس موقع پر لکھتا ہے۔

> "اب جنگ کا سارا نقشہ یک بیک بدل گیا تھا۔ زارگریڈ قسطنطنیہ پر فاتحانہ شوکت و جلال کے ساتھ پیش قدمی کرنے کا وہ خواب جو باوجود گزشتہ تلخ تجربات کے روسی اب تک دیکھ رہے تھے نسیا منسیا ہو گیا۔ فی الحال تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ سلطنت عثمانی نہیں بلکہ روسی سلطنت موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا ہے اور تمام یورپ کی نظریں انتہائی بیم ورجا کے ساتھ اس محاربہ پر جمی ہوئی تھیں جو بلغاریہ کے ایک معمولی شہر کے گرد رونما تھا اور جس کے انجام سے سارے مشرق کی قسمت وابستہ تھی روسی مستقر جنگی میں اس خطرہ کا پورا احساس تھا۔ گرینڈ ڈیوک نکولس نے محمد علی کی نقل و حرکت پر نظر رکھنے کے لیے فوج کا ایک حصہ چھوڑا اور فوج کے اصلی حصہ کو جس کی تعداد ستر ہزار تھی ہمراہ لے کر بسرعت تمام پلونا پہنچا۔ یہاں پہنچ کر 11 ستمبر کو اس نے ایک زبردست حملہ کیا جس کے متعلق اس کو امید واثق تھی کہ وہ پچھلی ناکامیوں کی کافی سے زیادہ تلافی کر دے گا۔ مگر اس کا انجام سنگین تر ہوا اس میں شک

نہیں کہ داہنے بازو پر رومانیوں اور دائیں بازو پر سکوبلیٹ نے ترکی مقامات پر قبضہ کر لیا تھا لیکن مرکزی حملہ خوفناک خونریزی کے ساتھ جس میں سولہ ہزار مقتول و مجروح ہوئے پسپا کر دیا- ان سب سے زیادہ تہلکہ انگیز وہ خبر تھی جو ایشیا سے موصول ہوئی جہاں مختار پاشا نے روسی حملہ آوروں کو جو میلیکاف کے زیر کمان تھے سرحد پر بھگا کر غازی کا لقب اختیار کر لیا تھا پے در پے تین حملوں میں ہزیمت اٹھانے کے بعد روسیوں کو اندازہ ہو گیا کہ پلنا کو فتح کرنے کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ اس کا محاصرہ سختی سے کر لیا جائے- یہ تدبیر کارگر ثابت ہوئی تقریباً پانچ ماہ تک حیرت انگیز استقلال اور جانبازی کے ساتھ ایک لاکھ بیس ہزار روسیوں کا مقابلہ کرنے کے بعد جب سامان رسد بالکل ختم ہو گیا اور رسد نہ پہنچنے کی وجہ سے فاقوں پر فاقے کرنے پڑے تو عثمان پاشا اپنے بتیس ہزار فاقہ کش سپاہیوں کو لے کر نکلنے اور حصار توڑنے پر مجبور ہوئے انتہائی بہادرانہ جنگ کی جس میں زخمی ہو کر بے ہوش ہو کر گر پڑے اور افسر کو اس طرح مجبور اور زخمی دیکھ کر فوج نے بھی ہمت ہار دی- عثمان پاشا کو جب ہوش آیا تو اپنے آپ کو زار روس کے سامنے پایا- فورا ہتھیار کھول کر زار کے سامنے 10 دسمبر 1877ء کو ڈال دیے- اس کے بعد زار روس اڈریا نوپل میں فتح یاب ہو کر داخل ہو گیا تو انگلستان اور آسٹریا بھی روس کے خلاف تیار ہو گئے- اس وجہ سے کہ روس فتح یاب ہونے کے بعد ان معاہدہ ہائے سابقہ پر قائم نہ رہے گا- آسٹریا نے ایک فوج کوہ کار پیتھں میں تعینات کر دی- انگلستان نے بحری بیڑہ خلیج بسیکا میں جو کہ در دانیال کے دہانہ پر ہے روانہ کیا اور پھر در دانیال میں داخل ہونے کا حکم دے دیا اور اپنی پارلیمنٹ سے روس کے خلاف جنگ کے لیے ساٹھ لاکھ پونڈ کی منظوری لے لی- واضح ہو کہ یہ برطانوی پارلیمنٹ میں ابتدائی جنگ میں دو فریق تھے- ایک دولت عثمانی کا حامی تھا جس میں برٹش وزیر اعظم بیکنس فیلڈ کی پارٹی تھی جو کہتی تھی کہ ترکوں کی حمایت کی جائے ورنہ خطرہ ہے کہ روس قسطنطنیہ پر قابض ہو جائے جو کہ سراسر برطانیہ کے مصالح کے خلاف ہے اور دوسری پارٹی جس کی

> اکثریت تھی وہ اس کی مخالف تھی۔ مگر ایڈریانوپل میں زار کے داخل ہونے کے بعد دوسری جماعت نے بھی اپنی رائے بدل دی اور روس کو متنبہ کیا کہ اگر روس نے قسطنطنیہ کی طرف کوئی قدم اٹھایا تو یہ اقدام برطانیہ کے ساتھ جنگ کا اعلان سمجھا جائے گا چنانچہ روس نے کوئی اقدام نہیں کیا اور دولت علیہ سے صلح کی گفت و شنید شروع ہوئی۔ 31 جنوری 1878ء کو فریقین کے نمائندوں نے عارضی صلح کے ایک نوشتہ پر ادرنہ میں دستخط کر دیئے۔ اس عارضی صلح کے بعد گرانڈ ڈیوک نکولس (زار روس) نے اپنا فوجی مستقر بحر مارمورا کے ساحل سان اسٹیفانو میں قائم کیا۔ جہاں سے قسطنطنیہ کے منارے نظر آتے تھے اور برطانیہ نے اپنے جنگی جہاز جزائر الملوک سے کچھ فاصلہ پر جہاں سے قسطنطنیہ نظر آتا تھا کھڑے کئے اور حکم جاری کیا کہ یہ جہاز ہر وقت مستعد رہیں۔ اندیشہ تھا کہ روس اور برطانیہ میں عنقریب جنگ چھڑ جائے گی۔ عہدنامہ تیار کیا گیا جو کہ معاہدہ سان اسٹیفانو کے نام سے مشہور ہے۔ اس معاہدہ میں دولت عثمانیہ کے خلاف تو بہت سخت شرطیں تھیں ہی مگر خود روس کے حلفاء رومانیہ، سرویا، آسٹریا، ہنگری یونان، بلغاریہ وغیرہ کے بھی بہت سی مخالف شرائط تھیں جن کو روس کی رقیب حکومتیں انگلستان فرانس، جرمنی، بھی گوارا نہیں کرتی تھیں۔ اس وجہ سے یورپ میں چاروں طرف ایسا شور برپا ہوا کہ خود روس بھی سخت مرعوب ہو گیا۔ اس میں وہ تمام باتیں تسلیم کر لی گئیں تھیں جو کہ 23 دسمبر 1876ء میں دول عظمیٰ کے نمائندوں نے قسطنطنیہ کانفرنس میں پیش کی تھیں۔ اور بہت سی زائد باتیں تھیں جن کی وجہ سے دولت عثمانیہ نہ صرف کمزور ہوتی تھیں بلکہ
>
> اس کے بہت سے حصے قبضہ سے نکل جاتے تھے۔ (17)

چنانچہ تجویز ہوا کہ برلین میں تمام دول کے نمائندے جمع ہوں اور ان شرائط پر از سر نو گفتگو کی جائے روس اس پر اس شرط سے راضی ہوا تھا کہ اس کانگریس میں صرف وہی دفعات رکھی جائیں جن کو روس پیش کرنا مناسب سمجھے مگر برطانیہ کو اصرار تھا کہ تمام دفعات زیر بحث لائی جائیں۔ اس پر جانبین میں اس قدر کشیدگی ہو گئی کہ پختہ گمان ہو گیا کہ برطانیہ اور روس میں عنقریب جنگ چھڑ جائے گی۔ چنانچہ لارڈ بیکنسفیلڈ (وزیر اعظم

برطانیہ) نے جنگ کی تیاریاں شروع کر دیں اور ہندوستانی فوجیں مالٹا کو روانہ کر دی گئیں۔ دوسری طرف وزیر خارجہ برطانیہ نے ایک گشتی مراسلہ دول عظمیٰ کے پاس بھیج کر ان اعتراضات کو واضح کر دیا جو حکومت برطانیہ کو معاہدہ سان اسٹیفانو پر تھے۔ زار نے دیکھا کہ آسٹریا بھی جنگ کے لیے آمادہ ہے۔ رومانیہ میں روس کی بے وفائی کے خلاف سخت برہمی پھیلی ہوئی ہے۔ علاوہ بریں خود اس کی سلطنت میں بھی بے اطمینانی کے آثار نمایاں تھے۔ ان حالات سے مجبور ہو کر اس کو برطانیہ کی خواہش کے مطابق کانگریس کا انعقاد کرنا منظور کرنا پڑا۔ مگر دونوں حکومتوں کے درمیان ایک خفیہ معاہدہ ہوا جس میں وزارت برطانیہ نے وعدہ کیا کہ وہ کانگریس میں صلحنامہ اسٹیفانو کی تمام اہم دفعات سے متعلق روس کی حمایت کرے گی۔ اس شرط کے ساتھ کہ جدید بلغاریہ کی قطع و برد میں روس برطانیہ کا ساتھ دیگا۔ یہ معاہدہ بالکل خفیہ تھا لیکن وزارت خارجہ کے ایک ملازم کی غلطی کی وجہ سے پریس کو اس کی اطلاع ہو گئی۔ اسی طرح برطانیہ کا ایک خفیہ معاہدہ باب عالی سے ہوا جس کی بنا پر باب عالی کو جزیرہ سائپرس (قبرص) برطانیہ کو دینا پڑا۔ جس کا ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔

الحاصل 13 جون 1878ء کو دول عظمیٰ کے نمائندوں کی ایک عظیم الشان کانگریس پرنس بسمارک کے زیر صدارت برلن میں منعقد ہوئی۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کانگریس کو ان تمام مسائل پر از سر نو بحث و تصفیہ کا حق حاصل ہے جو معاہدہ اسٹیفانو میں مذکور تھے لیکن بہت جلد یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ روس اور برطانیہ کے خفیہ معاہدہ کی وجہ سے کانگریس کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ کانگریس کی صدارت کی کرسی پر اگرچہ بسمارک متمکن تھا لیکن کانگریس میں لارڈ بیکنسفیلڈ (وزیر اعظم برطانیہ) ہی کی شخصیت چھائی ہوئی تھی۔ ایک ماہ کے بحث و مباحثہ کے بعد جس میں اکثر یہ اندیشہ ہونے لگتا تھا کہ ساری گفت و شنید درہم برہم ہو جائے گی۔ 12 جولائی کو ایک معاہدہ مرتب ہو گیا اور ارکان کانگریس نے اس پر دستخط کر دیے۔ عہد نامہ برلن کی رو سے معاہدہ اسٹیفانو کی وہ شرائط جو نہایت سخت اور دور رس تھیں بہت کچھ معتدل کر دی گئیں اور تقریباً معاہدہ سان اسٹیفانو تمام تر باطل کر دیا گیا۔(18)

برلن کانگریس میں سلطنت عثمانیہ کی حمایت کا مظاہرہ سب سے زیادہ جس طاقت نے کیا تھا وہ برطانیہ تھی لیکن معاہد سائپرس کے افشاء کے بعد تونس کے متعلق جو معاہدہ برطانیہ اور فرانس کے نمائندوں میں ہوا اور جس کی بناء پر تونس کو جو اس وقت تک

دولت علیہ کی فرمانروائی میں داخل تھا فرانسیسی عسکریت کا شکار بنا کر آگ اور خون کی راہ میں حکومت فرانس کے قبضہ و اقتدار میں لایا گیا وہ برطانیہ کی دوستی کی حقیقت واضح کرنے کے لیے بالکل کافی ہے۔ کانگریس میں سلطنت عثمانیہ کی تقسیم کا مسئلہ برطانیہ کے لیے نہایت تشویشناک تھا۔ روس کے حوصلے بڑھے ہوئے تھے اور جنگ کے آخری ایام میں خود قسطنطنیہ اس کی زد میں آگیا تھا ایسی صورت میں برطانیہ کی مداخلت اور کانگریس کے اجلاس میں سلطنت عثمانیہ کے مقبوضات کے تحفظ کی مداخلت اور کانگریس کے اجلاس میں سلطنت عثمانیہ کے مقبوضات کے تحفظ پر زور دینا کچھ اس سبب سے نہ تھا کہ وہ دولت علیہ سے حقیقی ہمدردی رکھتا ہے بلکہ محض اس خوف سے تھا کہ اگر روس کو آگے بڑھنے سے نہ روکا گیا تو مشرقِ ادنیٰ میں اس کا تسلط قائم ہو جائے گا جو برطانوی مصالح کے لیے حد درجہ خطرناک ثابت ہو گا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ برطانیہ کے اس طرز عمل کا مقصود یہ بھی تھا کہ سلطنت عثمانیہ کی کمزوری سے جو فائدہ دوسری حکومتیں اٹھانا چاہتی ہیں اسے خود اپنے لیے محفوظ کرلے۔ چنانچہ عین اس وقت جب کہ برلن کانگریس میں برطانیہ کا وزیر اعظم لارڈ بیکنس فیلڈ عثمانی مقبوضات کے تحفظ پر نہایت پر جوش تقریریں کر رہا تھا اور اپنی ترک دوستی سے یورپین قوموں کا نشانہ ملامت بنا ہوا تھا معاہدہ سائپرس پر کامل آزادی کے ساتھ باب عالی کے نمائندوں کے دستخط لے جا رہے تھے اور پھر جب کانگریس کے اختتام سے قبل ہی یہ راز منظرعام پر آگیا اور دوسری حکومتوں کو برطانیہ کی بددیانتی پر طیش آیا تو سلطنت عثمانیہ ہی کے ایک دوسرے صوبہ (تونس) کو فرانس کے حوالہ کرکے جس کی برہمی سے ساری کانگریس اور اس کے ساتھ مشرق ادنیٰ کے تمام برطانوی مصالح کے درہم برہم ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ اس دوستی کا حق ادا کیا گیا۔ (19)

ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو۔

(17) عہد نام برلن نے یورپ میں سلطنت عثمانیہ کا تقریباً خاتمہ کر دیا۔ عثمانی صوبوں کی بجائے یونان، رومانیا، سرویا، مانٹی نگرو، بلغاریہ کی خود مختار حکومتیں قائم ہو گئیں جن کا تعلق باب عالی سے محض سالانہ خراج کی حد تک رہ گیا۔ جو صوبے براہ راست باب عالی کے زیر حکومت رہ گئے ان میں بھی آزادی کی تحریک پیدا ہو گئی۔ چنانچہ باوجود اس کے کہ 1878ء کے بعد سلطان عبدالحمید خاں ثانی کے آخر عہد حکومت تک کسی بیرونی سلطنت سے جنگ کی نوبت نہیں آئی دولت علیہ کو مسلسل مختلف صوبوں کے اندرونی ہنگاموں اور بغاوتوں کے فرو کرنے میں مصروف رہنا پڑا۔ علاوہ ازیں مذکورہ بالا خود مختار مملکتوں کی طرف سے

بھی کوئی نہ کوئی نزاع برابر جاری رہا۔ اور دول عظمیٰ کے کسی نہ کسی رکن نے انھیں مدد پہنچا کر دولت عثمانیہ کی شکست و ریخت میں حتی الامکان کوئی دقیقہ اٹھانہ رکھا۔

معاہدہ برلن کی رو سے البانیہ کے دو شہر گوسنجہ اور پلاوا' مانٹی نگرو کو دے دیئے گئے تھے۔ باب عالی نے حسب معاہدہ مانٹی نگرو کی آزادی تسلیم کرلی اور حسب شرائط وہ تمام مقامات جو کہ مانٹی نگرو کو دیئے گئے تھے ان کا تخلیہ کر دیا مگر اہل البانیہ نے گوسنجہ اور پلاوا کو مانٹی نگرو میں شامل کرنے سے انکار کیا اور اس کے لیے البانی لیگ بنائی دونوں قوموں میں جنگ شروع ہوئی۔ بالآخر دول یورپ نے فیصلہ کیا کہ گوسنجہ اور پلاوا سلطنت عثمانیہ کو واپس کئے جائیں اور ان کے معاوضہ میں ڈ-سنو کا علاقہ اور بندرگاہ مانٹی نگرو کو دے دیا جائے باب عالی نے اس فیصلہ کو منظور نہیں کیا تو برطانیہ کی تحریک پر جس کی عنان وزارت گلیڈ سٹون کے ہاتھ میں آچکی تھی دول یورپ کا ایک جنگی بیڑا ستمبر 1880ء کو ڈ-سنو کے سامنے نمودار ہوا' اور باب عالی کو مجبور کرکے فیصلہ منوایا گیا۔

(18) عہد نامہ برلن میں یونان کے رقبہ کے توسیع کا کوئی وعدہ نہیں کیا گیا تھا۔ صرف سفارش کی گئی تھی کہ باب عالی اپائرس اور تھسلی کو یونان سے ملحق کردے۔ تین سال تک دول عظمیٰ ریاستہائے بلقان کی حد بندیوں میں مصروف رہیں۔ آخر میں یونان نے بھی مطالبہ کیا کہ اپائرس اور تھسلی بین الاقوامی تصدیق کے ساتھ یونان کو مل جائے۔ چنانچہ برلن میں دول عظمیٰ کی ایک کانفرنس نے اس مطالبہ کی سماعت کرکے باب عالی سے سفارش کی کہ یہ پورا علاقہ یونان میں شامل کر دیا جائے۔ سلطان نے اس کو نامنظور کر دیا۔ چونکہ دول عظمیٰ یونان کی خاطر دولت علیہ سے جنگ چھیڑنے پر آمادہ نہ تھیں اس لیے یہ مسئلہ بدستور قائم رہا پھر بھی گفت و شنید جاری رہی۔ دو سال کی جدوجہد کے بعد 1881ء میں طے پایا کہ تھسلی کا تقریباً پورا حصہ اور اپائرس کا ایک ثلث یونان میں شامل کر دیا جائے۔ یانینا اور وہ دوسرے علاقے جن میں مسلمانوں کی آبادی تھی یونانی سرحد کے باہر رکھے گئے۔"

(19) کریٹ' یورپ میں سلطنت عثمانیہ کا آخری مفتوحہ علاقہ تھا 1869ء میں دولت عثمانیہ کے قبضہ میں جمہوریہ وینس سے نکل کر آیا۔ اس کے یونانی النسل باشندے نہایت شورش پسند تھے۔ یہاں کے باشندوں نے 1912ء تک (جب تک کہ اس کا الحاق یونان سے ہوا) چودہ بار بغاوتیں کیں۔ واقعات کی تفصیلات کتب تاریخ میں مندرج ہیں۔ یونان ہمیشہ اس کے الحاق کا ساعی رہا اور جس زمانہ میں وہ آزاد نہ تھا اپنی بغاوتوں میں اس کو ابھارتا اور ہمزبان بناتا رہا۔ دول عظمیٰ اور یورپین قومیں ہمیشہ ریشہ دوانیاں کرتی رہیں۔ کیوں کہ یہاں کی

آبادی میں اکثریت یونانیوں اور عیسائیوں ہی کی تھی اور اس وجہ سے کہ حکومت مسلمان اور ایشیائی تھی۔ جو کہ یورپ کی آنکھوں میں خار کی طرح ہمیشہ کھٹکتی رہتی ہے۔ اہل یورپ کو کبھی چین نہ پڑا۔ بہرحال تاریخ کے صفحات دل آزار انسانیت سوز واقعات سے بھرے ہوئے ہیں۔ حکومت عثمانیہ نے جس قدر بھی مرحمت کی اسی قدر ان کی طغیانی بڑھتی گئی اور دول عظمیٰ کو مداخلت کے حیلے ملتے گئے۔ بالآخر 1897ء میں دول عظمیٰ نے کریٹ کی بندرگاہوں پر قبضہ کرکے پورے جزیرہ کی ناکہ بندی کر دی اور ایک اعلان اس مضمون کا شائع کیا کہ آئندہ یہ جزیرہ دول یورپ کے سایہ عاطفت میں رہے گا جو اس کی حکومت خود اختیاری کی ضامن ہونگی۔

(20) دول یورپ کی پروردہ نیشنل سوسائٹی نے یونانیوں کو توسیع مملکت کی جو شراب پلائی تھی اس کے نشہ سے وہ بدمست ہو رہے تھے۔ اسی نشہ میں انہوں نے اپنی سرحد عبور کرکے مقدونیہ کے بعض علاقوں پر حملہ کر دیا۔ کریٹ کا دول یورپ کا وہ معاملہ جو ابھی نمبر 19 میں گزر چکا ہے ان کے نشہ کے سکون کو کافی نہ ہوا۔ باب عالی کے لیے مدافعت ناگزیر تھی۔ چنانچہ 17 اپریل 1897ء کو باب عالی کی طرف سے بھی اعلان جنگ ہوا۔ ترکوں کے پہلے ہی حملہ میں یونانیوں کا نشہ ہرن ہو گیا اور بدحواس ہو کر ہر مورچ اور میدان جنگ سے بھاگتے رہے ایک ہی مہینہ میں اس جنگ کا جس کے لیے یونانی مدت سے بہت زیادہ بے قرار تھے خاتمہ ہو گیا۔ ترک ان کا پیچھا کرتے ہوئے تھسلی میں داخل ہو گئے اور قریب تھا کہ ایتھنز (پایہ تخت یونان) تک پہنچ جائیں مگر عین اس وقت جبکہ ادہم پاشا کمانڈر انچیف افواج عثمانیہ پیش قدمی کرتا ہوا بڑھ رہا تھا اور یونانی انتہائی ذلت کے ساتھ ہر جگہ شکست کھاتے ہوئے بدحواس بھاگ رہے تھے دول عظمیٰ کی مزاحمت نے حسب دستور قدیم ترکوں کی راہ روک لی۔ چنانچہ 20 مئی کو انہیں مجبوراً ایک عارضی صلح کے لیے راضی ہونا پڑا۔ مسٹر ایسکوینھ وزیر اعظم برطانیہ نے دول عظمیٰ کی نمائندگی کرتے ہوئے اعلان کیا کہ خواہ فتح کسی کی ہو نقشہ جغرافیہ یورپ کا بدلا نہ جائے گا۔ چنانچہ صلح میں ترکوں کو تھسلی کے مفتوحہ علاقہ کو خالی کرنا پڑا اور صرف تاوان جنگ چالیس لاکھ پونڈ اور تھسلی کا وہ تھوڑا سا حصہ جو سلطنت عثمانیہ کی سرحد پر واقع ہے لیکر اکتفا کرنا پڑا

(21) ان بے انصافیوں کی وجہ سے یا ذاتی مصالح کی بناء پر جرمنی آسٹریا' ہنگری دول عظمیٰ کی جمعیت سے علیحدہ ہو گئے تھے۔ تاہم انگلستان ' روس' فرانس نے متفقہ طور پر 1898ء میں باب عالی پر دباؤ ڈالا کہ وہ کریٹ سے عثمانی فوجوں اور ترکی عہدہ داروں کو بلالے اور

محض خراج قبول کرنے پر اکتفا کرے۔ پھر اس کے کچھ عرصہ بعد چند ہی سالوں میں کریٹ کا باضابطہ الحاق یونان سے دول عظمیٰ کی سرپرستی میں 1908ء میں کر دیا گیا اور سلطنت عثمانیہ کا یہ صوبہ بھی دول عظمیٰ نے آزاد کرا کے اس کو اپنا رہین منت بنا لیا۔ جس طرح انہوں نے یونان وغیرہ کو اپنا رہین منت بنایا تھا۔

(22) سلطنت عثمانیہ کے معاملات میں دخل دینے کے لیے دول عظمیٰ کو کسی خاص حیلہ کے تلاش کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ عیسائی رعایا کے حقوق کا تحفظ ہر مداخلت کے لیے کافی عذر ہو سکتا تھا۔ تمام یورپین حکومتوں نے اپنی اپنی جگہ پر یہ فرض کر رکھا تھا کہ سلطنت عثمانیہ میں عیسائیوں کے ساتھ بے انتہا مظالم ہو رہے ہیں اور اس کے لیے ہمیشہ ایسا پروپیگنڈہ کیا جاتا تھا جس میں دروغ گوئی ہنر شمار کی جاتی تھی۔ (محبت اور عداوت میں جھوٹ ان کے یہاں نہ صرف جائز بلکہ واجب بھی ہے) اور اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی ان کا نظریہ تھا کہ ان مظالم کے تدارک کی اس سے بہتر کوئی صورت نہیں کہ عیسائیوں کو دولت علیہ کی فرمانروائی سے آزاد کرا کر ان کی خود مختار حکومتیں قائم کرا دی جائیں 'یونان' 'سرویا' بلغاریا' رومانیا' کریٹ وغیرہ یہ تمام صوبے اسی مقصد کے ماتحت دول عظمیٰ کی سرپرستی میں سلطنت عثمانیہ سے علیحدہ کر دیئے گئے تھے۔ اب صرف دو علاقے ایسے اور رہ گئے تھے جن میں عیسائی آبادی کی اکثریت تھی۔ آرمینیہ اور مقدونیہ ان کی آزادی کے بغیر کب دول یورپ کو آرام و چین آ سکتا تھا۔ اس باب میں برطانیہ اور بالخصوص مسٹر گلیڈ سٹون بہت ہی پیش پیش رہے اور ایسے ایسے بے اصل رنجدہ اور دلخراش واقعات گھڑتے رہے جو کہ نہایت مبالغہ آمیز تھے یا جن کی کوئی واقعیت نہ تھی۔ خود عیسائیوں نے ان کی تردید کی ہے مگر یورپ اور بالخصوص برطانیہ نہایت بے شرمی اور ڈھٹائی کے ساتھ ان کی نشوونما اور اعلان کرتا رہا۔ تاریخ کی کتابیں ان سے بھری ہوئی ہیں۔ یورپ اور بالخصوص برطانیہ نے آرمینیوں کی مظلومیت اور دولت عثمانیہ کی ظالمیت کو جس انتہائی مبالغہ کے ساتھ سراہا ہے وہ بے مثال ہے۔ مولف دولت عثمانیہ نے بھی مثل دیگر مورخین کچھ مختصراً ذکر کیا ہے۔ (20)

(23) ابتدا ابتدا میں تو یہ یورپین حکومتیں انہیں صوبوں کے متعلق شور و غوغا مچاتی رہتی تھیں جن کی آبادی میں عیسائی اکثریت تھی انہیں کے حقوق کا تحفظ مداخلت کا حیلہ بنایا جاتا تھا اور ان کو دولت عثمانیہ سے کاٹ کر آزاد کرانا فرض منصبی قرار دیا جاتا تھا۔ تمام یورپین پریس اور ارباب اقتدار اسی کام میں لگے رہتے تھے انصاف و صداقت حق گوئی اور عدالت کو سبھوں نے بالائے طاق رکھ دیا تھا اگر کوئی منصف مزاج کوئی حق بات کہہ بھی دیتا تو اس

کو اس طرح دبا دیا جاتا تھا کہ کانوں کان کسی کو خبر بھی نہ ہوتی تھی۔ مقصد صرف یہ تھا کہ دولت عثمانیہ کو سخت بدنام کر کے دنیا سے نیست و نابود کر دیا جائے۔ ورنہ کم از کم یہ تو ضرور ہو جائے کہ اس بہادر اور ایشیائی قوم کو یورپ سے جلد از جلد نکال دیا جائے۔ اندرون حکومت بھی اس قدر کمزوریاں، ریشہ دوانیوں اور مختلف غداریوں سے پیدا کر دی گئی تھیں کہ باوجود ذمہ داران دولت علیہ کی انتہائی کوششوں اور بیداریوں کے روز بروز انحطاط ہی ہوتا جاتا تھا۔ ایک سوراخ بند کرتے تھے تو دوسرے چار پیدا ہو جاتے تھے۔ اس انحطاط کو دیکھ کر آخر میں دشمنوں کے حوصلے بڑھ گئے اور یہ اندازہ ہو گیا کہ جن صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے یا خالص مسلم آبادی ہے ان سے بھی فائدہ اٹھانا چاہیے۔ اس کے لیے صرف موقعہ کے منتظر تھے۔

ایک طرف تو وہ باب عالی پر زور ڈال کر ہر ممکن طریقہ سے عیسائی رعایا کو آزاد کرا رہے تھے دوسری طرف سلطنت کے اسلامی صوبوں پر قبضہ کے لیے ہر قسم کے بہانے تلاش کر رہے تھے۔ چنانچہ 1829ء میں معاہدہ اورنہ (ایڈریانوپل) کی رو سے یونان کی آزادی تسلیم کرائی گئی اور برطانیہ، روس، فرانس کی متحدہ سرپرستی میں خود مختار حکومت یونان کی قائم کر دی گئی۔ لیکن دوسرے ہی سال 1830ء میں الجیریا (الجزائر) پر فرانس نے قبضہ کر لیا۔ جب قبائل عرب نے اپنے ملک کے تحفظ کے لیے ہتھیار اٹھائے تو حکومت فرانس کی تمام قوت مقابلہ میں آ گئی۔ اور چالیس برس تک فرانسیسی سپاہیوں نے الجزائر میں قتل و غارت گری کا بازار گرم رکھا جو آج تک بھی جاری ہے۔ کسی کے چھوٹے منہ سے ان انسانیت سوز مظالم کے سامنے نہ حق بات نکلتی ہے اور نہ کوئی جمعیت ان غریب مظلوموں کی آزادی کے لیے بنائی جاتی ہے اور نہ ان کو آزاد کیا جاتا ہے۔ کیا یونان، کریٹ، بلگیریا، سرویہ وغیرہ کے باشندے انسان تھے اور یہ الجیریا وغیرہ کے باشندے انسان نہیں ہیں۔

(24) تونس دولت علیہ کا صوبہ تھا جس پر فرانس کی استعماری نظریں مدتوں سے للچا رہی تھیں۔ مگر کوئی حیلہ قبضہ کے لیے نظر نہ آتا تھا۔ 1878ء میں جبکہ برلن میں کانفرنس معاہدہ سان اسٹیفانو کی اصلاح و ترمیم کے لیے پرنس بسمارک کی زیر صدارت منعقد کی جا رہی تھی اور نہایت اہم مسائل زیر غور تھے اس وقت دولت علیہ کی تقسیم کا مسئلہ بھی زیر تجویز تھا۔ اس لیے مغربی حکومتوں کے نمائندے ایک دوسرے کو مشکوک نگاہوں سے دیکھتے تھے اور ہر ایک کو بدگمانی تھی کہ ممکن ہے کہ دوسرے نے باب عالی سے کوئی خفیہ

معاہدہ پہلے سے کر رکھا ہو۔ اس بدگمانی کو دور کرنے کے لیے کانگریس کے افتتاح کے وقت یہ تجویز پیش کی گئی کہ ہر سفیر اس امر کا اعلان کرے کہ مسائل زیر بحث سے متعلق اس کی حکومت نے کوئی خفیہ معاہدہ پہلے سے نہیں کر رکھا ہے۔ بیکنس فیلڈ (وزیر اعظم برطانیہ) اور سالسبری حکومت برطانیہ کی نمائندگی کر رہے تھے اس تجویز سے نہایت سراسیمہ ہوئے۔ لیکن انہیں اس کی مخالفت کرنے کی جرات نہ ہوئی۔ دوسری حکومتوں کے نمائندوں کی طرح مذکورہ بالا اعلان کرنا پڑا۔

(نوٹ) ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ برطانیہ نے اس سے پہلے باب عالی سے بھی خفیہ معاہدہ کر لیا تھا اور روس سے بھی کر لیا تھا۔ مگر روس کا خفیہ معاہدہ اخیر تک پردہ راز میں رہا اور باب عالی کا خفیہ معاہدہ مذکورہ ذیل طریقہ سے ظاہر ہو گیا۔

ابھی کانگریس کا اجلاس ختم نہیں ہوا تھا کہ 9 جولائی کو لندن کے اخبار گلوب میں معاہدہ سائپرس (قبرص) کا مسودہ شائع ہو گیا۔ جس کا واقعہ یہ تھا کہ ماروین نامی ایک سیاح جو کہ مشرقی ممالک میں سیاحت کر چکا تھا اور مختلف مشرقی زبانوں سے واقف تھا کہ برطانیہ کی وزارت خارجہ کی طرف سے معاہدہ مذکورہ کا ترکی مسودہ ترجمہ کے لیے اس کو دیا گیا۔ حالانکہ وہ دفتر وزارت میں کسی عہدہ پر مامور نہ تھا۔ اس شخص نے ایک بڑی رقم کے عوض گلوب کے ہاتھ ترجمہ کی ایک نقل فروخت کر ڈالی بہر حال معاہدہ سائپرس کی اشاعت سے برلن میں برطانوی سفارت پر گویا بجلی سی گر گئی۔ اور اگرچہ لندن میں فوراً مسودہ کی صحت سے انکار کیا گیا۔ تاہم برلن میں حقیقت حال زیادہ دنوں پوشیدہ نہ رہ سکی برطانوی نمائندوں کی بددیانتی سے کانگریس میں اس قدر برہمی پھیلی کہ اس کے درہم برہم ہو جانے کا اندیشہ پیدا ہو گیا۔ پرنس گورچاکوف (نمائندہ روس) اور ویڈنگٹن (نمائندہ فرانس نے علانیہ اپنے غصہ کا اظہار کیا۔ معاملہ نے نہایت نازک صورت اختیار کر لی تھی۔ اس کو مزید بدنمائی صرف بسمارک کی کوششوں سے رفع کی جا سکی۔ بسمارک نے "ایمان دار" دلال کی حیثیت سے فرانس اور برطانیہ کے درمیان مندرجہ ذیل مصالحت طے کرا دی جس کے بعد ویڈنگٹن کا سارا غصہ جاتا رہا۔ فرانسیسی اور برطانوی نمائندوں کے درمیان طے پایا کہ۔

(الف) انگلستان نے سائپرس کو جس طرح خفیہ طریقہ سے حاصل کر لیا ہے اس کی تلافی کے لیے فرانس کو اجازت دی جائے کہ وہ جس وقت کوئی مناسب موقعہ ہاتھ آئے تونس پر قبضہ کر لے۔ انگلستان کی طرف سے کوئی مخالفت نہ ہو گی

(ب) مصر میں جو مالیاتی انتظامات ہو رہے ہیں ان میں فرانس کو بھی انگلستان کے برابر دخل دیا جائے۔

(ج) شام کے رومن کتھولک عیسائیوں کے تحفظ کا جو دعوی فرانس زمانہ قدیم سے کرتا آیا ہے برطانیہ اسے تسلیم کرلے۔

اس معاہدہ کے بعد فرانس کو انگلستان کی طرف سے اطمینان ہو گیا اور وہ صرف مناسب وقت کا منتظر رہا۔ لیکن جب حملہ کے لیے کوئی معقول حیلہ نظر نہ آیا تو تونس کے فرانسیسی نمائندے "تھیودور روستان" نے بے بنیاد سفارتی شکایات تصنیف کرکے ولی تونس "محمد الصادق" کے سامنے ایسے بیہودہ مطالبات پیش کئے جن کو تسلیم کرلینا گویا اس علاقہ کو فرانس کے حوالہ کر دینا تھا اس کے بعد جو ہوا اسے "اسٹینلی لین پول" اپنی کتاب "بربری قزاق" میں یوں بیان کرتا ہے۔

> "ان باتوں کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طاقت ور حکومت نے جس پر مقابل کی مضبوط حکومتوں کی طرف سے کوئی روک نہ تھی۔ ایک نہایت کمزور لیکن ایماندار مملکت کے خلاف خفیہ طور پر اپنی جارحانہ کاروائیاں شروع کر دیں اور بالآخر الجزائر کی سرحد سے متصل بعض قبائل کے ہنگاموں کو عذر قرار دے کر جو ایک مضحکہ خیز عذر تھا تونس پر حملہ کا فیصلہ کرلیا۔ بے فائدہ محمد الصادق نے روستان (سفیر فرانس) کو یقین دلایا کہ قبائل میں امن امان قائم کر دیا گیا ہے۔ بے فائدہ اس نے تمام حکومتوں اور خصوصاً انگلستان سے اپیل کی۔ لارڈ گرانویل (وزیر خارجہ انگلستان) نے حکومت فرانس کے بیان پر یقین کرلیا کہ الجزائر اور تونس کے درمیان سرحدی علاقہ میں جو فوجی نقل و حرکت ہونے والی ہے اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ الجزائر کے علاقہ میں سرحدی قبائل کی جو یورشیں برابر ہوا کرتی ہیں ان کا خاتمہ کر دیا جائے۔ بے (محمد الصادق) کی آزادی اور اس کے علاقہ کا استقلال کسی طرح خطرہ میں نہیں ہے۔(21)

ان تصریحات کے باوجود اپریل 1881ء میں فرانسیسی فوجوں نے تونس پر حملہ کر دیا۔ اور 12 مئی کو محمد الصادق نے بالکل مجبور ہو کر معاہدہ قصر السعید پر دستخط کر دیئے۔ اس معاہدہ کی رو سے تونس پر فرانسیسی تسلط قائم ہو گیا اگرچہ حکومت نام کے لیے محمد الصادق کی رہی۔ محمد الصادق کے انتقال کے بعد سیدی علی بے حاکم مقرر ہوا لیکن اس کی حیثیت

بھی فرانسیسی محمیہ کے ایک عہدہ دار سے زیادہ نہ تھی۔ قبائل نے معاہدہ قصرالسعید کے بعد بھی ہتھیار نہیں ڈالے۔ تونس کے جنوبی صوبوں نے علانیہ بغاوت کردی اور کچھ دنوں تک ان صوبوں میں ہر طرف بدامنی پھیلی رہی۔ اس کے استیصال میں فرانسیسی فوجوں نے اپنی سابق روایات کے مطابق پوری سرگرمی دکھائی فاس پر بے دردی کے ساتھ گولہ باری کرکے لوٹ لیا گیا۔ مکانات معہ باشندو کے چلا دیئے گئے۔ قتل وغارت گری کا بازار گرم ہو گیا اور جو کچھ اس سے قبل الجزائر میں ہو چکا تھا وہ سب تونس میں دہرایا جانے لگا۔ کچھ دنوں بعد بتدریج حالات روبہ اصلاح ہونے لگے۔ خصوصاً جب روستان وہاں سے واپس بلا لیا گیا تو امن وامان قائم کرنے میں نسبتاً زیادہ آسانی ہوتی گئی۔ فرانس نے تونس کے ساتھ جو معاملہ کیا اس کے متعلق لین پول نے ایک فرانسیسی فاضل ہنری ڈی روشفورٹ کا مندرجہ ذیل قول نقل کرکے اصل حقیقت واضح کردی ہے۔ روشفورٹ لکھتا ہے۔

> "ہم نے تونس کی مہم کو ایک غیر معمولی فریب سے تشبیہ دی تھی۔ یہ صحیح نہ تھا۔ تونس کا معاملہ مثل قزاقی کے ہے جس کی شدت قتل کی وجہ سے اور بھی زیادہ ہو گئی ہے۔(22)"

(25) برطانیہ نے دولت علیہ سے دوستی کے جو حقوق وصول کئے وہ محض سائپرس اور تونس پر قبضہ کرنے سے ادا نہیں ہوئے بلکہ ضروری سمجھا گیا کہ اس سے اور بہت زائد وصول کیا جائے چنانچہ مصر پر نظر دوڑائی گئی جس کی کچھ تفصیل ہم پہلے ذکر کرچکے ہیں۔

(26) روس' برطانیہ' فرانس کے درمیان 1904ء سے 1907ء تک متعدد عہد نامے ہوئے جن کی بناء پر ان تینوں میں ایک قومی اتحاد قائم ہوا جس کی بنیاد حقیقتاً یہ قرار پائی کہ جہاں تک ممکن ہو اسلامی حکومتوں کے ٹکڑے ٹکڑے کرکے ان پر قبضہ کرلیا جائے۔ چنانچہ 1904ء میں جو معاہدہ فرانس اور انگلستان کے درمیان ہوا اس میں فرانس کو اجازت دی گئی کہ وہ جس طرح چاہے مراکش پر قبضہ کرلے۔ اس کے معاوضہ میں فرانس ان تمام حقوق سے دست بردار ہو گیا جو بزعم خود اسے حکومت مصر کی نگرانی میں حاصل تھے اور مصر کی فرمانروائی تمام تر انگلستان کے سپرد کردی۔

(27) اس کے بعد فرانس کی وساطت سے انگلستان اور روس کا وہ جھگڑا جو کہ ایران کی نسبت مدتوں سے چلا آتا تھا۔ 1907ء میں یوں ختم کیا گیا کہ ایران کی سلطنت معاہدہ کی رو سے دو حصوں میں تقسیم کردی گئی جن میں ایک (شمالی ایران پر) روس نے اور دوسرے (جنوبی ایران) پر انگلستان نے اپنا تسلط قائم کرلیا۔

مقدونیہ کی تقسیم و بد امنی اور مرزنگ پروگرام

یورپین حکومتوں کی سرگرمیاں یہاں تک محدود نہ تھیں۔ انہوں نے نہ صرف سلطنت عثمانیہ کے متعدد صوبوں پر قبضہ کر لیا بلکہ جو صوبے اس کی فرماں روائی میں باقی رہ گئے تھے ان کے اندر بھی ہر امکانی ذریعہ سے بدامنی اور بغاوت پھیلانے کی کوشش کی۔ ستم یہ تھا کہ اپنی ہی پیدا کی ہوئی شورشوں کو غدر قرار دے کر یہ حکومتیں عیسائی رعایا کے حقوق کے تحفظ کی خاطر دولت علیہ کے اندرونی اور انتظامی معاملات میں مداخلت کرتیں اور جہاں تک بس میں ہوتا سلطنت کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتیں۔ بلقانی صوبوں کی بغاوت اور آزادی انہیں حکومتوں کی حوصلہ افزائی اور پشت پناہی کی رہین منت تھی۔ اگر ایک طرف روس اور آسٹریا کی فوجیں سلطنت عثمانیہ کی سرحدوں پر حملہ آور ہوتی رہیں تو دوسری طرف ان گماشتے عیسائی رعایا کو مسلسل بغاوت کے لیے آمادہ کرتے رہے۔ مسٹر ناٹ جو تیس سال تک ترکی میں رہ کر وہاں کے حالات کا بچشم خود مطالعہ کر چکے ہیں اپنی کتاب "بیداری ترک" میں لکھتے ہیں۔

> "ایک مقولہ ہے کہ ہر قوم کو وہی حکومت ملتی ہے جس کی وہ مستحق ہوتی ہے۔ یہ مقولہ صحیح ہو سکتا ہے اگر کوئی قوم اپنی حسب خواہش نظام حکومت قائم کرنے کی آزادی رکھتی ہو۔ لیکن جہاں تک ترکی کا تعلق ہے اس کے باشندوں کو کوئی موقع اس حکومت کے حاصل کرنے کا نہیں دیا گیا جس کے مستحق تھے کیونکہ وہ ترکی کے طاقتور دشمنوں کی غرض یہ تھی کہ استبدادی حکومت کی برائیاں قائم رکھی جائیں اور جب کبھی ترکوں نے اپنے اندرونی معاملات کو درست کرنے کی کوشش کی کوئی نہ کوئی مسیحی طاقت اس خوف سے کہ ممکن ہے ایک اصلاح شدہ ترکی ایک قوی ترکی ثابت ہو یا تو مسلح فوجوں کے ساتھ اس پر ٹوٹ پڑی یا مجوزہ اصلاحی تبدیلیوں کی راہ روک کر کھڑی ہو گئی۔ علاوہ بریں جو طاقتیں ترکی مقبوضات کو اپنی مملکت میں شامل کرنے کے درپے تھیں وہ اس بات کی نگرانی کرتی رہتی تھیں کہ ترکی کی حدود میں امن نہ رہنے پائے اور وہ اس غرض سے شورشیں برپا کرتی رہتی تھیں وہ عیسائی کسانوں کو بغاوت کے لیے ابھارتیں اور ہنگامے برپا کراتیں تاکہ

> مداخلت کرنے اور ان علاقوں کو اپنی سلطنت میں شامل کرنے کا حیلہ ہاتھ آئے۔ یہ طاقتیں اپنے مقصد کے حصول کے لیے کسی طریقہ کے اختیار کرنے میں تامل نہ کرتیں مثلاً بھیڑیے فساد پھیلانے والوں میں سے ایک درویش جو روس کا تنخواہ دار مخفی ایجنٹ تھا۔ چند سال ہوئے اس نے روس کی ہدایت کے مطابق ایشیائے کوچک میں کافروں کے خلاف جہاد کی تبلیغ کی اور مسلمانوں کو عیسائی باشندوں پر حملہ کرنے کے لیے برانگیختہ کیا۔ اس قسم کے بہت سے واقعات پیش کئے جا سکتے ہیں جن سے دشمنان ترکی کی دغابازی اور ترکی کے ساتھ جو برتاؤ کیا گیا ہے اس کی ناانصافی ظاہر ہوتی ہے" (23)

ان شرانگیزیوں کے لیے سب سے زیادہ مناسب سرزمین مقدونیہ کی تھی۔ یہ سلطنت عثمانیہ کا وہ صوبہ تھا جس میں بلغاری، سروی، یونانی اور ترک سب ہی آباد تھے۔ چونکہ بلغاریا، سرویا اور یونان کی نوآزاد شدہ ریاستیں بالکل سرحد پر واقع تھیں اس لیے ان میں سے ہر ایک مقدونیہ کے اس حصہ کو جہاں اس کی ہم قوم آبادی زیادہ تھی اپنے اندر شامل کرلینا چاہتی تھی۔ دول عظمیٰ کی طرح ان ریاستوں کو بھی یقین تھا کہ سلطنت عثمانیہ عنقریب فنا ہو جائے گی اور چونکہ اس کے ترکہ کی تقسیم کے وقت مقدونیہ کی سب سے زیادہ حقدار یہی ریاستیں تھیں اس لیے ہر ایک اپنا حصہ پہلے ہی سے محفوظ کرلینا چاہتی تھی۔ پروپیگنڈا اور ہنگامہ پروری کا نہایت کامیاب تجربہ اس سے قبل ہو چکا تھا جس کی بناء پر پورا اطمینان تھا کہ یورپ کی بڑی طاقتیں اپنے چھوٹے بچوں کی حوصلہ افزائی میں مطلق دریغ نہ کریں گی۔ چنانچہ بلغاریا، سرویا اور یونان نے اپنی ہم قوم آبادی کو بغاوت پر آمادہ کرنے کے لیے مقدونیہ میں پہلے خفیہ ایجنٹ بھیجنے شروع کئے۔ اور پھر یہ دیکھ کر کہ مخفی تدبیریں زیادہ کارگر ثابت نہیں ہوتیں مسلح جتھے روانہ کئے۔ ان جتھوں نے پورے صوبہ میں ایک قیامت برپا کر دی۔ قتل و خون کا بازار گرم ہو گیا۔ گاؤں کے گاؤں جلانے لگے ان غارت گروں نے عیسائیوں اور ترکوں کی تمیز بھی اٹھا دی تھی۔ وہ اپنے علاوہ دوسرے فرقوں کے ساتھ یکساں مظالم کرتے تھے۔ چنانچہ اپریل 1908ء میں ایک بلغاری جتھے نے ایک یونانی پادری کو زندہ جلا دیا۔ مسٹر بائٹ لکھتے ہیں۔

> "اس واقعہ پر کسی نے کچھ نہیں کہا۔ اگر یہی چیز مسلمانوں نے کی ہوتی تو کیسا واویلا مچتا"

اصل وجہ یہ ہے کہ ریاستیں ایک دوسرے کے ساتھ بھی شدید عداوت رکھتی تھیں۔

ان کے جتھے جس قدر ترکوں کو نقصان پہنچاتے تھے اسی قدر آپس میں بھی قتل و خون کرتے رہتے تھے۔ یونانی جتھے مقدونیہ کی بلغاری اور سروی آبادی کو فنا کر ڈالنا چاہتے تھے۔ تاکہ مقدونیہ کا زیادہ سے زیادہ حصہ یونان میں شامل کیا جا سکے۔ یہی جذبہ بلغاری اور سروی جتھوں کا تھا۔ بلغاری جتھوں کی سرگرمیاں سب سے بڑھی ہوئی تھیں ان ہنگاموں سے بلغاریا کا اصل مقصد یہ تھا کہ دول عظمیٰ کو مقدونیہ کی جانب متوجہ کرے اور ان کی مداخلت سے بیش از بیش فائدہ اٹھانے کی کوشش کرے۔ دول عظمیٰ کو اسی دعوت کا انتظار تھا۔ انھوں نے آپس میں مشورہ کیا اور تمام یورپ کی طرف سے روس آسٹریا کو نمائندہ مقرر کرکے مقدونیہ کے لیے ایک نظام اصلاح مقرر کرنے کی خدمت سپرد کی۔ اس کام کے لیے اس سے بہتر انتخاب ممکن نہ تھا۔ چنانچہ 1903ء میں روس اور آسٹریا کی تیار کردہ اسکیم جو مرزنگ پروگرام کے نام سے مشہور ہے متفقہ طور پر منظور کی گئی اور مقدونیہ کی اصلاح کا کام شروع ہوا سلطان عبدالحمید کو بھی یورپ کی متحدہ قوت سے دب کر یہ مداخلت تسلیم کرنی پڑی۔ عثمانی فوجیں جس کشت و خون ' آتشزنی اور غارت گری کے استیصال میں ناکام ثابت ہوتی تھیں اسے ختم کرنے کا بیڑہ انہیں حکومتوں نے اٹھایا جن کی شہ پاکر یہ قیامت برپا کی گئی تھی۔ مقدونیہ کا صوبہ تین ولائتوں اسکوب' سالونیکا' موناستر پر مشتمل تھا۔ ان ولائتوں کے لیے ایک ترکی انسپکٹر جنرل حسین علمی پاشا مقرر کیا گیا اور اس کی نگرانی کے لیے روس اور آسٹریا کے نمائندے مقرر ہوئے۔ امن و امان قائم رکھنے کی خدمت ایک بین الاقوامی پولیس کو تفویض ہوئی جس کا افسر اعلیٰ ایک یورپین تھا۔ تینوں ولائتیں روس' آسٹریا' انگلستان' فرانس اور اٹلی کے درمیان اس طرح تقسیم کر دی گئیں کہ ہر حکومت اپنے حصہ کے امن و امان کی ذمہ دار قرار پائی۔ لیکن مشترکہ امور کی نگرانی ایک مرکزی مجلس کے سپرد ہوئی۔ اس نظام کے جاری کرنے کے کچھ دنوں بعد دول عظمیٰ نے مقدونیہ کے مالیات کی نگرانی کے لیے ایک بین الاقوامی کمیشن بھی مقرر کر دیا یوں فوجی اور مالی دونوں شعبے دولت علیہ کے ہاتھ سے حقیقتاً نکل گئے۔ لیکن مقدونیہ کی حالت میں کوئی نمایاں فرق پیدا نہ ہوا۔ امن و امان قائم کرنے میں بین الاقوامی پولیس بھی ویسی ہی ناکام ثابت ہوئی۔ جیسی عثمانی فوج اس سے پہلے ہو چکی تھی۔ یونانی اور بلغاری جتھوں کی غارت گری برابر رہی۔ شیویل لکھتا ہے کہ

> نسلی جماعتوں کی باہمی عداوتیں خصوصاً یونانیوں اور بلغاریوں کی اور پھر

> اس سے کسی قدر کم سرویوں ولاچیوں اور البانیوں کی دشمنیاں اس درجہ قابو سے باہر ہو گئی تھیں کہ عقل و خرد کو بلائے طاق رکھ دیا گیا تھا اور پوری آبادی اپنے آپ کو ہلاک کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ جو ریاستیں مقدونیہ کی سرحد پر واقع تھیں وہ ان غارت گروں کی پوری طرح مدد کر رہی تھیں جنہوں نے سلطان کے بعد مقدونیہ پر قبضہ کرنے کے لیے یہ انوکھا طریقہ اختیار کیا تھا۔ (24)

مرزنگ پروگرام اور مالیاتی کمیشن کا تقرر ترکوں کی غیرت ملی کے لیے ایک سخت تازیانہ تھا۔ ان کے لیے سب سے زیادہ تکلیف دہ چیز یہ تھی کہ بین الاقوامی مداخلت کی باگ روس اور آسٹریا کے ہاتھوں میں دے دی گئی تھی۔ جبکہ یہ دونوں سلطنتیں دولت عثمانیہ کی شدید ترین دشمن تھیں۔ چنانچہ ترکوں کا خیال تھا اور مسٹر نائٹ جیسے غیر جانبدار اشخاص کے اقوال سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے کہ روس اور آسٹریا کے بالقصد اس پروگرام کو ناکام بنایا اور ان کے نمائندوں نے اس کا نفاذ ایسے طریقہ پر کیا کہ اس سے عیسائیوں میں ہنگامہ و فساد کی آگ بھڑکتی ہی گئی۔ اس سے غرض یہی تھی کہ یورپین ٹرکی کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کی تجویز آگے بڑھائی جائے۔ (25)

1904ء کے بعد انگلستان، روس، فرانس نے مرد بیمار (ٹرکی) کے مال کے حصے بخرے کرنے کا قطعی فیصلہ کر لیا تھا اور 1905ء کے آخر میں لارڈ لینس ڈاؤن کے زیر قیادت دول عظمٰی کے متحدہ جنگی بیڑوں کا مظاہرہ ایک ایسا کھلا ہوا اشارہ تھا جسے ہر ترک سمجھ سکتا تھا۔ مسٹر بکسٹن جو بلقان کمیٹی میں انگلستان کے نمائندہ تھے اعتراف کرتے ہیں کہ ترکی حکومت کے دشمن خواہ ذاتی اغراض کی بناء پر یا نوع انسانی کی ہمدردی کے خیال سے حملہ آور ہو رہے تھے۔ یہ گفتگو بھی تھی کہ مقدونیہ کو تقسیم کر دیا جائے۔

جون 1908ء میں شاہ ایڈورڈ اور زار نکولس نے ریوال میں ملاقات کی اور مقدونیہ میں امن قائم کرنے کا ایک جدید پروگرام مرتب کیا۔ ترک مرزنگ پروگرام کا نتیجہ دیکھ رہے تھے ان میں اب کسی نئے تجربے کے برداشت کی طاقت نہ تھی اس میں شبہ نہیں کہ انگلستان اور روس کی یہ متحدہ سرگرمی سلطنت عثمانیہ کے یورپین صوبوں کے لیے مہلک ثابت ہوتی اگر نوجوان ترکوں نے عجلت سے کام لے کر علم انقلاب بلند نہ کر دیا ہوتا۔ جس سے صرف سلطان عبدالحمید کی استبدادی حکومت کا خاتمہ ہو گیا بلکہ دول عظمٰی کے سارے منصوبے بھی دفعتاً خاک میں مل گئے۔ (27)

ترکوں کے انقلاب پر یورپ کا چراغ پا ہونا

شخصی حکومت اور استبدادیت سے عام رعایائے سلطنت عثمانیہ تنگ تھی جس سے بیرونی طاقتوں کو آئے دن مداخلتوں اور ملک کو تقسیم کر لینے کا موقعہ ہاتھ آتا رہتا تھا اور اندرونی نظام بگڑتا جاتا تھا، جاسوسی کا اس قدر زور و شور اور اثر تھا کہ کسی ترک کو اپنی جان کے متعلق اطمینان نہ تھا اور نہ کوئی جماعت جس کا ادنی تعلق بھی ملکی اور انتظامی معاملات سے ہو سکتا تھا ملک میں رہ سکتی تھی۔ رشوت ستانی اور مظالم کا چاروں طرف چرچا تھا۔ بیرونی ملکوں اور دول عظمی کی سازشوں کے جال ہر طرف بچھے ہوئے تھے۔ ملک کی ہر قسم کی ترقی اور اس کی اسکیمیں دول اجنبیہ کی آنکھوں میں خار کی طرح کھٹکتی تھیں ان کے ایجنٹ کسی مفید ملک و وطن اسکیم کو پنپنے بلکہ پیدا ہونے نہ دیتے تھے اس لئے نوجوانان ترک مدتوں سے جمہوری حکومت قائم کرنا اور ملک کو ترقی دینا نہایت ضروری سمجھتے تھے۔ سابقہ بادشاہتوں اور ممالک اجنبیہ میں جو سابقہ معاہدات اور امتیازات چلے آتے تھے وہ ان کو ملک کو آگے بڑھانے میں ہر ہر قدم پر آڑے آتے تھے اس لئے ضروری تھا کہ نظام حکومت بدلا جائے اور تمام امتیازات سابقہ کو یک قلم اٹھا کر دستوری حکومت کا اعلان کر دیا جائے سلطان عبدالعزیز خاں مرحوم کے زمانہ سے اس پر متعدد مرتبہ کارروائیاں عمل میں آچکی تھیں۔ خود سلطان عبدالحمید خاں مرحوم نے بھی کچھ دنوں اس کو نافذ رکھ کر پھر منسوخ کر دیا تھا مگر اس مرتبہ اس جوش و خروش اور اتنی قوت اور انتظام سے اس کا اجرا کیا گیا کہ استبدادی طاقت کو بجز سر جھکانے کے کوئی چارہ نہ رہا۔ 5 جولائی 1908ء میں رسنا کی پہاڑیوں سے اس کا اعلان ہوا اور نہایت حیرت انگیز سرعت کے ساتھ اس کے شعلے تمام ملک میں پھیلنے شروع ہوئے سلطان نے ہر چند انتہائی کوششیں ان شعلوں کے بجھانے میں جاری کیں مگر ایک بھی کارآمد نہ ہوئی۔ فوجیں انقلاب کے حق میں ہوتی گئیں بڑے بڑے استبدادی افسر موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔ بالآخر جب ہر طرف سے مایوس ہو

گئی تو 24 جولائی کو علی الصباح انجمن اتحاد و ترقی کو بذریعہ تار اطلاع دی گئی کہ سلطان نے دستوری حکومت کا قیام منظور کر لیا۔ اور ایک ہفتہ بعد یکم اگست کو دستوری حکومت کی دفعات از جانب سلطان شائع کر دی گئیں اور 10 دسمبر 1908ء کو سلطان عبدالحمید مرحوم نے پارلیمنٹ کا افتتاح کر دیا۔ اس انقلاب میں ترک نوجوانوں نے جس حسن قابلیت کا مظاہرہ کیا اس سے تمام اجنبی ممالک انگشت بدنداں ہو گئے۔

ٹائٹ لکھتا ہے:۔

> "انجمن (اتحاد و ترقی) کے ان ناتجربہ کار نوجوانوں نے ایک جدید نظام کو بروئے کار لاتے اور اپنے ملک کی ان کثیر التعداد خطرات سے حفاظت کرنے جن سے نئی حاصل کی ہوئی آزادی بربادی کی زد میں تھی، ایسی دانشمندی، موقع شناسی، میانہ روی، فراست اور پیش بینی دکھائی کہ غیر ملکی اشخاص اس کا مشاہدہ کر کے حیرت زدہ رہ گئے انہوں نے امن و امان کو نہایت مضبوطی سے قائم رکھا۔ اور اس چیز میں خود قوم کے شاندار ضبط نفس اور حب وطن سے انہیں بڑی مدد ملی۔ اگرچہ وہ خود ان کے علاوہ ہزاروں آدمی استبداد اور اس کے کاسہ لیسوں کے مظالم اور غارت گری کا شکار رہ چکے تھے پھر بھی ان کی طرف سے انتقام کا کوئی جذبہ ظاہر نہیں ہوا انہوں نے صرف ان لوگوں کو سزائیں دیں جن کے جرائم نہایت سخت تھے ان ہی لوگوں کو برطرف کیا جنہوں نے اپنے افعال سے ظاہر کر دیا تھا کہ وہ دستور اساسی کے لئے خطرہ کا باعث ہیں۔ باقی سب کو معاف کر دیا۔ بیرونی طاقتوں سے ترکی کے تعلقات موقع شناسی اور مدبرانہ سیاست دانی کے ساتھ قائم کئے گئے۔ غلطیاں غیر معمولی طور پر کم ہوئیں۔ (28)

پارلیمنٹ کے افتتاح پر ممبروں نے مجلس کی کارروائیوں اور اپنی تقریروں میں جس قابلیت کا ثبوت دیا وہ انگلستان کے مدبروں کے لئے خلاف توقع ثابت ہوئی۔ سلطنت عثمانیہ کے باشندے ان کے خیال میں آئینی حکومت کے اہل نہ تھے ترکی پارلیمنٹ نے اس غلط فہمی کو دور کر دیا۔ نئی وزارت نے حکومت کے مختلف شعبوں میں اصلاحات کا کام شروع کر دیا اور اب ہر طرف ایک نئی روح محسوس کی جانے لگی۔ ان اصلاحات کا نتیجہ یہ ہوا کہ

چند ہی دنوں میں حکومت کا اعتماد رعایا کے دلوں میں قائم ہو گیا۔ انجمن اتحاد و ترقی کے ارکان میں بہت کم لوگ ایسے تھے جن کو نظم و نسق، فن سفارت ڈپلومیسی یا مالیات کا تجربہ تھا اور وہ اپنی اس کمی سے واقف بھی تھے۔ اس پر نظر رکھتے ہوئے انہوں نے حکومت کے سابق اعلیٰ عہدہ داروں کو اپنی جگہ پر برقرار رکھا اور ان کی لیاقت اور تجربہ سے فائدہ اٹھایا۔ البتہ ان عہدہ داروں کو جو رشوت خواری میں مشہور تھے برطرف کر دیا۔ جو لوگ برقرار رکھے گئے ان کی بھی سخت نگرانی کی جاتی تھی اور اگر وہ دستور اساسی کے خلاف کچھ کرتے تو فوراً علیحدہ کر دیئے جاتے تھے۔ چونکہ یہ عہدہ دار حقیقتاً سلطنت کے خیر خواہ تھے اس لئے انجمن کو ان سے کام لینے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔

دستور اساسی کے اعلان اور پارلیمنٹ کے افتتاح کے درمیانی چار مہینوں میں انجمن اپنے ارکان کی ایک جماعت کو انتظامی امور کی تعلیم دیکر حکومت کے مختلف محکموں کے لئے تیاری کر رہی تھیں اس طرح نوجوان ترکوں نے اپنی لیاقت کا سکہ بیرونی حکومتوں پر بھی بٹھا دیا۔ انہوں نے دول عظمیٰ کو لکھا کہ مقدونیہ میں ان کی نگرانی کی اب مطلق ضرورت نہیں۔ چنانچہ یورپین افسر واپس بلا لئے گئے اور بین الاقوامی کمیشن برخاست کر دیا گیا۔

انقلاب کے بعد ترکوں پر یورپ کا پہلا وار اور بوسینیا۔ ہرزیگونیا اور کریٹ پر دول یورپ کا مستقل قبضہ

نوجوان ترکوں کی صلح جوئی ان طاقتوں کی حرص و آز کو کم نہیں کر سکی جو کہ دولت عثمانیہ کی کمزوری سے فائدہ اٹھانے کے لیے ہر موقع پر تیار رہتی تھیں۔ دستور اساسی کے اعلان کے بعد سلطنت کی تمام رعایا کو دستوری آزادی حاصل ہو گئی تھی مگر اس کے دو صوبے

بوسینیا اور ہرزیگونیا جو تیس برس سے آسٹریا کی نگرانی میں تھے استبداد کی زنجیروں سے اب بھی رہا نہ ہوئے حکومت آسٹریا ان صوبوں کو دستوری اور آزادی دینے پر راضی نہ ہوئی چنانچہ جب ترکی پریس میں یہ تجویز پیش کی گئی کہ دستور کا نفاذ بوسینیا اور ہرزیگونیا میں بھی کر دیا جائے جو آسٹریا کی نگرانی کے باوجود سلطنت عثمانیہ کی فرماں روائی میں داخل ہیں تو آسٹریا کو سخت تشویش ہوئی اور اس نے یہ دیکھ کر کہ ترکی اس وقت مقابلہ کی قوت نہیں رکھتا اور انجمن اتحاد و ترقی ایک طاقت ور سلطنت سے الجھ کر اپنے اقتدار کو خطرہ میں ڈالنا پسند نہ کرے گی۔ 17 اکتوبر 1908ء کو دفعتاً ان صوبوں کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا اس واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے مسٹر نائٹ لکھتا ہے۔

> "یہ وہی پرانا قصہ تھا یعنی ایک رفعت پسند عیسائی حکومت اس خوف سے کہ ایک اصلاح شدہ ترکی کہیں ایک طاقت ور ترکی نہ بن جائے فریب کے ذریعہ سے اس کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ پیدا کر رہی تھی۔ آسٹریا کے اس فعل نے رجعت پسندوں کو قدیم نظام حکومت کے از سر نو قائم کرنے کا آخری موقعہ بہم پہنچایا اور انہوں نے اس موقعہ سے فائدہ اٹھایا"(29)

بوسینیا اور ہرزیگونیا کے الحاق سے دو ہی روز قبل مشرقی رومیلیا کے والی نے جو بلغاریا کا فرماں روا تھا زار بلغاریا کا قدیم لقب اختیار کر لیا پھر 12 اکتوبر کو کریٹ نے بھی مملکت یونان سے اپنے الحاق کا اظہار کر دیا۔

30۔ طرابلس اور اس پر اطالوی حملہ

ان دست درازیوں کا سلسلہ یہاں تک بھی ختم نہیں ہوا۔ افریقہ کی ساحلی حکومتیں جو پہلے سلطنت عثمانیہ میں شامل تھیں لیکن بعد میں سلطنت کی کمزوری سے رفتہ رفتہ خود مختار ہوتی گئی تھیں تو آبادیات اور تجارتی منڈی بنانے کی غرض سے مغربی حکومتوں کے لیے مرکز توجہ بن گئی تھیں چنانچہ فرانس نے الجزائر اور تونس پر قبضہ کر لیا اور انگلستان نے مصر میں اپنا تسلط قائم کیا۔ 1904ء میں فرانس اور انگلستان کے درمیان ایک معاہدہ ہوا جس میں یہ طے پایا تھا کہ انگلستان مصر پر بلا شرکت غیرے قابض رہے گا اور اس کے معاوضہ میں فرانس، مراکش کی مملکت پر جو اس وقت تک آزاد تھی قبضہ کرنے میں مدد دے گا۔

اب افریقہ کی ساحلی حکومتوں میں صرف طرابلس رہ گیا تھا جو کسی یورپین طاقت کے پنجہ میں نہیں آیا تھا اس کی وجہ زیادہ تر یہ تھی کہ طرابلس ایک ریگستانی علاقہ تھا جس میں کہیں کہیں نخلستان نظر آجاتے تھے اس کے ساحل پر کوئی بندر گاہ نہ تھی اور اس پر حکومت کرنے میں جو مصارف برداشت کرنے پڑتے ان کے معاوضہ کی کچھ زیادہ توقع نہ تھی۔ یہی سبب تھا کہ فرانس اور انگلستان نے کبھی اس کی جانب توجہ نہیں کی۔ لیکن اٹلی جو کہ نو آبادیات کے میدان میں ان دونوں سلطنتوں سے بہت پیچھے تھا اور 1881ء میں تونس پر فرانس کو قبضہ کرتے ہوئے دیکھ کر پیچ و تاب کھا کر رہ گیا اس کی نظر میں طرابلس ہی غنیمت معلوم ہوا۔ چنانچہ اطالوی وزارت خارجہ نے سلطان عبدالحمید مرحوم کے عہد ہی میں یورپین حکومتوں سے یہ تسلیم کرا لیا تھا کہ جب سلطنت عثمانیہ کے مقبوضات تقسیم ہونے لگیں تو طرابلس اٹلی کو دے دیا جائے گا۔ اس باب میں اٹلی نے متعدد معاہدوں کی بنا پر اپنا حق یہاں تک تسلیم کرا لیا تھا کہ 1908ء کے انقلاب عثمانی کے وقت تمام یورپین طاقتوں نے یہ سمجھ رکھا تھا کہ اسے جب وقت موقع ملے گا وہ فوراً طرابلس پر قبضہ کر لے گا اور یورپ کی کوئی حکومت اعتراض نہ کرے گی۔ (30)

بیسویں صدی کے آغاز میں طرابلس سلطنت عثمانیہ کا ایک صوبہ تھا اور براہ راست باب عالی کے زیر حکومت تھا اس کو حکومت خود اختیاری کے حقوق کبھی حاصل نہ تھے۔ جیسا کہ افریقہ کے دوسرے صوبوں نے حاصل کر لئے تھے۔ اس کی آبادی تمام تر مسلمانوں پر مشتمل تھی۔ شہر طرابلس اور دوسرے ساحلی مقامات پر ترک اور مور آباد تھے اور اندرونی علاقوں میں نیم آزاد عرب قبائل تھے۔ یہاں کے باشندوں نے کبھی حکومت کی تبدیلی کی خواہش نہیں کی۔ اور اٹلی کو ان کی طرف سے کسی شکایت کا موقعہ نہیں ملا لارڈ ایورسلے جس کے قلم سے ترکوں کی حمایت ایک لفظ بھی مشکل سے نکلتا ہے اعتراف کرتا ہے کہ طرابلس پر اٹلی کا حملہ تمامتر ایک جارحانہ فعل تھا جس کی تحریک اس وجہ سے ہوئی کہ فرانس نے تونس پر قبضہ کر لیا تھا جس پر جغرافیائی اور معاشیاتی دونوں حیثیتوں سے اٹلی کا حق زیادہ مضبوط تھا۔ لیکن جمہوریہ فرانس اور برطانیہ عظمیٰ اٹلی کے اس فعل سے متفق ہو گئیں اور یورپ کی دونوں مرکزی سلطنتیں بھی اس وقت تک اٹلی کی حلیف تھیں۔ (31)

1810ء کے اختتام تک حکومت اٹلی برابر یہ اعلان کرتی آئی تھی کہ وہ سلطنت عثمانیہ

کے کسی حصہ کی خواہشمند نہیں ہے جب یہ افواہ پھیلی کہ وہ طرابلس پر قبضہ کرنا چاہتی ہے تو اس کے وزیر خارجہ نے 2 دسمبر 1910ء کو اطالوی پارلیمنٹ میں اس کی پر زور تردید کی اور کہا کہ ہم سلطنت عثمانیہ کی بقا و سلامتی کے خواہش مند ہیں اور ہم چاہتے ہیں کہ طرابلس ہمیشہ ترکوں کے قبضہ میں رہے۔ لیکن اس اعلان پر دس مہینے بھی نہیں گزرے تھے کہ حکومت اٹلی نے دفعتاً باب عالی کو الٹی میٹم دے دیا حالانکہ اس درمیان میں فریقین کے تعلقات میں مطلق کشیدگی نہیں پیدا ہوئی تھی اور جواب کا انتظار بغیر پچاس ہزار فوج طرابلس پر حملہ کرنے کے لیے روانہ کر دی اس کے جنگی جہازوں نے پریویسیا کے شہر پر گولہ باری شروع کر دی جو بحرایڈریاٹک کے ساحل پر ترکوں کا مقبوضہ تھا اور بحرایجین کے متعدد جزیروں پر قبضہ کرلیا۔ ترکی جہازوں نے درہ دانیال میں پناہ لی۔ اٹلی کے مقابلہ میں ترکی جہازوں .ے حیرت انگیز شکست کا سبب یہ تھا کہ سلطان عبدالحمید نے اپنے عہد حکومت میں بحریہ کی طرف مطلق توجہ نہیں کی تھی اور چونکہ 1876ء کے بعد سے کسی بحری طاقت سے جنگ کی نوبت نہیں آئی تھی اس لے مدت سے ترکی جہاز شاخ زریں سے باہر بھی نہیں نکلے تھے۔ اگر سلطان عبدالحمید نے بحریہ کی طرف کچھ بھی توجہ کی ہوتی تو اٹلی کا طرابلس پر قابض ہو جانا قطعاً ناممکن تھا۔ کیونکہ سلطان عبدالحمید نے عثمانی بیڑے کو اتنا طاقتور بنا دیا تھا کہ وہ اس زمانہ سے یورپ میں تیسرے نمبر پر شمار ہوتا تھا طرابلس کے فوجی دستہ کی تعداد صرف بیس ہزار تھی چونکہ سمندر پر اطالوی جہازوں کا قبضہ تھا اس لیے جنگ شروع ہو جانے کے بعد بحری راستہ سے فوجی کمک بھی نہیں پہنچائی جا سکتی تھی بری راستہ مصر کا تھا جو اس وقت تک سلطنت عثمانیہ کے زیر سیادت اور اس کا باجگزار تھا لیکن مصر پر انگریزی تسلط قائم ہو چکا تھا اور حکومت برطانیہ نے ان سابق معاہدوں کی بنا پر جو طرابلس کی نسبت اٹلی سے ہو چکے تھے مصر کی غیر جانبداری کا اعلان کرکے اس کی راہ سے ترکی فوجوں کو طرابلس جانے سے روک دیا۔ ان تمام مشکلات کے باوجود نوجوان ترکوں نے ایسی شجاعت سے حملہ آوروں کا مقابلہ کیا کہ وہ سراسیمہ ہو گئے۔ عرب قبائل جس جانفروشی کے ساتھ وطن کی ایک ایک انچ کے لیے آخرت تک لڑتے رہے وہ ہمیشہ یاد رہے گی۔ اگرچہ بیرونی امداد کی تمام راہیں مسدود تھیں تاہم اعلان جنگ کے چند ہی دنوں بعد انور بے پوشیدہ طور پر طرابلس پہنچ گئے تھے اور انہوں نے اپنی حیرت انگیز قابلیت سے پورے ملک کو فوجی کیمپ بنا دیا تھا۔ الہلال کلکتہ نے ان کے عجیب و غریب کارناموں کی جو تفصیل بیان

کی ہے اس کا ایک ٹکڑا ذیل میں درج ہے۔

"انور بے نے طرابلس میں قدم رکھنے کے بعد اطراف و جوانب کے قبائل میں دعوت جہاد شروع کردی اور چند دنوں کے بعد جنود الٰہی کی عظیم الشان صفیں اس کے یمین و یسار نیزے بلند کئے ہوئے چلی آ رہی تھیں۔ وہی تن تنہا فرد مقدس دشمن کے بے شمار لشکر کے سامنے حریفانہ و مساویانہ آکر کھڑا ہوگیا اور پورے نو مہینوں کے اندر ایک دن بھی شکست و ہزیمت اس کے دامن عزت پر دھبہ نہ لگا سکی۔ تمام اہل عرب جن کو عثمانی خلافت کا قدیمی مخالف سمجھا جاتا تھا اوامر سلطانی کے آگے پوری اطاعت و فرمانبرداری کے ساتھ جھک گئے اور آج عثمانی فوج کے مفہوم میں بلا کسی اختلاف و شبہ کے عربی افواج داخل ہیں۔ عربی فوج کے مرتب کرنے میں جو مشکلیں اجتماع کے بعد پیش آئیں وہ ابتدائی مشکلات سے کم نہ تھیں۔ سب سے پہلی مشکل مختلف قبائل کی عربی عصبیت اور ان کی باہمی بغض و مخالفت تھی جو نسلا بعد نسل قدیم سے چلی آتی ہے انور بے نے تمام قبیلوں کو مختلف مؤثر اور دل میں اتر جانے والے طریقہ سے سمجھا کر (جو اس اعجاز آفریں سحر بیاں شخص کا وصف مخصوص ہے) ان میں باہم رشتہ داریاں قائم کرادیں اور اس طرح اس دعوت جہاد کی بدولت صدیوں کی عداوت اور دشمنیاں عہد اخوت و مودت سے بدل گئیں اور دوسری مشکل قبائل کی بے نظمی اور اصول جنگ سے ناواقفیت تھی۔ غازی انور بے نے بغیر اس کے کہ ایک لمحہ بھی فکر و تردد میں ضائع کرتے فوراً تمام قبائل کو چند پلٹنوں میں تقسیم کردیا اور ہر پلٹن کی تعلیم کے لیے ایک افسر مقرر کرکے شب و روز قواعد کرانی شروع کرادی۔ خود عربوں نے جب معلوم کرلیا کہ بغیر قواعد کے سیکھے ہم دشمنوں کے حملہ کا جواب نہیں دے سکیں گے اور ان کی ابتدائی دستبرد کا انتقام نہیں لیا جاسکے گا تو خود ان کے اندر جوش و غیرت نے ایک ایسی خارق عادت ذہانت اور قوت اخذ و تحصیل پیدا کر دی کہ مہینوں کی مشق چوبیس گھنٹہ کے اندر حاصل کرنے لگے قبائل کی

باہمی رقابت سے بھی اس موقع پر بڑی مدد ملی۔ انور بے نے اعلان کر دیا کہ جو قبیلہ پہلے قواعد جنگ کے امتحان میں کامیاب ثابت ہو گا اس کو عزت و ناموری کے نشان کے طور پر ایک طلاکار اطلس کا علم دیا جائے گا۔ یہ سنتے ہی ہر قبیلہ مسابقت کی کوشش کرنے لگا اور شب و روز پورا وقت فوجی نقل و حرکت اور قواعد سیکھنے اور مشق میں صرف ہونے لگا۔ اسی اثناء میں جب اطالویوں کی جراتوں نے ایک دو قدم آگے بڑھائے اور بم کے گولے بکثرت آنے لگے تو قبیلہ حسا نے ایک دن ہجوم کر کے ہلہ بول دیا۔ اور سینکڑوں اطالویوں کو تلوار کے گھاٹ اتار کر بقیۃ السیف کو کوسوں دور بھگا دیا۔ انور بے نے اس کارنامہ کی بڑی قدر کی اور اس قبیلہ کو اپنا وضع کردہ نشان عزت (اطلسی علم) عطا فرمایا۔ دوسرے قبائل نے جب قبیلہ حسا کے خیموں پر اس طلاء کے علم کو کہراتے دیکھا تو انور بے کے پاس دوڑے ہوئے آئے اور کہا کہ ہم کو بھی موقع دیا جائے کہ اس علم کے لینے کے استحقاق ثابت کریں۔ رات کے وقت جب اٹالین کیمپ طرابلس پر قابض ہونے کی خوشی میں بکثرت شراب پی کر بدمست پڑا تھا یکایک عرب قبائل صحرائی نعروں کی گونج سے ایک زلزلہ عظیم محسوس ہوا۔ چند لمحوں کے اندر بے تحاشا بھاگ گئے اور پورا اٹالین کیمپ خالی ہو گیا۔ اطالویوں کے جبن و نامردی نے اہل عرب کو ان کے اولین حملہ ہی میں فتح و نصرت کی ایسی چاٹ لگا دی کہ اب میدان قتال ان کے لیے بچوں کا کھیل بن کر رہ گیا۔ بغیر کسی نقصان کے انہوں نے کھیلتے کودتے ایک پورا اٹالین پلٹن برباد کر دی اور بکثرت مال غنیمت ساتھ لیے ہوئے اور وطنی گیت گاتے ہوئے عثمانی کیمپ میں واپس آ کر اپنی فتوحات ڈھیر کر دیں۔ اس مال غنیمت میں آٹھ سو سے زیادہ تو بندوقیں تھیں اور قسم کی اشیاء اس کے علاوہ۔ ان بندوقوں کی لوٹ سے انور بے بہت خوش ہوئے۔ کیونکہ عمدہ اسلحہ کی کیمپ میں بہت کی تھی۔ انور بے نے حکومت کے نام سے ان کا فورا نیلام کر دیا اور وہ دو ر عثمانی گنی پر فروخت کر دی گئیں۔ اس خدمت کے صلے میں ان کی آرزو نے

دلی کے مطابق طلاکار اطلسی علم ان کو عطا کیا گیا اس کے بعد تو ہر قبیلہ اس علم کے لیے اٹھنے لگا اور دشمن پر برق ہلاکت بن کر گرنے لگا ہر قبیلہ کی کوشش ہوتی کہ دوسروں سے زیادہ تعداد میں دشمنوں کو قتل کریں۔ اور سب سے زیادہ مال غنیمت کے انور بے کے سامنے انبار کر سکیں تاکہ شجاعت وطن پرستی کا اعلیٰ سے اعلیٰ نشان اور تمغہ صرف ہمیں کو حاصل ہو۔ یہاں تک کہ تھوڑے ہی عرصہ کے اندر عثمانی کیمپ میں پندرہ ہزار سے زیادہ قیمتی اور جدید ایجاد کی بندوقیں جمع ہو گئیں۔ (32)

صلحنامہ توران

اطالوی اس صورتحال سے بدحواس ہو گئے۔ انہوں نے شجاعت کا جواب درندگی سے دینا شروع کیا اور ایسے مظالم کیے کہ خود یورپین نامہ نگاروں نے جو اٹالین فوج کے ساتھ طرابلس میں تھے ان کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔ لیکن جب اس سے بھی کام نہ چلا تو وہ زیادہ زور بحری جنگ پر دینے لگے۔ چنانچہ مئی 1912ء میں روڈس اور بعض دوسرے جزائر ایجین پر قبضہ کرلیا۔ انہیں توقع تھی کہ ترک اب آسانی کے ساتھ صلح کے لیے راضی ہو جائیں گے۔ لیکن ترکوں نے صلح کرنے سے قطعی طور پر انکار کر دیا۔ وہ اس وقت تک جنگ جاری رکھنے کا عزم کر چکے تھے جب تک دشمنوں کو شکست دے کر بھگا نہ دیں۔ لیکن بدقسمتی سے اس درمیان میں البانیا میں بغاوت برپا ہو گئی اور پھر بلقان کے افق سے ایک متحدہ اور خوفناک جنگ کے بادل اٹھتے ہوئے دکھائی دینے لگے۔ ان حالات کے پیش نظر باب عالی نے بادل ناخواستہ صلح کی گفتگو شروع کی اور 18 اکتوبر 1912ء کو صلحنامہ پر محاربین کے دستخط ہو گئے۔ طرابلس پر اٹلی کا قبضہ تسلیم کر لیا گیا۔ اٹلی نے وعدہ کیا کہ بحرایجین کے مفتوحہ جزائر دولت علیہ کو واپس کر دے گا۔ لیکن یہ وعدہ کبھی شرمندہ ایفا نہ ہوا۔

بلقانی ریاستوں کا اتحاد اور جنگ بلقان

جس خطرہ کو محسوس کر کے ترکوں نے اٹلی سے صلح کی تھی وہ بہت جلد سامنے آگیا۔ ریاست ہائے بلقان نے تاریخ میں پہلی بار متحد ہو کر سلطنت عثمانیہ کے خلاف اعلان جنگ

کر دیا۔ جنگ بلقان بقول خالدہ ادیب خانم گویا جنگ عظیم کی ایک مشق تھی۔ دونوں کی تیاری اور تحریک میں روس کے وزیر خارجہ اسو ویسکی کی عقل شیطانی کار فرما تھی اسو ویسکی نے یہ تدبیر سوچی کے بلقانی ریاستوں کو متحد کر کے ترکوں کو بلقان سے نکال دے اور پھر آبنائے باسفورس اور قسطنطنیہ پر قبضہ کرلے چنانچہ اسی کوشش سے مارچ 1912ء میں سرویا اور بلغاریہ میں ترکی کے خلاف ایک معاہدہ ہوا۔ اسو ویسکی نے اس معاہدہ کی اطلاع فرانسیسی وزیر خارجہ موسیو انکارے کو دی اور لکھا کہ ابھی یہ کسی پر ظاہر نہ کیا جائے۔ بلغاریہ کو 18 کروڑ فرانک سامان جنگ فراہم کرنے کے لیے قرض دیا گیا۔ (33) اس معاہدہ کی ایک خفیہ دفعہ کی رو سے یہ طے پایا کہ اگر مقدونیہ کا کوئی حصہ فتح ہو جائے تو جو علاقے ان دونوں ریاستوں سے متصل واقع ہیں وہ ان میں شامل کر دیئے جائیں اور درمیانی علاقوں کو تقسیم روس کے فیصلہ پر چھوڑ دی جائے۔ (34)

روس ہی کی وساطت سے مئی 1912ء میں یونان اور بلغاریہ کے درمیان بھی ایک معاہدہ ہو گیا۔ یہ سرویا اور بلغاریہ کے معاہدہ سے ایک خاص امر میں مختلف تھا یعنی اس میں مقدونیہ کی تقسیم کا کوئی ذکر نہ تھا۔ (35)

پھر ستمبر 1912ء میں سرویا اور مونٹی نیگرو کے درمیان بھی ایک معاہدہ ہوا جس میں طے پایا کہ فریقین ترکی سے علیحدہ علیحدہ جنگ کریں اور کسی ترکی شہر یا گاؤں پر سرویا اور مونٹی نگرو کی فوجیں متحدہ طور پر قابض نہ ہوں۔

البانیہ کی بغاوت اور مانٹی نگرو کا اعلان جنگ

ان معاہدوں کے بعد اتحادی (انگلستان ' روس ' فرانس) چاہتے تھے کہ جنگ جلد از جلد شروع کر دیں۔ طرابلس کی جنگ جاری تھی اور وہ اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ دوسری طرف البانیہ کی بغاوت سے مقدونیہ کی تقسیم کا مسئلہ جو اس اتحاد کی اصل غرض اور غایت تھی بہت مشکل ہوتا نظر آ رہا تھا۔ البانیہ کا مطالبہ خود اختیاری تھا۔ وہ سقوطری ' یانینا ' مناستر اور قوصوہ کی ولایتوں کو متحد کر کے دولت علیہ عثمانیہ کے زیر سیادت ایک خود مختار مملکت قائم کرنا چاہتا تھا۔ ابتداء میں انجمن اتحاد و ترقی نے البانیہ کی بغاوت کی طرف زیادہ توجہ نہیں کی۔ لیکن جب سلطنت کی فوج نے بھی جو البانیہ میں تھی باغیوں کا ساتھ دینا شروع کیا۔ اور جون 1912ء میں مناستر کے فوجی دستے نے علانیہ بغاوت کر دی اور

موجودہ وزارت توڑ دینے کا مطالبہ کیا تو البانیہ کا مسئلہ اپنی پوری اہمیت کے ساتھ حکومت کے سامنے آیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جولائی میں محمود شوکت پاشا نے استعفا دے دیا اور انکی جگہ ناظم پاشا جو انجمن اتحاد و ترقی کا شدید مخالف تھا وزیر جنگ مقرر ہوا۔ اگست میں حلمی پاشا صدر اعظم کو بھی استعفا دینا پڑا۔ باغیوں کی یہ کامیابی دیکھ کر بلقانی ریاستوں کو یہ خطرہ ہوا کہ ممکن ہے کہ البانیہ ایک خود مختار مملکت تسلیم کرلی جائے اور سقوطری' یانینیا' مناستر اور قوصوہ کی ولایتیں اس میں شامل کر دی جائیں۔ اگر ایسا ہوا تو ان ریاستوں میں سے ہر ایک کو اس علاقہ سے محروم ہونا پڑے گا۔ جس کی وہ خصوصیت کے ساتھ خواہشمند تھی چنانچہ اس خوف سے کہ کہیں یہ موقعہ ہاتھ سے نکل جائے انہوں نے عجلت کی اور 8 اکتوبر 1912ء کو شاہ نکولس والی مونٹی نگرو نے باب عالی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔

زمانہ اعلان جنگ بلقان میں ترکی کی اندرونی حالت اور بلقان کا اعلان جنگ

اس زمانہ میں ترکی کی اندرونی حالت بہت نازک تھی قدامت پسند گروہ نوجوان ترکوں کی انتہاپسندی کا مخالف تھا۔ خود حکمران جماعت میں پھوٹ پڑ گئی تھی۔ فوج کے اس حصہ کو جو قدامت پسند تھا غلبہ حاصل ہو گیا تھا۔ محمود شوکت پاشا کے استعفا دینے کے بعد فوج کی تنظیم بوڑھے افسروں کے ہاتھ میں چلی گئی تھی' جو قابلیت میں نوجوان ترکوں سے بہت کم تھے۔ کامل پاشا صدر اعظم تھا اور اسے انگلستان کی حمایت پر اس قدر بھروسہ تھا کہ وہ بلقان کے خطرہ کو زیادہ اہم نہیں خیال کرتا تھا اسے یقین تھا کہ انگلستان بلقان پر حملہ نہ ہونے دیے گا۔ اسی یقین کی بناء پر اس نے 1912ء میں (67) ہزار تربیت یافتہ فوج کو جو بلقان کی سرحد پر جمع تھی منتشر کر دیا۔ لیکن جب جنگ چھڑ جانے میں شبہ کی گنجائش نہ رہی تو یورپین حکومتوں سے مداخلت کی درخواست کی گئی۔ چنانچہ ستمبر میں روس اور آسٹریا نے دول عظمیٰ کی طرف سے ایک احتجاجی نوٹ اتحادیوں کے پاس بھیجا۔ ظاہر ہے کہ اسووسکی کی سازشوں کے بعد اس احتجاج کا اثر کیا ہو سکتا تھا۔ یہ دیکھ کر کہ دولت علیہ اپنی کمزوری محسوس کر رہی ہے پہلے مونٹی نگرو اور پھر دوسری ریاستوں نے اعلان جنگ کر دیا۔ ترکی کے پاس ایک لاکھ فوج تھی اور وہ بھی زیادہ تر نئے رنگروٹوں کی۔ بلغاریہ کی فوج ایک لاکھ

اسی ہزار تھی۔ سرویا کی اسی ہزار' یونان کی پچاس ہزار (36)

ان ریاستوں نے سلطنت عثمانیہ سے علیحدہ ہونے کے بعد اپنی تنظیم یورپین حکومتوں کے طرز پر کرلی تھی اور انکی فوجیں یورپ کے فوجی نظام کے مطابق تربیت یافتہ تھیں۔ برخلاف اس کے نوجوان ترک ملک کی اصلاح کافی طور پر نہ کرسکے تھے جس کا ایک سبب تو یہ تھا کہ انہیں عنان حکومت ہاتھ میں لیے ہوئے صرف چار ہی سال گزرے تھے اور دوسری بڑی وجہ قدامت پسند گروہ کی مخالفت تھی۔ نئے قانون کے مطابق ترکی فوج میں عیسائی اور یہودی بھی بھرتی کیے گئے تھے۔ ان کو فوجی خدمت جس سے وہ اب تک بالکل بری تھے نہایت شاق تھی۔ چنانچہ جب لڑائی شروع ہوئی تو انہیں عیسائی اور یہودی سپاہیوں نے دھوکہ دیا اور سب سے پہلے میدان سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ ایک تو عثمانی فوجوں کی تعداد اتحادیوں کے مقابلہ میں یونہی کم تھی دوسرے عیسائیوں اور یہودیوں کی غداری سے اور زیادہ نقصان پہنچا۔

جنگ بلقان

اتحادیوں نے جنگ کا مقصد سلطنت عثمانیہ کی عیسائی صوبوں کی اصلاح حال ظاہر کیا تھا مگر حقیقتاً ان کے پیش نظر ذاتی اغراض تھیں۔ یونان' کریٹ اور بحرایجین کے دوسرے جزیروں پر قبضہ کرنے کے علاوہ خود براعظم پر بھی اپنی سرحدوں کی توسیع کا خواہش مند تھا۔ بلغاریہ کو اس بلغاریہ عظمیٰ کی آرزو تھی جس کا نقشہ صلحنامہ سان اسٹیفانو میں مرتب کیا گیا تھا۔ سرویا ان تمام علاقوں کو اپنے اندر شامل کرلینا چاہتا تھا۔ جو کہ سٹیفن ڈوشن کے زمانہ میں اس کی قدیم سلطنت کے جزو تھے وہ یہ بھی چاہتا تھا کہ اس کی مملکت کے حدود بحرایجین اور بحرایڈریاٹک کے ساحلوں تک پہنچ جائیں۔ مونٹی نگرو کی نظر البانیہ کے ایک حصہ پر تھی۔ (37)

8 اکتوبر کو مونٹی نگرو نے اعلان جنگ کر دیا تھا۔ بقیہ ریاستوں نے 18 اکتوبر کو اعلان کرکے اسی روز اپنی فوجیں عثمانی مقبوضات کی طرف روانہ کیں۔ حملہ کا سب سے زیادہ زور بلغاریہ کی طرف سے تھا جس کا مقصد خود قسطنطنیہ پر قبضہ کرنا تھا۔ چنانچہ 18 اکتوبر کو بلغاری فوجیں تھریس میں داخل ہوئیں اور 22 اکتوبر کو قری کلیسا اور 28 کو لولوبرگاس کے معرکوں میں ترکوں کو شکست دی۔ عثمانی فوج نے شتلجہ کے حصار میں پناہ لی جو قسطنطنیہ

سے تقریباً بیس میل کے فاصلہ پر واقعہ ہے۔ بلغاریوں نے شتلجہ پر کئی حملے گئے مگر نقصان اٹھا کر پسپا ہونا پڑا۔ وسط نومبر تک اور نہ کے سوا ترلیس کے اور تمام حصوں پر ان کا قبضہ ہو گیا۔ اس درمیان میں سرویا، مونٹی نگرو اور یونان نے بھی متعدد فتوحات حاصل کرلی تھیں۔ سرویا کی فوجیں سرحد عبور کرکے قدیم سرویا میں داخل ہوئیں۔ کسانو دو کے میدان میں 23 اکتوبر کو ترکوں سے مقابلہ ہوا دو روز تک جنگ جاری رہی۔ آخر میں ترکوں کو شکست ہوئی۔ سروی فوجوں نے اسکوپ پر قبضہ کرلیا۔ جو ان کی قرون وسطیٰ کی سلطنت کا پایہ تخت تھا اس کے بعد وہ مقدونیا میں بڑھتی ہوئی مناستر تک پہنچ گئیں۔ دوسری طرف مونٹی نگرو کی فوجوں نے سقوطری کے زبردست قلعہ کا محاصرہ کرلیا۔ یونانیوں کی فتوحات کا بھی یہی حال تھا۔ وہ بھی قریب قریب ہر معرکہ میں کامیاب رہے۔ 8 نومبر کو یونانی فوجوں نے سالونیکا پر قبضہ کرلیا مگر ان کی بحری فتوحات زیادہ اہم تھیں۔ آخر نومبر تک بحرایجین کے تقریباً تمام عثمانی جزائر پر یونان کا قبضہ ہو گیا تھا۔ ترکی بحریہ کی کمزوری بری فوجوں کی حالت سے بھی زیادہ افسوسناک ثابت ہوئی۔

عثمانی شکست کے اسباب

ترکوں کی حیرت انگیز شکستوں پر تبصرہ کرتے ہوئے ایورسلے لکھتا ہے۔

> عثمانی فوجوں کی بد نظمی اور ابتری کا منجملہ اور خاص اسباب کے ایک خاص سبب یہ بھی تھا کہ سامان رسد کا انتظام مطلق نہ تھا۔ تین تین چار چار روز تک فوجوں کا بغیر غذا کے رہ جانا کوئی استثنائی واقعہ نہ تھا بلکہ عموماً ایسا ہی ہوتا تھا۔ دوسرا سبب یہ تھا کہ یورپ کی اس جنگ میں عثمانی فوجوں میں بڑی تعداد دیہاتی عیسائیوں کی تھی جو پہلی بار جبری طور پر بھرتی کئے گئے تھے۔ ان کی ہمدردی تمام تر دشمن کے ساتھ تھی اور اس میں شبہ نہیں کہ ترکی صفوں کے ٹوٹنے کے وقت فوج کا انتشار اور فرار زیادہ تر انہیں کے بھاگنے کی وجہ سے ہوتا تھا اور جو لوگ باقی رہ جاتے تھے وہ اپنے گھروں کو بھاگ جاتے تھے۔(38)

خالدہ ادیب خانم اپنی سوانح میں لکھتی ہیں۔

بد نظمی کے لحاظ سے جنگ بلقان سے بڑھ کر کوئی جنگ نہیں ہوئی ہے۔ حفظان صحت کا کوئی انتظام نہ تھا اور خطوط مدافعت کے پیچھے انتظامات کی ابتری نہایت افسوسناک تھی۔ بھیڑیں گاڑیوں میں بھوکی مر رہی تھیں اور آٹا گوداموں میں سڑ رہا تھا لیکن نصف میل سے کم ہی فاصلہ پر لوگ فاقہ سے جان دے رہے تھے۔ جب ترک پناہ گزین قتل عام سے بھاگ کر سراسیمہ قسطنطنیہ پہنچے جب باہر سے آنے والوں اور فوج میں ہیضہ پھیلا۔ جب آبادی کی آبادی مسجدوں کے صحن میں سردی کی شدت سے دم توڑتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی تو قسطنطنیہ کی مصیبت کا منظر اتنا ہولناک تھا کہ خیالی معلوم ہوتا تھا۔(39)

یورپ کا عہد ناموں کا پابند ہونا

آغاز جنگ میں دول عظمیٰ نے اعلان کیا تھا کہ خواہ کوئی فریق بھی کامیاب ہو بلقان کی موجودہ حالت برقرار رکھی جائے گی۔ اس اعلان کا سبب یہ تھا کہ انہیں ترکی کی کامیابی کا قوی اندیشہ تھا اور جس طرح 1897ء میں انہوں ایک ایسے ہی اعلان سے یونان کی پشت پناہی کی تھی اور ترکوں کو یونانی فتوحات سے دست بردار ہونا پڑا تھا۔ اسی طرح ریاست ہائے بلقان کا تحفظ بھی پہلے ہی سے کر لیا گیا تھا۔ لیکن جب خلاف توقع عثمانی فوجوں کو تقریباً ہر معرکہ میں شکست ہوئی اور دشمن حیرت انگیز طور پر کامیاب ہونے لگے تو انہیں زبانوں نے جو یہ اعلان کر چکی تھیں اب اس کے خلاف آواز اٹھائی اور یہ کہا جانے لگا کہ بلقانیوں کو ان کی فتوحات سے محروم کر دینا ہرگز قرین انصاف نہیں۔ مسٹر ایسکوبتھ وزیر اعظم برطانیہ نے دول عظمیٰ کی ترجمانی کرتے ہوئے فرمایا۔

> "مشرقی یورپ کے نقشہ کو از سر نو مرتب کرنا ضروری ہے اور فاتحین کو ان ثمرات سے محروم نہیں کرنا چاہیے جو اتنی گراں قیمت پر انہیں حاصل ہوئے ہیں۔"(40)

عارضی صلح

دول عظمیٰ کی تحریک پر 3 دسمبر کو ترکی اور بلغاریہ اور سرویا کے درمیان ایک عارضی صلح

ہو گئی۔ یونان اور مونٹی نگرو سے جنگ جاری رہی۔ اب تک جنگ کا نتیجہ یہ تھا کہ ترک مقدونیا اور تقریباً تمام تھریس اور اپائرس سے خارج ہو چکے تھے۔ قسطنطنیہ کے علاوہ یورپ میں صرف اورنہ، یانینا اور سقوطری پر ان کا قبضہ باقی رہ گیا تھا۔ لیکن یہ تینوں شہر بھی دشمن کے محاصرہ میں تھے۔

صلح کانفرنس لندن

16 دسمبر 1912ء کو لندن میں صلح کانفرنس کا اجلاس شروع ہوا۔ اورنہ (ایڈریانوپل) کے مسئلہ پر سب سے زیادہ مشکل پیش آئی اور یہی مسئلہ کانفرنس کی ناکامی کا باعث ہوا بلغاریہ نے مستقل صلح کے لیے اورنہ کے حصول کو ایک لازمی شرط قرار دیا تھا۔ باب عالی اس پر راضی نہ تھا۔ لیکن جب 17 جنوری 1913ء کو دول عظمیٰ کی طرف سے ایک نوٹ باب عالی میں بھیجا گیا۔ اور اس میں یہ مشورہ دیا گیا کہ اورنہ ریاست ہائے بلقان کے حوالہ کر دیا جائے اور جزائر ایجین کا مسئلہ دول عظمیٰ کے فیصلہ پر چھوڑ دیا جائے تو صدر اعظم کامل پاشا نے جو کہ انگلستان کا دوست تھا ترکی کی کمزوریوں کا لحاظ کرتے ہوئے اس مشورہ کو قبول کرنے پر آمادگی ظاہر کی۔ قریب تھا کہ مجلس وزراء کامل پاشا کی اس تحریک سے متفق ہو کر دول عظمیٰ کے نوٹ کا جواب روانہ کر دے اور ترکی کے قتل نامہ پر خود اسی کی مہر ثبت کر دی جائے کیونکہ اورنہ سے دست برداری حقیقتاً قسطنطنیہ کی دست برداری کا مقدمہ ہوتی لیکن عین وقت پر ایک غیبی ہاتھ نمودار ہوا جس نے مجلس وزراء کی یادداشت کو جو دول عظمیٰ کے پاس جانے کے لیے مرتب ہو چکی تھی ٹکڑے ٹکڑے کرکے خود موجودہ وزارت کا خاتمہ کر دیا۔ اس کے بعد جو وزارت قائم ہوئی اس نے اورنہ کو حوالہ کرنے سے قطعاً انکار کر دیا جس کے بعد ہی صلح کانفرنس بھی برخاست ہو گئی۔ (41)

انقلاب وزارت

یہ انقلاب وزارت اسی بطل حریت کا رہین منت تھا جس نے 1908ء میں ملک کو سلطان عبدالحمید کے استبداد سے نجات دلا کر دستوری حکومت قائم کر دی تھی۔ انور بے طرابلس کی مہم سے فارغ ہو کر قسطنطنیہ پہنچ چکے تھے۔ اسی خاموشی اور جرات کے ساتھ جو 1908ء کے انقلاب میں اس درجہ کامیاب ہوئی تھی وہ چند جانفروشوں کو لے کر دفعتاً ایوان وزات

میں داخل ہوئے-

ان کے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا جس پر افسران جنگ اور عام پبلک کے دستخط تھے اور اس میں تبدیلی وزارت یا انکار صلح پر زور دیا گیا تھا- فوج کا جو حصہ وزارت کے ہاتھ میں تھا اسے پہلے ہی کسی بہانہ سے قسطنطنیہ سے باہر بھیج دیا گیا تھا اور جس قدر فوج شہر میں تھی وہ سب قومی جماعت کے ساتھ تھی جس کی قیادت انور بے کر رہے تھے- وزراء ان حالات سے بے خبر اپنے کام میں مشغول تھے کہ انور بے اندر داخل ہوئے- ناظم پاشا وزیر جنگ کے ایڈی کانگ نے اس جماعت کو روکنے کی کوشش کی اور پستول چلایا معاً دوسری طرف سے بھی گولی چلی اور ناظم پاشا وہیں گر کر ٹھنڈا ہو گیا- بہت جلد انور بے نے وزارت خانہ پر قبضہ کرلیا- کامل پاشا کو استعفا دینا پڑا اس کی جگہ محمود شوکت پاشا صدر اعظم مقرر ہوئے-
(42)

البانیا کی آزادی

عین اس وقت میں جبکہ بلقانی ریاستیں لڑ رہی تھیں اہل البانیا نے ولونا میں ایک مجلس منعقد کرکے سلطنت عثمانیہ سے اپنی کامل آزادی کا اعلان کر دیا- ان کو خطرہ تھا کہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو البانیا کا بھی وہی حشر ہو گا جو بلقان کے دوسرے عثمانی مقبوضات کا ہونے والا ہے-

اس اعلان سے دول عظمیٰ کے ہاتھ مضبوط ہو گئے اور انہوں نے لندن کانفرنس میں نہ صرف یہ کہ سرویہ کو مجبور کرکے البانی بندر گاہوں سے دست بردار کرایا بلکہ البانیا کا استقلال بھی باضابطہ طور پر تسلیم کر لیا- البانیا ایک خود مختار ریاست قرار دی گئی جس کے فرمانروا کا انتخاب دول عظمیٰ کے فیصلہ پر رکھا گیا- اس فرمانروا کی مدد کے لیے ایک بین الاقوامی کمیشن کا تقرر طے ہوا- سرحدوں کی تعیین بھی ایک خاص کمیشن کے سپرد کیا گیا (یہ صوبہ البانیا اور نووط قوم کا وطن ہے جو کہ ترقی مملکت میں نہایت زیادہ بہادر اور سلطان عبدالحمید مرحوم کے خصوصی محافظ تھے اور سب کے سب مسلمان ہیں) انہیں کی بغاوت اور البانی فوج کی ہمدردی اور مطالبہ تبدیلی وزارت کی بناء پر محمود شوکت نے استعفا دیا تھا اور کامل پاشا کی وزارت قائم ہوئی تھی-

لندن صلح کانفرنس تبدیلی وزارت کی وجہ سے ناکام ہو کر چونکہ ٹوٹ گئی تھی تو عارضی صلح بھی جاتی رہی اور پھر تمام بلقان میں جنگ جاری ہو گئی- وزارت جدیدہ اس قلیل مدت

میں کوئی معتدبہ انتظام نہ کر سکی جس کی وجہ سے جو مقامات بلقان میں ترکوں کے پاس باقی رہ گئے تھے وہ بھی ہاتھ سے نکل گئے- بالاخر 19 اپریل 1913ء کو ترکوں اور بلغاریوں میں بولیر میں عارضی طور پر صلح ہوئی اور مستقل صلح کے لیے لندن میں دوبارہ صلح کانفرنس کے انعقاد کی کوشش شروع کی گئی چنانچہ کانفرنس کا انعقاد ہوا اور بہت زیادہ بحث اور گفتگو کے بعد 30 مئی کو صلح نامہ لندن پر فریقین کے دستخط ہو گئے- جس کی بناء پر یورپین ترکی کے تمام علاقے بے استثناء البانیا جو خط اینوس و میڈیا کے مغرب میں واقع تھے ریاستہائے بلقان کو دے دیئے گئے- البانیا کی سرحدوں نیز اس کے متعلق تمام دوسرے مسائل کا فیصلہ دول عظمٰی پر چھوڑ دیا گیا- کریٹ کے علاوہ اور تمام "جزائر ایجین" کی قسمت کا فیصلہ بھی دول عظمٰی ہی پر چھوڑا گیا- باب عالی نے کریٹ کا الحاق یونان سے منظور کر لیا- مالی معاملات کا تصفیہ پیرس کے بین الاقوامی کمیشن کے سپرد کیا گیا اور حکومتی اختیارات قومیت اور تجارت کے مسائل کا مخصوص معاہدوں سے طے ہونا قرار پایا- (43)

جنگ تقسیم بلقان

ترکی یورپین علاقوں کی تقسیم میں جو کہ دوسری لندن کانفرنس میں ریاست بلقان کو دے دیا گیا تھا نہایت زیادہ اختلاف ہوا ہر ایک اپنے لیے زیادہ سے زیادہ چاہتا تھا اور ایسے مقامات کو انتخاب کرتا تھا جو کہ دوسرے کے نزدیک بہت اہم اور ضروری تھے- یہاں تک کہ نوبت جنگ کی آ گئی- اگرچہ اپنی اپنی کامیابی پر ہر ایک سرمست اور سرشار تھا مگر ان میں بلغاریہ سب سے زیادہ مغرور اور سرمست تھا اس نے حریفوں کی طاقت سے بے پروائی کرتے ہوئے 29 جون 1913ء کو آدھی رات میں بغیر کسی اطلاع یا اعلان جنگ کے یونانی اور سروی دستوں پر حملہ کر دیا- دوسرے روز ایک لاکھ بلغاری فوج نے اس سروی فوج پر جو کہ اس سے قریب تھی ہلہ بول دیا- سروی فوج اس ناگہانی حملہ سے پہلے تو پسپا ہوئی لیکن یکم جولائی کو مونٹی نگرو کی مدد سے جم کر مقابلہ کیا-

(بلغاریہ کے تیور دیکھ کر پہلے سے اتحادیوں (سرویا' مونٹی نگرو' یونان' رومانیہ) نے آپس میں معاہدہ اتحاد کر لیا تھا) اور 2 جولائی کو بلغاری فوج کو شکست دے کر اس کی بہت سی توپیں چھین لیں- 4 جولائی کو پھر مقابلہ ہوا اور بلغاریہ کو پھر شکست ہوئی- 8 جولائی کو سروی فوج نے اشتیب پر قبضہ کر لیا اور اب بلغاری پسپا ہو کر اپنی سرحد کی طرف روانہ ہو

گئے۔ اس درمیان میں یونانی فوجوں نے بھی پیش قدمی کرکے بلغاری فوج سے بمقام کلکش جنگ کی بلغاری بری طرح ہارے۔ اس کے بعد متعدد لڑائیاں اور ہوئیں جن میں بلغاریوں کو لگاتار شکستیں کھانی پڑیں اور ان کے لیے صرف اپنی سرحد کی راہ کھلی رہ گئی۔ بلغاریا کی اس نازک حالت کو دیکھ کر ترکوں نے بھی فائدہ اٹھایا اور 15 جولائی کو انور پاشا تھریس میں داخل ہوئے اور 20 جولائی کو اورنہ پر قبضہ کرلیا۔ اس کے بعد ڈیموٹیکا اور قرق کلیسا بھی انھوں نے دوبارہ فتح کرلیے۔

عارضی صلح

جنگ تقسیم صرف ایک ماہ تک جاری رہی لیکن اس قلیل مدت میں بلغاریا کی حالت نہایت نازک ہوگئی۔ اس کی فوجوں کو ہر معرکہ میں شکست ہوئی۔ دشمن کی فوجیں ہر طرف سے بڑھتی ہوئی آرہی تھیں۔ بالاخر اسے مجبو ہو کر دول عظمیٰ سے صلح کی درخواست کرنی پڑی۔ 31 جولائی کو فریقین ایک عارضی صلح پر راضی ہوئے اور طے پایا کہ ایک صلح کانفرنس منعقد کی جائے جس میں ریاست ہائے بلقان کے نمائندہ شریک ہوں لیکن دول عظمیٰ کے نمائندہ شرکت نہ کریں۔

صلحنامہ بخارسٹ

بخارسٹ صلح کانفرنس کا اجلاس فوراً شروع کر دیا گیا اور اس سرعت کے ساتھ معاملات فیصل ہوئے کہ 10 اگست 1913ء کو محاربین نے صلح نامہ پر دستخط کر دیے سب سے زیادہ نقصان بلغاریہ کو برداشت کرنا پڑا۔ مقدونیہ (جس کے لیے اس نے جنگ تقسیم چھیڑی تھی) یونان اور سرویا میں تقسیم کر دیا گیا اور اس کو تقریباً کلیتاً محروم کر دیا گیا۔

دولت عثمانیہ کے ساتھ کوئی معاہدہ 29 ستمبر تک نہ ہو سکا۔ 29 ستمبر کو بالاخر باب عالی اور بلغاریا کے درمیان بھی صلح ہو گئی۔ تھریس کا بڑا حصہ ترکوں کو واپس مل گیا اس میں اورنہ، ڈیموٹیکا اور قرق کلیسا کے اہم شہر شامل تھے۔ یورپ میں دولت علیہ کی کائنات صرف اسی قدر اور رہ گئی تھی۔ باقی سارا علاقہ ریاستہائے بلقان میں تقسیم ہو گیا۔

بلقان کی دونوں جنگوں میں ترکوں کے مقتولوں اور زخمیوں کا شمار ایک لاکھ نفوس کا کیا گیا ہے اور مصارف 8 کروڑ پونڈ کیا گیا ہے۔ علاقہ اور آبادی کے لحاظ سے اس کی آبادی میں

سے بیالیس لاکھ انتالیس ہزار دو سو نفوس اس کی حکومت سے نکل گئے اور صرف دس ہزار آٹھ سو بیاسی مربع میل اس کی حکومت میں رہ گئے۔

خالدہ ادیب خانم جنگ بلقان کے نتائج اور اثرات میں منجملہ دیگر امور مندرجہ ذیل امور بھی تحریر فرماتی ہیں۔

(1) شکست کی مصیبت تو تھی ہی اس پر طرہ یہ ہوا کہ بلقانیوں نے مسلمانوں کی آبادی کو جو جنگ میں شریک نہ تھی اور جس میں زیادہ تر عورتیں ' بچے اور بوڑھے تھے قتل کرنا شروع کر دیا۔ اور یہ لوگ بھاگ بھاگ کر ترکی میں پناہ لینے لگے۔ اسیران جنگ کو قتل کرنا ' ان کو فاقوں مارنا ' ان کے ہاتھ پیر کاٹنا ' عام باشندوں کو اذیت پہنچانا اور ان کا خون بہانا ' ان سب چیزوں کی ابتداء زمانہ حال میں بلقانیوں نے مسلمانوں کے مقابلہ میں کی۔

(2) مغرب ان ہولناک مظالم کو چپ چاپ دیکھتا رہا۔ مگر جب بلقان کی ریاستوں نے ایک دوسرے کی عیسائی رعایا کے ساتھ بھی یہی حرکتیں شروع کیں تو مغرب سے مخالفت کی آواز اٹھی۔ دوسری جنگ بلقان کے بعد کارنیگی نے ایک بین الاقوامی کمیشن تحقیقات کے لیے بھیجا۔

(3) جب ترکی عورتوں نے استنبول کے یونیورسٹی ہال میں جمع ہو کر یورپ کی بادشاہ بیگموں سے اپیل کی تھی کہ انسانی ہمدردی کی خاطر بلقان کی مسلم آبادی کی حمایت کریں تو جواب تک نہیں ملا تھا۔ ترکوں نے دیکھا کہ مسلمانوں کی فریاد سے یہ بے اعتنائی اور عیسائیوں کو اسی حال میں دیکھ کر یہ جوش و خروش تو ان پر بہت برا اثر ہوا۔ مقدونیہ سے ہزار ہا مسلمان بھاگ کر اناطولیہ میں آئے تھے اور اپنی مظلومی کی داستان سناتے تھے اس کی وجہ سے اناطولیہ میں مسلمانوں اور عیسائیوں کے تعلقات جو اب تک بہت اچھے تھے بہت خراب ہو گئے۔ (44)

مندرجہ بالا احوال اور واقعات سے جو کہ اکثر یورپین مورخین سے نقل کئے گئے ہیں ہر سمجھ دار شخص مندرجہ ذیل نتائج نکالنے پر مجبور ہے۔

(1) انگریز اور یورپین قومیں ایشیاء اور افریقہ کے باشندوں کو نہ انسان سمجھتی ہیں اور نہ انسانی حقوق دیتی ہیں۔ ان کا دعوے عام انسانوں کی ہمدردی کا بالکل جھوٹا ہے۔

(2) انگریزوں اور یورپین اقوام کا نعرہ خدمت انسانی صرف اپنی نسل اپنی رنگت اپنی سرزمین یورپ تک محدود ہے۔ جو لوگ یورپین نسل اور سپید رنگ اور سرزمین یورپ

کے باشندے نہیں ہیں وہ ہر اس فعل کے مستحق ہیں جو مملوک حیوانات کے ساتھ کئے جاسکتے ہیں بلکہ وہ مثل حیوانات یورپ والوں کے لیے پیدا کئے گئے ہیں۔

(3) ان کا اعتقاد اور نظریہ یہ ہے کہ نوآبادیات ایشیا اور افریقہ وغیرہ کے باشندوں کا مال، جان، عزت، زمین دست کاری، تجارت وغیرہ سب انگریزوں اور متسلط یورپینوں کا مملوک ہے جس طرح چاہیں ان کے لیے قانون بنائیں اور جس طرح چاہیں ان میں تصرف کریں۔ یہ رنگین قومیں اگر اف بھی کریں تو باغی ہیں۔ مجرم ہیں مستحق دار و گیر ہیں۔

(4) ان کے نزدیک اپنی شہنشاہیت اپنی قوم اپنے وطن کے لیے تمام رنگین قوموں اور ان کے ذرائع معاش اور ذرائع امن وسکون وغیرہ کو قربان کرنا ہی عدل او رحمت اور تہذیب ہے۔

(5) ان کا اعتقاد ہے کہ ہر قسم کا جھوٹ، غدر، فریب و مکر، ظلم و ستم، پروپیگنڈہ اور ہر ایک شرمناک معاملہ اپنے اور اپنی قوم و ملک کے مفاد کے لیے واجب اور فرض ہے اور اس میں کوئی قباحت اور عیب نہیں۔

(6) ہندوستانیوں کا دنیا میں سب سے بڑا دشمن انگریز ہے اس نے جس قدر ہندوستانیوں کی دولت ذرائع دولت (تجارت، صنعت، زراعت) وغیرہ اور ان کے اخلاق، تعلیم، عزت، اتحاد، اعلیٰ قابلیت وغیرہ کو نقصان پہنچایا کسی قوم نے زمانہائے گزشتہ میں نہیں پہنچایا اور نہ کسی دوسری قوم نے اب تک کسی دوسری قوم کو پہنچایا۔

(7) انگریزوں اور یورپین قوموں کے عہود و مواثیق ایشائیوں اور افریقیوں کے لیے سراسر جھوٹ اور مکر ہیں دفع الوقتی کے لیے عمل میں لائے جاتے ہیں اور جب چاہتے ہیں توڑ بیٹھتے ہیں۔ کوئی معاہدہ رنگین قوموں اور ایشیائیوں اور افریقی لوگوں سے کیا ہوا ضروری العمل نہیں ہے۔

(8) انگریز، ہندوستانیوں کو ہمیشہ ادنیٰ حالت اور غلامی کی لعنتوں میں پھنسائے رکھنا چاہتا ہے کسی امر میں اس کو ہندوستانیوں کا ابھرنا گوارا نہیں ہے۔

(9) انگریز مذہب اسلام اور مسلمانوں کے روئے زمین پر سب سے بڑے دشمن ہیں اسلام اور مسلمان کو صفحہ ہستی سے مٹانے کے لیے ہر ظلم ہر بے حیائی اور بد عملی کو نہ صرف جائز بلکہ ضروری سمجھتے ہیں۔

(10) ابتداء اسلام سے آج تک اسلام اور مسلمانوں کو جس قدر نقصان یورپین قوموں اور

بالخصوص انگریزوں نے پہنچایا ہے کسی نے نہیں پہنچایا۔

(11) انگریز دوست بن کر بھی رنگین قوموں اور مسلمانوں کو نقصان پہنچاتا رہا ہے اور دشمن بن کر بھی۔ ان کی دوستی اور دشمنی ایشیائیوں اور افریقیوں کے لیے بربادی ہی بربادی ہے۔

(12) انگریز کا ہندوستان میں باقی رہنا ہندوستان کا برباد ہونا ہے۔ جتنی ہی اس میں دیر ہو گئی ہندوستان کی ہر منٹ بربادی بڑھتی ہی جائے گی۔ جیسا کہ ہم ڈبلیو' ایس بلنٹ وغیرہ کا قول نقل کر آئے ہیں۔

(13) انگریزوں نے ہندوستانیوں میں پھوٹ اور تفرقہ اس قدر پیدا کر دیا کہ جس کے ہوتے ہوئے امن و امن صدیوں تک مکمل نہیں ہو سکتا۔

(14) انگریزوں نے ہندوستان کو جو کہ مذہبی اور روحانی ملک تھا بالکل ناستک اور بے دین ملک بنا دیا ہے مذہبیت اور خدا ترسی کو تقریباً مٹا دیا ہے فسق و فجور' خود غرضی مکرو فریب' جھوٹ' دغابازی مادہ پرستی اور دنیا طلبی اور خلاف انسانیت افعال کو شائع کر دیا ہے۔

حوالہ جات باب پنجم

1۔ تاریخ دولت عثمانیہ جلد ثانی از مسٹر محمد عزیز ایم اے علیگ ص 242
2۔ خطبہ صدارت مسٹر فضل حق از کتاب وت
3۔ علم المعیشت ص 605
4۔ ایضاً ص 606
5۔ تاریخ دولت عثمانیہ ص 175
6۔ ایضاً جلد دوم ص 100
7۔ تاریخ دولت عثمانیہ جلد اول از دلاژون کیر ترجمہ اردو ص 506
8۔ دولت عثمانیہ ص 108
9۔ ایضاً جلد دوم ص 114
10۔ ایضاً ص 115

11۔ ایضاً ص 116
12۔ ایضاً ص 117
13۔ ایضاً ص 128
14۔ ایضاً ص 132
15۔ ایضاً ص 155
16۔ ایضاً ص 160
17۔ ایضاً ص 170
18۔ دولت عثمانیہ جلد دوم ص 172
19۔ ایضاً ص 211
20۔ ایضاً جلد دوم ص 206
21۔ بربری قزاق ص 308 از اسٹینلی لین پول۔
22۔ ایضاً ص 309
23۔ بیداری ترک از مسٹر نائٹ ص 303
24۔ از دولت عثمانیہ ص 253
25۔ بیداری ترک از مسٹر نائٹ ص 92
26۔ ترکی حالت انقلاب میں از چارلس بکسٹن ص 44
27۔ دولت عثمانیہ جلد دوم ص 254
28۔ بیداری ترک از مسٹر نائٹ ص 243
29۔ ایضاً ص 261
30۔ دولت عثمانیہ ص 299
31۔ ترکی سلطنت از لارڈ ایورسلے ص 355

32۔ الہلال جلد 3 ص 12
33۔ ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش ص 83
34۔ ایورسلے ص 357
35۔ دولت عثمانیہ ص 307
36۔ ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش ص 75
37۔ لارڈ ایورسلے ص 359
38۔ ایضاً ص 363
39۔ سوانح خالدہ ادیب خانم ص 334
40۔ از دولت عثمانیہ ص 313
41۔ ایضاً ص 314
42۔ ایضاً ص 315
43۔ ایضاً ص 818
44۔ ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش ص 89